Cust

من اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا

نمبر ۱۸
سلسلہ انجمن ترقی اردو

علم المعیشت

اصول معاشیات یا اکنامکس

اردو میں سب سے پہلی جامع اور مستند کتاب

مصنفہ
محمد الیاس برنی، پروفیسر معاشیات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
سابق پروفیسر اکنامکس محمڈن کالج علی گڑھ

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی
مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء

بار سوم بعد نظر ثانی و اضافہ مضامین (صدر دفتر انجمن واقع اورنگ آباد دکن سے شائع ہوئی)

علم المعیشت

انتساب

میں علمی مشاغل کے اس ثمرِ اوّلیں کو

بطور اظہارِ عقیدت و امتنان

اپنے لایق و شفیق اُستاد

مسٹر جے ایچ ٹول، ایم اے (کنٹب)

سابق پرنسپل محمڈن کالج علی گڑھ

کے

نام نامی سے منسوب کرتا ہوں

جن کی

کارگر توجہ اور قابلانہ تعلیم نے میرے

دل میں معاشیات کا مستقل شوق پیدا کیا

محمد الیاس برنی

فہرست مضامین

(علم المعیشت)

ضروری ہدایت۔ جن جن مقامات پر چلیپا نما + نشان بنا ہوا ہی وہ بوجہ دشواری صرف منتہیوں کے مُطالعہ کے واسطے موزوں اور مقصود ہیں۔ مبتدی اُن کو ضرور ترک کردیں ورنہ نتیجہ اُلجھن اور حیرانی ہو تو عجب نہیں۔

حصّہ اوّل

باب ایک

حصّۂ دُوم

پیدائش دولت

باب دو

باب تین

باب چار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

طبع اوّل

تعلیم کے ذریعہ سے عوام میں بیداری پھیلائے بغیر قوم کا سنبھلنا ممکن نہیں اور غیر مادری زبان میں عوام کو تعلیم دینا اکارت ہے۔ اوّل تو اس کا اہتمام دشوار۔ دوم زبان سیکھتے سیکھتے عمر کا بہترین حصہ نکل جاتا ہے اور جب علم پڑھنے کی نوبت آتی ہے تو نہ سکت باقی رہتی ہے اور نہ موقع۔ غیر مادری زبان کی وساطت سے عوام کو تعلیم دینے کی کوشش کا نتیجہ کوہ کندن وکاہ برآوردن سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس وقت قوم کی ایک سب سے بڑی خدمت یہ بھی ہے کہ جن کو خدا نے ضروری استعداد عطا کی ہو وہ علوم جدیدہ پر کامل دسترس حاصل کر کے اُن کا مادری زبان میں ترجمہ کر ڈالیں اور ساتھ ہی عوام کا بھی فرض ہے کہ ان کوششوں کی مناسب قدر کر کے کارگزاروں کی

ہمت بڑھائیں۔ دوسری کم مایہ محدود زبانوں کو اُن کے سرپرست علوم جدیدہ کے ترجموں سے مالامال کرنے میں کس سرگرمی سے مصروف ہیں اور اُردو جو اپنی حیرت انگیز وسعت پزیری سے عام ملکی زبان بننے کی صلاحیت کا روز افزوں ثبوت دے رہی ہو اِس کی ترقی کے متعلق بہی خواہانِ قوم کی جو ذمہ داری ہو محتاج بیان نہیں۔ خدا کا شکر ہو کہ کچھ عرصہ سے ترقی اُردو کی ضرورت کا احساس روز بروز ہر طرف پھیل رہا ہو اور انشاء اللہ تعالیٰ وہ دن بہت دُور نہیں جب کہ اُردو بھی دُنیا میں اوّل درجہ کی ہونہار اور زندہ زبان شمار ہوگی۔

چونکہ تہذیب جدید کا رجحان مالی ترقیات کی طرف خاص طور سے بڑھا ہوا ہو اور علم معاشیات کا بھی مالی ترقیات سے بغایت قریبی تعلق ہو اس علم کی کُل ترقی یافتہ ممالک میں ایک دھوم مچی ہوئی ہو۔ ہر سال صدہا نئی تصانیف شایع ہو رہی ہیں کثرت سے اخبار و رسائل اس کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں نہ صرف حکومت و سیاست کی رگ و پے میں معاشیات کے اُصول سرایت کیے ہوئے ہیں بلکہ زندگی کے معمولی کاروبار تک میں قدم قدم پر عوام کو معاشی معلومات کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہو خود ہندوستان میں اس علم کو دن دونی اور رات چوگنی ہر دل عزیزی حاصل ہو رہی ہو۔ یہ عام رُجحان سراسر اقتضائے وقت ہو اور خدا جانے اِس میں کیا کیا قوتیں مضمر ہیں۔

ترقی اُردو کی ضرورت اور اشاعتِ علم المعیشت کی مصلحت پر نظر کرکے اوّل اوّل

ایک مختصر سی ابتدائی کتاب لکھنے کا قصد ہوا۔لیکن جب لکھنے کی نوبت آئی تو محض سطحی اور ادھوری بحث پر اکتفا کرنا گوارا نہ ہو سکا۔اور طبیعت نے مجبور کیا کہ ایک جامع اور مستند کتاب لکھی جائے جس میں کُل ضروری اُصول و مسائل صحت و وضاحت سے پیش ہوں اور کوئی بحث تشنہ نہ رہنے پائے۔چنانچہ باوجود اختصار مدِّ نظر رکھنے کے اکثر مباحث مبتدیوں کی ضرورت سے بڑھ کر منتہیوں کی دلچسپی کی حد تک پہنچ گئے۔لیکن اس جامعیت کے باوجود بھی کتاب مبتدیوں کے واسطے کافی سہل رہی۔اوّل تو ہر بحث میں ایسی تشریح اور ترتیب اختیار کی گئی ہے کہ اگر چاہے تو مبتدی بھی تھوڑی کوشش سے عبور حاصل کر لے۔دوم بغرض ہدایت فہرست مضامین میں کل دشوار دشوار مقامات پر چلیپا نما نشان بنا دیا گیا ہے اور اُن کو ترک کرنے پر باقی حصّہ محض ایک سہل سی ابتدائی کتاب رہ جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس میں بھی وہی سلسلہ مضامین قایم ہے۔چنانچہ اُمید ہے کہ اُردو داں مبتدی اور انگریزی خواں منتہی ناظرین کے دونوں طبقے اسی ایک کتاب کے مُطالعہ سے حسب استعداد لطف اور فائدہ اُٹھا سکینگے۔

اِس کتاب میں نہ تو کسی انگریزی تصنیف سے ترجمہ کیا گیا اور نہ کسی مصنف کی خاص طور پر تقلید کی گئی ہے بلکہ مستند اور منتخب کتابیں مطالعہ کر کے اُصول حفظ ما تقدم کے مطابق ہر مبحث کو بطور خود بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

کتاب لکھنے میں سلاست زبان صفائی بیان اور دلچسپی مضامین یہ تین پہلو

خاص طور سے مدِّ نظر رہے ہیں۔ اکثر مثالیں ہندوستان سے لی ہیں اور حسب موقع اُصولی بحث کے تحت میں ہندوستان کی معاشی حالت پر بھی جابجا روشنی ڈالی گئی ہے بالخصوص "تجارت بین الاقوام" "مغربی تجارت خارجہ کی سرگزشت" "ہندوستانی تجارت خارجہ کی سرگزشت" اور "ہندوستان میں گرانی کے اسباب و نتائج" اِن چار بابوں میں ہندوستان کے متعلق بہت سے غور طلب معاملات زیرِ بحث ہیں۔

اکثر مُصنّفین نے مضمون کو اپنے اپنے طرز پر ترتیب دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی ترتیب میں کسی خاص کتاب کی پیروی نہیں کی۔ اکثر تو ہر بحث پر ماسبق مباحث کی روشنی پڑتی ہے لیکن کہیں کہیں مباحث مابعد سے بھی مدد لینے کی ضرورت آپڑی ہے۔ ہم نے ناظرین کی سہولت کے خیال سے ہر موقع پر مباحث متعلّقہ کا حوالہ دے دیا ہے۔ اور اُمید ہے کہ ان کو شریک مطالعہ کرنے سے اصلی بحث کے سمجھنے میں قابلِ قدر مدد ملیگی۔ ہر باب اور فصل چند اجزا میں منقسم ہے۔ اجزا کے نمبر شمار کے حوالہ سے کل مُضمون کا خلاصہ بحث سے قبل بعنوان "تجزیہ" پیش کر دیا گیا ہے اور ہر ہر جزو کا خلاصہ اُس کی ابتدا کے ساتھ حاشیہ پر درج ہے تاکہ مضامین کی ترتیب بالکل آئینہ ہوجائے اور مطالعہ میں ناظرین کی رہ نمائی ہو۔

اصطلاحات کا ترجمہ بے شک ٹیڑھی کھیر ہے۔ حتیٰ کہ اسی دقّت کے خیال سے بعض لوگ کتاب لکھنے سے بچتے ہیں۔ اصطلاحات کو یوں ہوّا بنانا ٹھیک نہیں۔ علوم جدیدہ کے نفس مضمون کا بیان مقدم ہے۔ رہیں اصطلاحات تو یہ کتاب لکھتے

وقت جو بہترین نظر آئیں اختیار کرلی گئیں - ان میں ضروری اصلاح اور ترمیم بعد کی
تحقیق اور تنقید سے ہوتی رہیگی - خود انگریزی اصطلاحات اسی طرح بتدریج قرار
پائی ہیں - عمدہ اصطلاحات کی ضرورت سب کو تسلیم ہے - لیکن اگر اوّل علم کا ترجمہ پیش
کردیا جاوے تو ایسی اصطلاحوں کی تیاری میں بہت سہولت ہوگی - وجہ یہ ہے کہ
اصطلاح تجویز کرنے کے واسطے ایک طرف تو خود علم سے عمدہ واقفیت ہونی چاہیئے -
دوم عربی فارسی میں اعلیٰ دست گاہ بھی ضروری ہے اور یہ دونوں صفات کمتر یکجا
پائی جاتی ہیں لیکن محض عربی فارسی کے عالموں کی کوئی کمی نہیں - پس اگر نفس مضمون
اردو میں ان کے پیش نظر ہوجائے تو وہ بہ آسانی تمام مناسب اصطلاحات مقرر
کرسکتے ہیں - چنانچہ یہی خیال ہے جس نے اصطلاحات کی دقّت کو سدِّ راہ نہ ہونے
دیا اور موجودہ کتاب لکھنے کی جراٴت دلائی - نفس مضمون حتی الامکان پوری صحت
اور وضاحت کے ساتھ پیش کردیا ہے اور اپنی سی کوشش کرکے موزوں اصطلاحات
بھی وضع کی ہیں - لیکن ان میں سے بعض کا غیر صحیح یا ناموزوں ہونا عجیب نہ ہوگا ایسی
اصطلاحات پر اعتراض کرنا بجا اور ضروری سہی لیکن بہتر بدل نہ ملنے تک لاحاصل بھی
ضرور ہے - اصطلاحات کے متعلق جو خیال ہے صاف عرض کردیا گیا - قابل ناظرین براہ
مہربانی جب بہتر اصطلاحات تجویز فرمائینگے تو اُن کو نہایت شکریہ کے ساتھ شامل
کرلیا جاویگا - رہے انگریزی الفاظ سو نہ تو بلا ضرورت ان کی بھرمار کی ہے اور نہ
خواہ مخواہ ان کی بجائے غیر مانوس عربی فارسی لغات ٹھونسے ہیں - انگریزی کے

صرف مروجّہ الفاظ استعمال کیئے گئے ہیں جن کو عوام بھی بلا تکلّف سمجھتے اور بولتے ہیں برائے سہولت ناظرین انگریزی اُردو مرادف اصطلاحات وغیرہ مندرجۂ کتاب کی ایک جامع فہرست بھی بطور ضمیمۂ اوّل شامل کردی گئی ہے۔

(علم المعیشت افعالِ انسانی کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن انسان کے افعال بہت کچھ اس کے ارادہ کے تابع ہیں اور وہ کسی عام قانون کے اس درجہ پابند نہیں ہو سکتے جیسے کہ بے جان چیزوں کے افعال ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس علم کے اُصول و قوانین بیشتر تخمینی ہیں اُن میں وہ تعین نظر نہیں آتا جو ہندسہ یا طبیعیات جیسے علوم کے قوانین کو حاصل ہے۔ دیگر علوم تمدّن مثلاً تاریخ اور معاشرت کا بھی یہی حال ہے۔ جان اسٹوارٹ مل جیسے عالی دماغ منطقی و فلسفی کو شوق ہوا کہ معاشی مسائل کا بھی قطعی فیصلہ کردے چنانچہ بزعم خود اُس نے مسئلۂ قدر و قیمت کو طے کر کے اُس کی تکمیل کا اعلان کردیا۔ اسی طرح مسئلہ اُجرت فنڈ پر اُس کو اتنا ہی اعتماد تھا جتنا کہ کسی کو قانون کشش مرکزی پر اُس کی علمیت کے رعب میں آکر کچھ روز عوام بھی اس علم کو تقریباً ہندسہ و طبیعات کی مانند معین خیال کرنے لگے لیکن تیس سال کے اندر مل کا مغالطہ رفع ہوگیا اور غیر معروف ہم عصر نکتہ چینوں نے بالآخر مسئلہ قدر کی تنگ نظری اور مسئلہ اُجرت فنڈ کی خامی مل سے منوالی۔ چنانچہ اس معاملہ میں مل کا اعتراف اخلاقی جرأت کی قابل یادگار مثال مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے یہ خیال روز بروز قوی ہوتا گیا اور اب اس واقعہ پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے

کہ معاشیات میں تعین کی بہت کم گنجایش ہی۔ اِس کے اُصول وقوانین چند در چند مفروضات پر مبنی ہیں جن کے بغیر اُن کا تعین دشوار تھا۔ لیکن وہ مفروضات کمتر پورے ہوتے ہیں۔ معاشی مباحث صحیح طور پر سمجھنے کے لئے معمول سے زیادہ وسعتِ نظر درکار ہی۔ اور تنگ نظری سے بہت سے مسائل پر لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ کی مثال صادق آسکتی ہی۔ ہر مسئلہ میں بہت سے پہلو پیش نظر رکھنے ضروری ہیں حالانکہ اُن میں سے ہر ایک کا اظہار اصل بحث میں ممکن نہیں پروفیسر مارشل کا یہ قول بہت پُرمعنی ہی کہ جو مسائل جس قدر معین اور قطعی نظر آئیں وہ غالبًا اسی قدر نامکمل اور مغالطہ انگیز ہونگے۔ خود اُس کی مشہور تصنیف کی خصوصیت متمائز یہی وسعتِ نظر ہی موجودہ کتاب میں بھی ہر مسئلہ کے کل ضروری پہلو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہی خواہ مخواہ اُن میں تعین نہیں دکھایا گیا۔ جہاں کل پہلو یکجا نہیں ہوسکے وہاں ماسبق اور مابعد مباحث متعلقہ کا حوالہ دے دیا گیا ہی۔ اصلی بحث کے ساتھ مقامات محولہ کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا۔

مزید برآں بعض مباحث اس قدر نازک اور پیچیدہ ہیں کہ اچھے اچھے راہ گم کر بیٹھے اور بڑے بڑوں کے بیانات میں عدم مطابقت بلکہ تضاد تک کی نوبت آگئی مثلاً مسئلہ سود کی بحث میں کوئی مصنف بھی پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہوسکا۔ یہی حال مسئلہ اشتراک کا ہی پھر بھی روز بروز صحیح معلومات کا اضافہ ہو ہو کر ایسی خامیوں کی مقدار گھٹ رہی ہی۔ چنانچہ پروفیسر جیونس کا مقولہ ہی اور نہایت صحیح ہے

کہ معاشی تحقیقات کے متعلق صرف اس قدر دعویٰ بجا ہی کہ وہ حقیقت سے روز بروز قریب تر ہوتی جاتی ہی۔ اِسی طرح ایک دن پوری حقیقت منکشف ہو جاویگی۔ تاہم اس وقت تک جو معلومات حاصل ہو چکی ہیں وہ ہمارے واسطے از حد مفید ہیں۔ اور بہترین توجہ کے مستحق ہیں۔ گو ہم نے تمام مباحث میں پوری پوری احتیاط سے کام لیا ہی لیکن پھر بھی اگر کہیں کوئی خامی رہ گئی ہو تو تعجب نہیں علم ہونے پر اس کو رفع کرنے کی کوشش کی جاویگی۔

ہر مناسب طریق سے کتاب کو سہل بنانے کی کوشش کی ہی۔ لیکن صحت کو کہیں بھی سہولت پر قربان نہیں کیا۔ بحث میں اکثر ضروری پہلو یکجا پیش کئے ہیں یا اُن کا حوالہ دے دیا ہی اور وسعت نظر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہی اور صاف ظاہر ہی کہ اس حالت میں کتاب اس قدر سہل نہیں رہ سکتی جس قدر کہ بصورت دیگر سہل ہو تی ممکن تھی۔ اِس میں شک نہیں کہ سہولت نہایت ضروری و مفید ہی اور کتاب کی اعلیٰ خوبی شمار ہونی چاہیئے۔ لیکن وہی جو اعتدال سے تجاوز نہ کرے۔ مباحث کو ضرورت سے زیادہ سہل بنا کر پیش کرنے سے علاوہ نقص صحت کے ناظرین کی دماغی قوتوں پر اسی طرح مضر اثر پڑتا ہی جیسے کہ از حد زود ہضم غذا کے عادی ہونے سے معدہ ضعیف ہو جاتا ہی۔ علمی مباحث میں ناظرین کے غور و خوض کے واسطے بھی کچھ گنجایش چھوڑنی ضروری ہی تاکہ دماغی قوتیں بھی تو کام میں آ کر نشو نما پائیں۔ سوچنے سمجھنے کی قابلیت پیدا ہو۔ یہی تو تعلیم کا حقیقی منشا ہی۔ سہل الحصول معلومات سے دماغ پُر کرنا بھی

شاید کام آئے۔ لیکن دماغی تربیت و ترقی تو اس طرح ہرگز ممکن نہیں۔ موٹر پر بیٹھے بیٹھے ہزاروں میل کا سفر کرنا ممکن ہے اور کارآمد بھی سہی۔ لیکن ٹانگوں میں قوت دوڑنے پھرنے ہی سے آتی ہے اور جو چلنے سے معذور ہو وہ اپاہج ہی کہلاتا ہے۔ خواہ سواری میں بیٹھ کر وہ سینکڑوں میل کے دھاوے بولے خواہ دنیا بھر کی معلومات سے دماغ لبریز ہو۔ لیکن حقیقی مفہوم میں وہی شخص تعلیم یافتہ شمار ہو سکتا ہے جس میں غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کی قابلیت ہو جو بیانات و مشاہدات سے اصول و نتائج اخذ کر سکے اور یہ قابلیت کوشش سے حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی اصول کو مدِنظر رکھ کر اگرچہ ہم نے کتاب میں بہت کچھ سہولت پیدا کی ہے مگر نہ اس قدر کہ غور و فکر کی ضرورت ہی نہ رہے اور کل کتاب حلوا نرم بن جاوے جو کو خوش گوار و مرغوب سہی لیکن مضعفِ دماغ بھی ہے اور مطالعہ کا حقیقی منشا دماغ سے کام لے کر اس کو تقویت پہونچانا ہے۔

دہلی کالج کسی زمانہ میں تعلیم کا بڑا مرکز رہ چکا ہے۔ یہاں اچھے اچھے عالموں کا مجمع رہتا تھا جن کی تعلیم اور فیض صحبت سے طلبا میں بھی خاص علمی مذاق پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ اسی کالج کے ایک سربرآوردہ طالب علم پنڈت دھرم نرائن صاحب نے جن کو سینیر اسکالر کا خطاب اور وظیفہ بھی حاصل تھا کالج کے علم دوست پرنسپل جناب بوٹرس صاحب کی فرمائش پر فرانسس وے لینڈ کی کتاب ایلیمنٹس آف پولیٹکل اکانمی کا اردو ترجمہ کیا اور اصول علم انتظام مدن

اِس کا نام رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی انجمن اشاعت علوم مفیدہ بہ سرپرستی دہلی کالج ۱۸۴۳ء سے اُردو ترجمے کرنے کرانے میں مصروف تھی چنانچہ بوٹرس صاحب کے جانشین سپرنجر صاحب نے جو خود کچھ کم علم دوست نہ تھے اس کتاب کو انجمن مذکور کی طرف سے ۱۸۴۵ء میں شائع کرایا۔ یہ ایک چھوٹی سی پُرانی کتاب کا لفظی ترجمہ ہے لیکن عبارت قدیم طرز کی ثقالت سے پاک اور اپنی اشاعت کے زمانہ کے لحاظ سے نہایت قابلِ داد ہے۔ ایک اور مختصر تصنیف بنام رسالہ علم انتظام مدن دست یاب ہوئی لیکن اس کا سرِ ورق گم ہے اور مصنف و سنہ اشاعت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ بھی ترجمہ مذکور کے تھوڑے عرصہ بعد تحریر ہوا۔ مصنف نے اس علم کے چند اُصول مختصراً بطور خود عمدہ پیرایہ میں بیان کر کے جدّت و معاملہ فہمی کا اچھا ثبوت دیا ہے۔ اس کی عبارت بھی مقابلۃً صاف اور سلیس ہے۔ سرسید مرحوم کو نہ صرف خود علمی کام کرنے کا بے حد شوق تھا بلکہ دوسروں سے کام لینے کا بھی اُن کو عجیب ملکہ حاصل تھا۔ اُن کے اور اُن کے ہم صحبتوں کے علمی کارنامے مدتوں یادگار رہینگے۔ علوم جدیدہ کا اُردو ترجمہ کرنے کی غرض سے اُنھوں نے بھی ۱۸۶۳ء میں ایک سینٹفکٹ سوسائٹی قایم کی۔ اور جس سرگرمی سے اس سوسائٹی نے کام شروع کیا تھا اگر وہ سرسید کے بعد بحال رہتی تو خدا جانے اُردو شاہراہ ترقی پر کہاں سے کہاں پہونچی ہوتی۔ اس سوسائٹی کے دو ممبروں یعنی بابو رام کلی چودھری صاحب

اور رائے شنکر داس صاحب نے (جن میں سے ہر ایک بعہدۂ منصف سرفراز تھا) سرسید مرحوم کی خاص فرمایش پر سپنسر صاحب کی کتاب پولیٹکل اکانمی کا اُردو ترجمہ کیا جو کہ سوسائٹی کی طرف سے بنام رسالہ علم انتظام مدن سنہ ۱۸۶۵ء میں شایع ہوا - اسی دوران میں سرسید مرحوم نے پنڈت دھرم نراین صاحب دہلوی کو مل کی کتاب ترجمہ کرانے پر آمادہ کیا اور پہلے مقالہ کا ترجمہ بعنوان اُصول سیاست مدن سوسائٹی نے سنہ ۱۸۶۹ء میں شایع کردیا - ان دونوں ترجموں کو لفظی اور سلیس بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے - لیکن پھر بھی ترجمہ میں اصل عبارت کی سی روانی کہاں پیدا ہو سکتی ہے اور چونکہ مل کی کتاب دقیق ہے اس کا ترجمہ بالخصوص گراں محسوس ہوتا ہے - بعد مدت جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب نے ایک مختصر کتاب بنام علم الاقتصاد تصنیف فرمائی جو سنہ ۱۹۰۵ء میں شایع ہوئی - ڈاکٹر صاحب موصوف اگر چاہتے تو اس علم پر بہتر سے بہتر کتاب تصنیف فرما سکتے تھے لیکن یہی ایک ابتدائی کتاب لکھنے کے بعد اُنھوں نے سکوت اختیار فرمالیا - غالباً اُس زمانہ میں اُردو ناظرین کا مذاق ایسی تصانیف کے واسطے موزوں بھی نہ تھا - لیکن اب وقت آن پہونچا ہے - علوم جدیدہ کے ترجموں کی ہر طرف مانگ ہے - شاعری اور فلسفہ کے علاوہ یہ علم بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کی توجہ اور دستگیری کا کچھ کم مستحق نہیں
المختصر جہاں تک پتہ چلا سنہ ۱۸۴۵ء سے لے کر آج تک اس علم میں تین اُردو ترجمے اور

ایک مختصر رسالہ اور ایک ابتدائی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس طرح موجودہ کتاب کی اشاعت چھٹے نمبر پر واقع ہوتی ہے۔ لیکن بلحاظ نفس مضمون وہ اپنی پیش رووں پر اس قدر فائق ہے کہ اُردو زبان میں اپنے شعبہ کی سب سے پہلی جامع اور مستند کتاب شمار ہو سکتی ہے۔

اِس کتاب میں تو اکثر معاشی قوانین، اُصول اور مسائل مختصر مختصر طور پر پیش ہو سکے تفصیل کی گنجایش کہاں تھی۔ لیکن ان میں سے بعض مباحث اس قدر وسیع ہیں کہ اُن کے واسطے جُداگانہ کتابیں درکار ہیں۔ چنانچہ جابجا ایسی کتابوں کی ضرورت جتائی گئی ہے۔ مثلاً سود ٹکس اجارہ اشتراک زر بنک اور تجارت بین الاقوام وغیرہ کی بحث جُدا جُدا کتابوں کی مستحق ہے۔ علاوہ ازیں اُصولی معلومات حاصل ہونے کے بعد اس علم کی روشنی میں اپنے ملک کی حالت بغور دیکھنی ضروری ہے بلکہ اگر سچ پوچھو تو حصول علم کی غرض و غایت ہی یہ ہے۔ قصد ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ بشرط مہلت ایک جامع کتاب **معیشت الہند** جلد شائع کی جائے جس میں کافی تحقیق اور تنقید کے بعد ہندوستان کے معاشی حالات نہایت صحت اور شرح و بسط کے ساتھ پیش ہوں اور ہر پہلو سے اس کتاب کو اس قدر دلچسپ اور سہل بنایا جاوے کہ عوام شوق سے پڑھیں اور بلا تکلف سمجھ لیں۔ اس کے بعد اگر ہو سکے تو اُصول کے وسیع مباحث پر بھی جداگانہ کتابیں تصنیف ہوں۔ عام ناظرین کے واسطے تو موجودہ کتاب بھی کافی سہل ہے۔ خصوصاً نشان زدہ مقامات ترک کرنے پر باقی کتاب عام فہم رہ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی ایک ایسی ابتدائی کتاب لکھنے کا

ارادہ ہے جس کو بچّے بھی بطور قصّہ کہانی شوق سے پڑھیں اور لطف اُٹھائیں تاکہ بچپن ہی سے اُن کو اِس علم کا چسکا لگ جائے اور معاشی حالات پر غور کرنے کی عادت پڑ جائے۔

آیندہ تصانیف کی تجویز ایک خاص غرض سے یہاں پیش کی گئی ہے اصل مقصد تو اُردو کی ترقی اور علوم جدیدہ کی اشاعت ہے۔ کسی پر کچھ انحصار نہیں جو کام جس سے بن پڑے سرانجام دے۔ مجوزہ بالا کتابیں یا اُن کے علاوہ جو مفید و ضروری معلوم ہوں دیگر اصحاب اُن کی تیاری شروع کر دیں اس کام کو بحُسن و خوبی تمام سرانجام دینے والوں کی اس وقت بھی اتنی قلت نہیں جتنی کہ بظاہر معلوم ہوتی ہے صرف توجہ درکار ہے اور اُمید ہے کہ وہ جلد ہر طرف عود کر آئیگی۔ مستند انگریزی کتابوں کی ایک مختصر فہرست (جو بطور ضمیمہ دوم اس کتاب میں شامل ہے) اس علم کے شایقین کو مطالعہ و تصنیف میں مُشیر کا کام دے سکتی ہے۔

سچ پوچھیئے تو اس تصنیف کا باعث مکرمی جناب مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کی توجہ اور کوشش ہے۔ کتاب لکھنے کا ارادہ تو مدت سے تھا لیکن خدا معلوم یہ کام کب تک معرض التوا میں پڑا رہتا۔ مولوی صاحب موصوف کی پُر اثر ترغیب بے تکلف تاکید قابلانہ مشوروں اور مخلصانہ ہمّت افزائی نے اپنے دل و دماغ پر کچھ ایسا قابو پایا کہ کتاب لکھنے کی دُھن بندھ گئی اور جب تک وہ ختم نہ ہو لی چین نہ پڑا۔ خود کام کرنے والوں سے کہیں زیادہ ہم کو

دوسروں سے کام لینے والوں کی ضرورت ہے اور خدا نے یہ دونوں خوبیاں انجمن کے موجودہ سکرٹری کو عطا کی ہیں۔ ممدوح کی عنایات کے شکریہ کے اظہار سے الفاظ قاصر سہی لیکن دل میں احسان مندی کے احساس کی کوئی کمی نہیں۔

اپنے مخلص دوست جناب مولوی محمد مقتدی خاں صاحب شروانی منیجر انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کا شکریہ ادا کرنا بھی نہایت خوشگوار فرض ہے۔ اس کتاب کے چھپنے میں جو چند در چند سہولتیں آپ کی توجہ اور عنایت سے حاصل ہوئیں وہ کسی دوسرے مطبع میں میسّر آنی ممکن نہ تھیں اور اُن کے بغیر کتاب کا یوں حسب دل خواہ تیار ہونا بھی محال تھا۔ اصل مسودہ کی بدخطی اور پراگندگی کا لحاظ کرتے ہوئے کتابت کی صحت جیسی کچھ بھی ہے بدرجہا غنیمت ہے۔ اگر کچھ غلطیاں رہ گئیں تو انشاء اللہ تعالےٰ طبع دوم میں رفع ہو جائینگی۔

محمڈن کالج۔ علی گڑھ
جنوری ۱۹۱۷ء

محمد الیاس برنی

تمہید

طبع دوم

الحمد للہ کہ اس کتاب کی اُمید سے بڑھ کر قدر ہوئی طبع اوّل کے ہزار نسخے تھوڑے ہی عرصہ میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئے۔ ہندوستان کے ہر ہر حصّہ سے فرمائشیں آئیں۔ اور لطف یہ کہ یونی ورسٹی کے طلبار نے بھی انگریزی کتابوں کے ہوتے ہوئے اِس کا بہت شوق سے مطالعہ کیا اور مضمون سمجھنے میں اس سے مدد لی۔ خدا کی قدرت ہے کچھ عرصہ سے ہر طرف اُردو کے سوت پھوٹ رہے ہیں۔ کوئی دن جاتا ہے کہ اُردو سے علوم جدیدہ کے چشمے اُبلتے ہیں اور اُن سے تمام ملک سیراب ہو گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

طبع دوم میں یہ کتاب کئی لحاظ سے بہت کچھ سنور گئی۔ طباعت کی غلطیاں درست ہوئیں۔ عبارت کی خامیاں رفع ہوئیں۔ مضمون میں اچھا خاصہ اضافہ ہوا۔ مثلاً امداد باہمی کا طریق سولھویں باب میں ازسرِنو بیان ہوا۔ بارھویں باب میں شغل اصل کی مزید

توضیح ہوئی۔ جابجا تازہ ترین اعداد و شمار درج ہوئے۔ جہاں کسی بحث کا ماسبق یا متعاقب بیان سے تعلق ہے وہیں خطوطِ ہلالی کے اندر مقامات متعلقہ کا بحساب باب و جزو حوالہ دیدیا گیا مثلاً چوتھے باب کے ختم پر (۵-۴/۱۷) درج ہے۔ مراد یہ ہے کہ خطوط ہلالی کے ماقبل فقرہ کے متعلق سترھویں باب کے چوتھے اور پانچویں جزو میں مفصّل بیان موجود ہے۔ کوئی چاہے تو بغرض تشریح اِن مقامات کا مطالعہ کرے۔ اسی طرح چھٹے باب کے اوّلیں فقرہ کے آخر میں، (۵-۳/۳) درج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیسرے باب کے تیسرے اور پانچویں جزو میں فقرہ ماسبق کی تفصیل موجود ہے۔ وقس علیٰ ھٰذا۔

حُسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت میں بھی ترقی ہونے کی اُمید ہے۔ یعنی کوشش یہ ہے کہ کتاب کی طباعت اور جلد بھی بمقابل سابق عمدہ رہے۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔

بہ حالت موجودہ اس کتاب میں بیشتر روئے سخن عام ناظرین کی طرف ہے۔ یونیورسٹیوں کے درس کی خاص خاص ضروریات پیش نظر رکھ کر اس کا ایک نصابی اڈیشن بھی عن قریب شائع کرینگے جو طلبہ کے واسطے خاص طور پر موزوں اور مفید ہوگا۔ یہ خاص اڈیشن جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے بی اے کورس میں بھی شامل رہیگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد، دکن
۱۹۱۹ء

محمد الیاس برنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

حصّہ اوّل

مقدّمہ

تجزیہ (۱) قدرت اور ضروریات کی کفالت (۲) قدرت پر دسترسِ انسانی کی افزونی اور اُس کی وسعت (۳) ہندوستان کی بے اتفاقی و محرومی (۴) اصطلاحِ افادہ (۵) اصطلاح استبدال (۶) دولت کی تعریف (۷) دولت کے اقسام (۸) دولت کی مختلف شکلیں (۹) خدمت کی تشریح (۱۰) قابلیت و خدمت کا فرق (۱۱) استبدال و استہلاک کا تعلق اور اُس پر ایجادات کا اثر (۱۲) ایک ضروری اعتراف (۱۳) معاشی جدّ و جہد کی تعریف (۱۴) معاشیات کی تعریف (۱۵) معاشیات میں تقسیم مباحث (۱۶) معاشیات اور علوم متجانسہ (۱۷) معاشیات کے مسلمات (۱۸) معاشیات کے قوانین (۱۹) معاشیات کی وسعت (۲۰) معاشیات کا طریق (۲۱) لفظ اکانمی کی تحقیق (۲۲) اصطلاحِ معاشیات کی صحت (۲۳) معاشیات

حصہ اول
باب ۱

۱- اللہ جل شانہ جیسے خالقِ اکبر اور حکیم مطلق نے کوئی چیز فضول و بے کار پیدا نہیں کی گو ہم واقف نہ ہوں، لیکن یقیناً ہر چیز سے کوئی کام مقصود ہی اور ہر کام کے لئے کوئی چیز مخصوص۔ کتنی چیزیں اب بھی نامعلوم ہونگی جو براہ راست یا بالواسطہ بحالتِ قدرتی یا مصنوعی ہمارے واسطے مفید و کارآمد ہوسکتی ہیں تحقیق و تجربے سے آئے دن نئی نئی چیزیں اور چیزوں کے عجیب و غریب خواص دریافت ہو رہے ہیں۔ ہیرے سے بدرجہا سخت کاربورنڈم اور جواہرات سے کہیں بیش قیمت ریڈیم جیسی نادر چیزیں ہاتھ آئی ہیں جن سے وہ کام لئے جاسکیں گے جو کبھی وہم و گمان سے بھی باہر تھے، خصوصاً ریڈیم سے عجیب و غریب امیدیں قائم ہو رہی ہیں بمقدار قلیل زبردست سے زبردست قوتِ محرکہ پیدا کرنا، صدہا سال حمّام گرم رکھ سکنا، اجسام کثیف کے پار مثل آئینہ چیزیں صاف دکھا دینا تو اس کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ اس کی بہت تھوڑی مقدار اب تک دستیاب ہوسکی ہی اور ایک ایک ریزہ دھڑلوں بلکہ منوں سونے کے معاوضہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہی۔ یہی بجلی جس نے ہزارہا سال تک بے شمار جان و مال جلا جلا کر خاک سیاہ کرنے کے سوائے انسان کے ساتھ کوئی بھلائی نہ کی اور جو اسی وجہ سے غضب الٰہی کا مظہر بنی رہی۔ اب کس قدر مطیع و کارگزار بن گئی کہ ہر خدمت کے واسطے کمربستہ نظر آتی ہی۔ کھانا پکانا۔ پنکھا جھلنا، مکان روشن کرنا، کھیل تماشے دکھانا، جیسی معمولی خدمات سے لے کر ہوا سے بھی جلد تمام عالم میں خبریں پھیلانا، کرۂ ہوا میں کبھی سطح زمین پر اور کبھی سمندر کے اندر اندر بسرعت و آسایش ہماری سواری لئے پھرنا، جیسی کرامات نما کارگزاریوں تک وہ کون کام ہی جس میں اس کو عذر ہو۔ یہی نائٹروجن جیسی ناگزیر اور بیش بہا چیز جو کرۂ ہوا میں بقدر ۴/۵ حصہ فاضل و بے کار پڑی ہوئی ہی جرمنی جیسے ترقی یافتہ ممالک بذریعہ قوتِ برقی ہوا سے نکال کر شورۂ بارود۔ نہایت زرخیزی افزا کھاد حتیٰ کہ اشیاء خورد و نوش براہِ راست

اس سے تیار کر رہے ہیں۔ گویا برقی کنجی سے ہوائی خزانوں کے دروازے بھی حضرت انسان نے کھولنے شروع کر دیئے، خدا خیر کرے اب بجلی کی کوند اور کڑک سے بھی کوئی دھمکی میں نہیں آتا ہم نے ایک سیڑھی لگا دی جس کے ذریعے سے وہ جب چاہے بلا تکلف زمین پر اتر سکے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہو۔ ترقیات سائنس کی بدولت جو بجلی کبھی سراپا ضرر تھی سرچشمۂ فیض بن گئی۔ آگ اور پانی جو ہزار ہا سال تک نہایت ادنیٰ کاموں میں لگے رہے اب سحر و طلسم سے بڑھ کر عجیب و غریب کرشمے دکھا رہے ہیں۔ لق و دق میدان ہوں یا طوفان خیز سمندر، برفستان ہوں یا ریگستان۔ سر بفلک پہاڑ ہوں یا گہری گہری کھائیاں۔ غرضیکہ تمام روے زمین پر بھاپ کی طاقت شب و روز کروڑ ہا من سامان اور لکھوکھا انسانوں کو مثل پُوارٹاے اڑائے پھرتی ہے سفر تو ایسا سہل و مختصر ہو گیا کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ سوئی سے لے کر عالی شان محلات، لانبے لانبے پلوں، ریلوں اور سر بفلک جہازوں تک کونسی چیز ہے جس کے بنانے میں وہ حصہ نہیں لیتی کھانے پینے سے لے کر کوہ کنی، ریل کشی اور جہاز رانی تک وہ کونسا کام ہے جس میں وہ ہمارا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ لوہے، لکڑی بلکہ مٹی کی سونے سے بیش قیمت چیزیں بنتی ہیں پھٹے پرانے چیتھڑے گودڑوں اور درختوں کی چھال پتوں سے (جن کی ہمارے ہاں ذرہ برابر قدر نہیں) کروڑہا روپیہ کی قیمت کے کاغذ تیار ہوتے ہیں۔ کاغذی تختوں سے امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں نہایت مضبوط اور سبک بار ریل کے ڈبے بنتے ہیں جن کے سامنے لکڑی کے وزنی اور بیش خرچ ڈبے بھی ہیچ ہیں۔ کوئلہ کی راکھ سے طرح طرح کے خوش نما رنگ نکالے جاتے ہیں۔ گلی کوچوں کی خاک سے کیسے ہلکے اور دیرپا اور خوش نما الومینیم کے برتن بنتے ہیں حتیٰ کہ فضلات حیوانی بھی جن سے ہر شخص کو طبعی نفرت ہے ترقی یافتہ ممالک میں اس طور پر کام میں لائے جاتے ہیں کہ لاکھوں روپیہ منافع حاصل ہوتا ہے غرضیکہ سائنس کی جدید تحقیقات اور صنعت و حرفت کی موجودہ ترقیات کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خداداد نعمتوں سے روز افزوں

حصہ اول
باب ۱

فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ ادنیٰ ادنیٰ چیزیں بیش بہا اور ردی سے ردی چیزیں کم و بیش کار آمد بنتی جاتی ہیں اور جو چیزیں وہم و گمان میں بھی نہیں گزرتی تھیں وہ روز بروز ہماری ضروریات میں داخل ہو رہی ہیں۔ چنانچہ معاشی لحاظ سے تہذیب جدید کی خصوصیت ممتاز یہی ضروریات اور ان کی بہم رسانی کے وسائل کا روز افزوں اضافہ قرار پایا ہے۔

قدرت پر دسترس انسانی کی افزونی اور اس کی وسعت

۲۔ لیکن موجودہ ترقیات کے بھروسہ پر یہ اُمید کرنا بجا نہیں کہ ہم قدرت کے تمام خزانوں پر کبھی قابض ہو سکیں گے کیونکہ قدرت کی بے شمار نعمتوں کے مقابلہ میں ہماری ہزار ہا سال کی تحقیق اور تجسس کا سرمایہ سمندر کے ایک قطرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس وقت نباتات میں چودہ لاکھ انواع کا تو پتا لگ چکا ہے اور خدا جانے کتنی بے شمار انواع اور ہیں جو معلوم نہیں۔ مگر ہم اب تک تین سو سے زیادہ کام میں نہیں لا سکے۔ حیوانات کی بے شمار قسموں میں صرف تقریباً دو سو ایسی ہیں جو ہمارے کام آ رہی ہیں اور جمادات پر تو ہماری دسترس اس سے بھی زیادہ محدود ہے پھر ہم کیسے ایک دن ساری خدائی کے مالک بننے کی اُمید کر سکتے ہیں۔ البتہ ترقیِ علوم کے ساتھ نسبتاً ہماری دسترس ضرور بڑھتی جائیگی لیکن وہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی بے التفاتی و محرومی

۳۔ قدرت نے سب ملکوں میں اپنی نعمتیں یکساں تقسیم نہیں کیں نہ سب ملک یکساں زرخیز ہیں، نہ سب میں قیمتی معدنیات پائے جاتے ہیں، نہ سب کی آب و ہوا اور قدرتی وسائل صنعت و حرفت کی ترقی کے واسطے یکساں موزوں۔ تھوڑی تحقیق سے ظاہر ہوگا کہ بحیثیت مجموعی ہندوستان نے حصہ کسی دوسرے ملک سے کم نہیں بلکہ اکثر سے بہت زیادہ پایا۔ مگر وہ اپنی خداداد نعمتوں سے بمقابلہ دیگر مہذب ممالک کے بہت کم مستفید ہو رہا ہے نہ اس کو اپنی نعمتوں کا پورا علم ہے نہ اُن سے مستفید ہونے کے اُس کے پاس کافی وسائل باوجود اس کے ہندوستان دنیا کے تختے پر سونے کا ٹکڑا اور تاج برطانیہ کا سب سے

قیمتی جگمگاتا ہیرا مانا جاتا ہی اسی سے قدرتی نعمتوں کی کثرت ثابت ہوتی ہی۔ کاش اگر وہ
اس طرح پر لاچار نہ ہوتا اور اپنی کوشش سے عطیات قدرت کی قدر کرسکتا تو خدا جانے
ممالک عالم میں آج اس کا کیا رتبہ ہوتا۔ کیسے تعجب کی بات ہی کہ ایسا زرخیز ملک اور وہ
شکر جیسی ضروری چیز کے واسطے جرمنی اور آسٹریا کا محتاج ہو جو گھاس پتوں اور غلہ تک سے
شکر نکالتے ہیں اعلیٰ سے اعلیٰ شکر یہاں پیدا ہوسکتی ہی۔ ہزارہا من شکر قند پیدا ہوتی
ہی جو سوائے کھانے کے کسی کام نہیں آتی۔ ریاست حیدرآباد میں شریفہ کے کیسے کیسے
وسیع جنگل موجود ہیں اور شریفہ بھی کیسا گویا مصری کا کوزہ کہ اُس سے چھٹنکیوں شیرہ
ٹپکے مگر کس کو توجہ ہی کہ اس خداداد عطیہ کو سنگوائے۔ کچھ تو لوگ جنگلوں سے مفت جھکڑے
بھر بھر کے فروخت کرنے کے لئے شہر لے آتے ہیں اور ہر سال ہزارہا من جنگلوں ہی میں
گل کر خاک ہو جاتے ہونگے۔ یہ گنگا جمنا کی چاندی جیسی سفید ریتی! اگر کوئی خدا کا بندہ اس میں
لوچ پیدا کرکے چینی کے برتن بنا سکے تو اسی ریتی پر چاندی سونے کے گنگا جمنی دریا بہنے
لگیں۔ رنگ جیسی ضروری چیز میں ہمارا ملک جرمنی کا ایسا محتاج ہی کہ جب جنگ چھڑی تو
بوجہ بندش درآمد اُس کی قیمت دس گنی ہوگئی حالانکہ کُسُم، ہارسنگھار، ہلدی، اودی
گاجر، تینگ، آل، بدقسمت نیل اور ایسی بہت سی چیزیں موجود ہیں جن سے ہر قسم کا عمدہ
رنگ تیار ہوسکے۔ غرضیکہ بہت سی خداداد نعمتیں جن کی ہم کو اشد ضرورت ہی ہمارے
قدموں کے نیچے پامال ہو رہی ہیں اور اُن کا کوئی پرسان حال نہیں۔ البتہ کچھ عرصہ سے
ہندوستان بھر میں ریاست میسور معاشی معاملات میں قابل فخر و مبارکباد بیداری
اور مستعدی کا اظہار کر رہی ہی۔ حال میں ہی وہاں ایک معاشی کانفرنس بھی قائم ہوئی ہی
جس کا مقصد واحد ریاست کی صنعت و حرفت کو زندہ کرنے اور اُس کو بدرجہ اعلیٰ ترقی دینے کی
باقاعدہ کوشش کرنا ہی۔ یہ کانفرنس نہایت سرگرمی سے اپنے حصول مقصد میں مصروف ہی

اور عنقریب تمام ہندوستان کے واسطے قابل قدر نمونہ بن جائیگی۔ خلاف انصاف ہوگا اگر یہ نہ تسلیم کیا جائے کہ ہندوستان کی اس بے التفاتی اور بے قدری کا باعث ہندوستانیوں کی کاہلی اور غفلت کے علاوہ اور بھی چند زبردست غیر اختیاری اسباب ہیں جن سے ہم آیندہ مناسب موقع پر انشاء اللہ تعالیٰ بالتفصیل بحث کرینگے۔

اصطلاح افادہ

۴۔ جب ہم کسی چیز کو مفید اور کارآمد کہتے ہیں تو اُس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ وہ ہم کو آرام پہنچاتی ہے یا ہماری تکلیف رفع کرتی ہے یا بالاختصار اُس سے ہماری احتیاج پوری ہوتی ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ معاشیات میں لفظ احتیاج نہایت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے ہم کو اس سے بحث نہیں کہ کوئی احتیاج حقیقی ہے یا وہمی، دائمی ہے یا عارضی، قدرتی ہے یا رسمی، طبعی ہے یا غیر طبعی، قوی ہے یا ضعیف، اختیاری ہے یا غیر اختیاری، جائز ہے یا ناجائز بھلی ہے یا بُری۔ احتیاج کسی قسم کی بھی ہو، اُس کا لحاظ کیا جائے گا اور جو چیز اُس کو پورا کرے گی وہ مفید سمجھی جائے گی۔ مثلاً پانی پیاس بجھاتا ہے۔ آگ گرمی اور روشنی پہنچاتی ہے۔ چھتری دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتی ہے۔ عمدہ لباس اور زیور خود نمائی کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ پھولوں کی مہک اور باجوں کے سُریلے راگ دماغ کو فرحت اور دل کو سرور بخشتے ہیں۔ قدیم کرم خوردہ کتابیں، زنگ آلودہ سکّے، بدرنگ تصویریں، ٹوٹے پھوٹے برتن محققین آثار قدیمہ کے نزدیک بیحد قیمتی ہوتے ہیں۔ دوا ازالہ مرض کرتی ہے اور شراب جیسی مخرب صحت چیز سے بھی شرابی کو ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ مذکورہ بالا چیزیں ایک نہ ایک احتیاج پوری کرتی ہیں، معاشیات کے نزدیک یہ سب مفید ہیں اور احتیاج پورا کرنے کی صلاحیت جو ان سب میں پائی جاتی ہے اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے۔ اس صفت افادہ کی اہمیت آگے چل کر دولت کے بیان میں ظاہر ہوگی۔

حصہ اول
باب ۱
اصلاح
استبدال

۵ - یہاں تک ہم نے چیزوں کا مفید ہونا ظاہر کیا۔ اب ہم اُن پر ایک دوسری حیثیت سے نظر ڈالتے ہیں۔ چند چیزیں تو ایسی ہیں کہ ہم اُن کا کسی دوسری چیز سے مبادلہ کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ ہمارے قبضہ تصرف سے باہر ہیں۔ مثلاً چاند، سورج، ہوا سمندر، اور بعضی چیزوں کے مبادلہ کو ہم فضول سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ بکثرت دستیاب ہوتی ہیں اور کسی کی ملک خاص نہیں۔ مثلاً لبِ دریا پانی، خود رو جنگلوں کے پھل پھول اور لکڑی اور بہت سی چیزوں کا مبادلہ ہم کر بھی سکتے ہیں اور ایسا کرنا مفید اور ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً غلہ، کپڑا، گھوڑا، مکان اور ہر قسم کی اشیائے منقولہ وغیر منقولہ آخری قسم کی چیزوں سے معاشیات کو خاص تعلق ہی اور ہم ان خصوصیات کو جن کی وجہ سے ان کا مبادلہ مفید اور ضروری سمجھا جاتا ہی۔ مختصراً بیان کرنا چاہتے ہیں۔ افادہ کے اصطلاحی معنی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں مبادلہ سے اُس کا تعلق بتانا ضروری ہی۔ افادہ کے واسطے تو مبادلہ شرط نہیں۔ مثلاً چاند، سورج، ہوا میں افادہ موجود ہی مگر ان کا مبادلہ ممکن نہیں۔ لیکن مبادلہ کے واسطے افادہ لازمی ہی۔ کیونکہ اگر اشیاے متبدلہ سے فریقین کی احتیاجیں ہی رفع نہ ہو سکیں گی تو پھر اُن کے مبادلہ کی تکلیف کوئی خواہ مخواہ کیوں گوارا کرے گا۔ ہر شخص جانتا ہی کہ کار آمد چیزوں ہی کا لین دین ہو سکتا ہی۔ ردی اور نکمی چیزوں کا مبادلہ کون کرتا ہی۔ اسی واقعہ کو اصطلاحی زبان میں یوں کہیں گے کہ مبادلہ کے واسطے افادہ لازمی ہی۔

یہاں یہ نکتہ سمجھنا نہایت ضروری ہی کہ کسی چیز میں محض مفاد کا وجود مبادلہ کے واسطے کافی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہی کہ انسان کو مفاد کا علم اور چیز پر دسترس ہو۔ مثلاً جب تک کہ مشہور دوا کُنین کے خواص معلوم نہیں ہوئے تھے وہ محض نکمی چیز سمجھی جاتی تھی کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا تھا اور نہ اُس وقت کوئی اس کا

حصہ اول
باب ۱

مبادلہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ فی نفسہ اس میں وہ افادہ اُس وقت بھی موجود تھا جس کے دریافت ہونے پر وہ قابل مبادلہ ہو گئی۔ اسی طرح پر وہ چاندی سونا جو نہایت ہی گہری کانوں میں دبا پڑا ہے ہمارے نزدیک ایسا ہی بے کار ہے جیسے مریخ کی خیالی دولت۔ گو ایسے چاندی سونے میں مفاد موجود ہے مگر ہماری دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے نزدیک مٹی کے برابر بلکہ اس سے بھی زیادہ نکمّے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کا مبادلہ ممکن نہیں۔ پس علم و دسترس بغیر محض افادہ کی موجودگی مبادلہ کی بنا نہیں ہو سکتی۔

مبادلہ کے واسطے علاوہ افادہ کے اور دو شرطیں بھی ضروری ہیں۔ یعنی کم از کم مابین فریقین کسی چیز کی مقدار معین اور تملیک کلّی ہو اور یہ دونوں شرائط خود بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ تملیک کلی، تعیین مقدار پر منحصر ہے۔ کسی چیز کا غیر معین مقدار میں دستیاب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں اور ہر کسی کو بلا تعرض دیگرے میسر ہو سکتی ہے۔ گنگا کے کنارے نہ پانی کی کمی، نہ وہ کسی کی ملک جو جتنا چاہے پانی بہائے پیئے اور گھر لے جائے۔ مبادلہ کی ضرورت ہی نہیں مگر دُور اُفتادہ مقامات میں خوش اعتقاد ہندو دل کھول کر گنگا جلی کی قیمت اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہاں گنگا تو بہتی نہیں صرف اتنا ہی تھوڑا سا پانی جو بیچنے والے کے پاس ہے، دستیاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا بوجہ تعین مقدار اور تملیک کلّی گنگا جلی قابل مبادلہ ہو جاتی ہے۔ تحقیق طور پر سنا ہے کہ سیب، انار اور انگور جیسے قیمتی میوے افغانستان میں اس قدر کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو چاہے ہر روز بلا قیمت گرد و نواح کے درختوں سے جی بھر کر کھا سکتا ہے۔

چونکہ کثرت پیداوار کے سبب سے ان میں تعیین مقدار اور تملیک کلی کی صفت کم پائی جاتی ہے ان کا مبادلہ بھی کم ہوتا ہے۔ بڑے بڑے جنگلوں میں لکڑی کی کوئی قیمت نہیں لی جاتی۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی شے میں مذکورۂ بالا ہر دو صفات کی کمی یا زیادتی کی نسبت سے مبادلہ کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ اسی معاشی اصول کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ع

لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

مذکورۂ بالا تیسری قسم کی چیزوں کی یہ صفت کہ اُن کا مبادلہ ممکن بھی ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے اور جس کی ماہیت کو ابھی سمجھا چکے ہیں اصطلاحاً **استبدال** کہلاتی ہے۔ یہاں پر نکتہ یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالتوں میں مبادلہ قانوناً یا بشرط معاہدہ فریقین تک محدود ہوتا ہے۔ یعنی شے مبدلہ کا کسی عام یا خاص فریق کے ہاتھ جدید مبادلہ نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ قانون انتقال جائداد میں اس کی چند مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن مبادلہ کی اس پابندی سے صفتِ استبدال میں کوئی فرق نہیں آتا۔

(۶) **دولت** کا مفہوم اُن چند مسئلوں میں سے ہے کہ جن پر معاشیات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اب تک کوئی قطعی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کے دولت شمار کرنے نہ کرنے پر اب تک اختلافِ رائے موجود ہے لیکن اس اصطلاح کے بہترین معنی **گنیس** صاحب نے بیان کئے ہیں جن کے نزدیک **دولت** میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور استبدال کی دونوں صفتیں موجود ہوں۔ دولت کی اس قدر مختصر مگر جامع تعریف کی تشریح افادہ اور استبدال کے مذکورۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہوگی۔

(۷) دولت کی معاشی تعریف ابھی بیان کی جا چکی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ تنہا لفظ دولت سے مراد **شخصی دولت** ہے، لیکن خود معاشیات نے بہ تقضائے ضرورت دولت کے اصطلاحی معنوں میں کچھ نہ کچھ ترمیم بھی گوارا کی ہے، مثلاً انسان کے ذاتی صفات و خصائل

جیسے شرافت، عزت، ہر دل عزیزی اور اعتبار، جو کاروبار میں مدد دیتے ہیں **ذاتی دولت** کہلاتے ہیں۔ اسی طرح پر گنگا جمنا جیسے بڑے بڑے دریا اور ہمالیہ جیسے سر بفلک پہاڑ جو ملک کی زرخیزی، سرسبزی اور آب و ہوا پر اپنا گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ملک کی وہ عمدہ چیزیں جن کا کثرت پیداوار کی وجہ سے مبادلہ کم ہوتا ہے مگر جو لوگوں کے کام آتی ہیں جیسے جنگلوں کی لکڑی خوشگوار موسم صحت افزا آب و ہوا، دل کش مناظر اور علیٰ ہذا عمدہ سوسائٹی، روشن خیال حکومت وغیرہ جو معاشی ترقیات کے واسطے لازمی ہیں **قومی دولت** کہلاتی ہیں۔ چنانچہ دریائے ٹیمس انگلستان کی دولت کا ایک بیش بہا حصہ شمار کیا جاتا ہے اور وہ ساتوں سمندر بھی جو بذریعہ بارش و جہاز رانی دنیا کی مالی بہبودی کے بہترین معاون ہیں **بین الاقوامی دولت** کہے جاتے ہیں۔ اگرچہ مذکورۂ بالا تینوں آخری قسم کی دولتوں میں سوائے افادہ کے استبدال نہیں پایا جاتا مگر معاشیات میں مجبوراً ان کا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ براہ راست یا بواسطہ ہیئت معاشی دولت کی پیدائش میں اُن سے قابل قدر بلکہ اکثر ناگزیر امداد ملتی ہے۔

(۸) دولت کی ماہیت اور اُس کے اقسام بیان کرنے کے بعد اب اُن چیزوں کی تفصیل کرنی باقی ہے جو دولت میں شامل ہو سکتی ہیں۔ ان کی حسب ذیل چار قسمیں ہیں:-

ا۔ مادّی اشیاء خواہ منقولہ یا غیر منقولہ۔ مثلاً غلّہ، کپڑا، گھوڑا، درخت، زمین اور ہر قسم کی مِلک و جائداد۔

ب۔ مادّی اشیاء کی ملکیت اور استعمال کے حقوق، مثلاً کتاب کا حق تصنیف، آلات کا حق ایجاد، کاشتکار کا حق کاشت خواہ وہ ازروئے قانون یا معاہدہ بلا اجازت زمیندار ذیل کو منتقل کیا جا سکے یا نہیں نیز کسی کلب یا لائبریری کی ممبری کا حق کھیل و مطالعہ کے متعلق اگرچہ وہ محض ذاتی اور ناقابل انتقال ہو۔

ج۔ ذاتی خدمات، خواہ اُن کا نتیجہ بشکل مادّی ظاہری ہو یا نہ ہو۔ مثلاً لوہار، بڑھئی، معمار

درزی، باورچی اور حجام کا کام یا گانا بجانا ورزشی کرتب اور کھیل تماشے جو عموماً تھیٹر اور سرکس وغیرہ میں دکھائے جاتے ہیں۔

د۔ ذاتی خدمات کرانے کا حق مثلاً ریلوے کمپنی کا ملازمان پر، تھیٹریکل کمپنی کا ایکٹروں پر، ٹرسٹیانِ کالج کا پروفیسروں پر۔ جب کبھی ہم ان حقوق کے ذریعے سے نہ کہ براہِ راست ان خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس حق کے معاوضہ میں حقداران یعنی مالکان کمپنی یا ٹرسٹیان کالج کو کچھ روپیہ کرایہ فیس کے طور پر ادا کرتے ہیں۔

پہلی شکل میں تو دولت کو ہر کوئی پہچانتا ہے۔ البتہ شکل سوم اس سے روشناس کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم خدمات کا معاوضہ دیتے ہیں۔ خواہ نتیجہ بشکلِ مادّی ظاہر ہو یا نہو۔ مثلاً کھانا پکانا، کپڑا سینا، یا پنکھا جھلنا، گانا سنانا، تو گویا خدمت میں بھی صفات افادہ استبدال موجود ہیں اور وہ بھی دولت کی ایک شکل ہے۔ واضح ہو کہ قرآن شریف سے بھی خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے۔ مِلک وجائداد اور زرِ نقد کی طرح مہر بشکل خدمت بھی قرار پا سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ادائیگیِ مہر میں اپنی بیوی کی کچھ سال بکریاں چرائی تھیں اور بیوی کو قرآن پاک کی تعلیم دینا بھی شرعاً مہر شمار ہو سکتا ہے۔ رہے دولت کے ملک اور استعمال کے حقوق، سو وہ بھی افادہ واستبدال کی موجودگی سے دولت ہیں۔

خدمت کا دولت ثابت کرنا کافی نہیں۔ اس مسئلہ کی مزید تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے جو درج ذیل کی جاتی ہے:

(۹) خدمت کے متعلق یہاں پر دو نکتے جتانا چاہتے ہیں جو عملاً زیادہ کارآمد نہ سہی لیکن علمی لحاظ سے دلچسپ ومفید ضرور ہونگے۔ اوّل یہ کہ دولت خدمت پیدا کرنے کے واسطے خادم بننا لازمی نہیں۔ کبھی کبھی مخدومیت گوارا کرنا بھی خدمت کا حکم رکھتا ہے یعنی دولت میں شمار ہوتا ہے۔ کسی محبوب کے تحفہ قبول کر لینے سے عاشق کو ایسی حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ وہ تحفہ

میں گھر بار لٹا دے تو عجب نہیں اور محبوب کی قبولیت ہی اس کے حق میں سب سے بیش بہا دولت ہی حقیقی سخاوت میں خیرات دینے سے ایسی طمانیت قلب حاصل ہوتی ہی کہ مفلس کا خیرات لے لینا ہی سخی کی نظر میں بڑی خدمت ہی۔ پرورش اولاد کا بھی بیشتر یہی حال ہی۔ پیروں اور امرا کی خدمت میں جو مرید اور متوسلین دولت لٹاتے اور جان کھپاتے ہیں، اگر کوئی خاص غرض بھی پیش نظر نہو تو تقرب اور خصوصیت کا فخر و امتیاز ایسا دل آویز ہی کہ اس کے سامنے لوگ جان و مال کی بھی حقیقت نہیں سمجھتے۔ ایسے لوگوں کے حق میں گویا بڑوں کی مخدومیت ہی بیش بہا دولت ہی۔ چنانچہ شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؎

منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منت شناس از وکہ بخدمت بداشتت

دوسرا نکتہ قابل تشریح یہ ہی کہ کام کرنے کی طرح کام سے باز رہنا بھی خدمت کی ایک صورت ہی اور اس کا بھی مثل دولت مبادلہ ہوتا ہی۔ چنانچہ واقعہ ہی کہ موجودہ جنگ یورپ میں متخاصمین گرد و نواح کے ملکوں کو نہ صرف شرکت بلکہ غیر جانبداری کے معاوضے بھی حسب غرض پیش کر رہے ہیں۔ کھلا ہوا راز ہی کہ ہندوستان کے سرحدی جرگوں کو لوٹ مار سے باز رکھنے کے لئے نہایت فیاضی سے انعام و اکرام تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ بعض دولتمند لوگ مشہور چور ڈاکوؤں کو دے دلا کر خوش رکھتے ہیں تاکہ اُن کی دست بُرد سے محفوظ رہیں۔ پس جو شخص جرمانہ ادا کرتا ہی یا جان کے خوف سے مال ڈاکوؤں کے حوالہ کرتا ہی یا بیگار میں مفت کام کرتا ہی بظاہر تو اس کے مال و خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ لیکن درحقیقت سرکار کا اس کو قید کرنے ڈاکوؤں کا اس کی جان لینے اور بیگار خواہوں کی اذیت رسانی سے اس کا محفوظ رہنا ایسی خدمات ہیں جو اپنی دولت کے مبادلہ میں حاصل ہوتی ہیں اور مشقت قید ضرر جان و اذیت سے رہائی جیسے مفاد ان خدمتوں میں داخل ہیں۔ ایسی خدمات کو جن میں ضرر و گزند سے

بچاؤ کے سوا ذرہ برابر کوئی اور مفاد نہ پایا جائے۔ **خدمتِ منفی** اور باقی کو جن میں بے شمار مفاد موجود ہیں خدمتِ مثبت کہنا ناموزوں نہوگا۔ دیگر اسباب کو ضرر رسانی سے باز رکھنے کا کام بھی، مثلاً ڈوبتے کو پانی سے نکالنا جلتے گھر کی آگ بجھانا، مریض کو اچھا کرنا ملزم کی پیروی کرنا، چور نہ آنے دینا، کم وبیش **خدمتِ منفی** کے مشابہ ہے۔

ظاہر ہے کہ **خدمتِ منفی** باوجود دولت ہونے کے اپنے مبادلہ سے دولت کی مجموعی مقدار میں بجائے اضافہ تخفیف کردیتی ہے۔ البتہ تخفیف کی مقدار اس مقدار سے کم ہوگی جس کی تخفیف ہونے کا بحالتِ عدم مبادلہ **خدمتِ منفی** اندیشہ ہو گویا ان **خدمات** کا مفاد تخفیف میں تخفیف کرنا ہے۔ اس پر بھی دولت کا جزو شمار ہوتی ہیں۔ ہندی مثل "سارا جاتا دیکھیے تو آدھا دیجیے بانٹ" اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایسی خدمت کی بعض صورتیں ترقی تمدن کے واسطے مفید وضروری ہونے کی وجہ سے بکثرت رائج ہیں اور بعض بوجہ ضرر رساں ہونے کے رسماً، مذہباً اور قانوناً ممنوع ہیں۔

واضح ہو کہ بے کاری اور کام سے باز رہنے میں بہت بڑا فرق ہے بے کاری خدمت کی **متضاد** ہے اور کام سے باز رہنا خدمت کی ایک شکل۔ ان دونوں میں بعینہ وہی فرق ہے جو ضعیف وقوی کے حلم یا غریب وامیر کی سادہ وضعی میں، اس فرق کا باعث گویا قدرت ہونے نہ ہونے میں مضمر ہے۔

(۱۰) اول یہ جاننا چاہیئے کہ قابلیت اور خدمت دو جداگانہ چیزیں ہیں خدمت کے واسطے قابلیت شرط ہے مگر قابلیت سے خدمت لازم نہیں آتی۔ ان دونوں کا فرق جتانا اس وجہ سے ضروری ہے کہ خدمت دولت کی ایک قسم ہے مگر قابلیت دولت نہیں شمار کی جاسکتی کیونکہ اگرچہ وہ خدمت کی شرط اور رہنا ہے لیکن بذاتِ خود اس میں دولت کے صفات نہیں پائے جاتے نہ استبدال نہ افادہ۔ مثلاً کوئی گویا اپنے فن میں کیسا ہی کامل کیوں نہ ہو، کوئی طبیب خواہ وہ

حصہ اول باب ۱

کیسا ہی حاذق کیوں نہو۔ کوئی وکیل ہر چند کہ وہ کیسا ہی قانون داں کیوں نہو۔ ہم اُن میں سے کسی کو بھی محض قابلیت کی وجہ سے کچھ نہیں دیتے۔ البتہ جب وہ اپنی قابلیت عمل میں لا کر ہماری خدمت کرتے ہیں، گانا سُناتے ہیں، مریض کا علاج کرتے ہیں یا مقدمہ کی پیروی۔ تو اُن خدمات کے صلے میں ہم خوشی خوشی اُن کو بھر بھر فیس دیتے ہیں۔ قابلیت و خدمت کا فرق مرزا غالب مرحوم نے کیسے سادہ مگر پُر اثر طریق سے واضح کیا ہے ؎

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دل کی دوا کرے کوئی

محض قابلیت نہ صرف فریقِ ثانی کے واسطے بلکہ خود صاحب قابلیت کے واسطے بھی خالی از افادہ ہے۔ مثلاً کسی کو اپنے عمدہ گویّے ہونے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ گائے نہیں البتہ یہ اختیار ہے کہ وہ اوروں کو بھی سُنائے یا خود ہی لطف اُٹھائے۔ علیٰ ہذا کسی کے شاعر یا فلاسفر ہونے سے کیا نتیجہ جب تک کہ وہ اپنے ملکہ اور کمال سے کام نہ لے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنے خیالات کے لطف میں دوسروں کو بھی بذریعہ تحریر یا تقریر شریک کرے یا نہ کرے۔ چنانچہ جو لوگ اپنی علمیت سے کام نہیں لے سکتے اُن کو "چار پائے بر و کتابے چند" سے تشبیہ دی جاتی ہے جس سے مذکورہٴ بالا معاشی اصول بخوبی ثابت ہوتا ہے۔ ایسی علمیت جس سے کام نہ لیا جائے، عالم کے واسطے اُسی قدر بے کار ہے جس قدر کہ چوپائے کے واسطے کتابیں۔ وہ عالم پر محض ایک بار ہے اور کچھ نہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خداداد یا اکتسابی قابلیت سے کام نہیں لیتے وہ دیدہ و دانستہ بہت بڑی دولت ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

افادہ کی طرح دولت کی دوسری صفت استبدال بھی قابلیت میں مفقود ہے۔ گویّا اپنے گانے سے سامعین کو محظوظ کر سکتا ہے۔ دوسروں کو فنِ موسیقی بھی سکھا سکتا ہے مگر اپنی خوش گلوئی اور بلند آوازی کسی قیمت پر منتقل یا فروخت نہیں کر سکتا کیونکہ ایسا کرنا اُس کی قدرت سے

حصہ اول باب ۱

باہر ہی۔ مصور جب تصویر بنا کر بیچتا ہی اور شاگردوں کو اس فنِ لطیف کی تعلیم بھی دے سکتا ہی مگر اُس کی قوّتِ متخیلہ اور ہاتھ کی صفائی ایسی چیزیں ہیں کہ بے شمار قیمت ادا کرنے پر بھی دوسرے کے قبضہ و تصرف میں نہیں آسکتیں۔ جب پروفیسر طلبا کو تعلیم دیتا ہی تو گو وہی طلبا پروفیسر کے برابر بلکہ اُس سے بڑھکر علم حاصل کرلیں مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہی کہ پروفیسر نے اپنی علمیت طلباء کو فیس کے معاوضہ میں دے دی۔ علم کو دولتِ لازوال اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ انسان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ بعض قابلیتیں محض خداداد ہوا کرتی ہیں جو کسی دوسرے ذریعے سے میسر نہیں آسکتیں۔ مثلاً فہم و ذکا، حسن و ظرافت وغیرہ اور بعض قابلیتیں ایک دوسرے سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہی۔ مگر مبادلہ کسی کا بھی ممکن نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ قابلیت اور خدمت معاشی حیثیت سے بالکل دو جداگانہ چیزیں ہیں اور خدمت کی طرح قابلیت کو ہم دولت اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ اس میں افادہ ہی نہ استبدال۔ ×

(۱۱) ملک بننے کی قابلیت جو عموماً مادّی چیزوں میں موجود ہی اور غیر مادّی میں مفقود ہوتی ہی اصطلاحاً استملاک کہلائیگی۔ گو مبادلہ میں انتقال ملک اکثر شامل ہوتا ہی۔ مگر لازمی نہیں۔ مبادلہ بغیر انتقال بھی ممکن ہی۔ مادّی اشیا کے مبادلہ میں انتقال موجود ہوتا ہی۔ مثلاً کتاب کے بدلے قلم، مکان کے بدلے باغ، روپئے کے بدلے غلّہ اور کپڑا۔ مگر خدمات کے مبادلہ میں کبھی انتقال ممکن ہوتا ہی اور کبھی نہیں۔ جن خدمات کا نتیجہ بشکل مادّی ظاہر ہوتا ہی مثلاً معمار، بڑھئی اور لوہار کا کام، ان کے مبادلہ میں انتقال مانا جا سکتا ہی۔ گویا کہ ایسی خدمات بشکل نتیجہ مادّی اشیا میں مقید رہتی ہیں۔ مگر جن کا نتیجہ بشکل مادّی ظاہر ہوتا ہی نہیں مثلاً تھیٹر میں گانا بجانا یا سرکس میں جرأت اور طاقت کے کرتب دکھانا، تو وہ بوجہ سریع الفنا ہونے ناقابل تملیک ہیں اور اسی وجہ سے ان کے مبادلہ میں انتقال ممکن نہیں۔

اگر ایسی خدمات کا مبادلہ کسی مادّی چیز سے کیا جائے تو انتقال یک طرفہ ہوگا۔ اور اگر آپس میں ایک دوسرے سے کیا جائے تو کسی جانب بھی انتقال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب ہم تھیٹر میں ٹکٹ کی قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف یک طرفہ انتقال ہوتا ہے۔ جب ہم تھیٹر سے لوٹتے ہیں تو کمپنی کے مینیجر کا بکس تو ٹکٹ کے داموں سے بھرا ہوتا ہے اور سب تماشائی خالی جیب ہاتھ ہلاتے چلے آتے ہیں۔ تو کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم روپیہ کھو آئے؟ نہیں۔ بلکہ جو چیز ہم نے مبادلہ میں لی وہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ناقابل انتقال تھی اور پیدا ہوتے ہی ناپید ہوگئی۔ اگر سوال کیا جائے کہ لوگ تھیٹر کیوں جاتے ہیں تو جواب ملے گا کہ لطف اُٹھانے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسی چیز کا مبادلہ ضرور ہوتا ہے جس میں افادہ اور استبدال موجود ہے۔ بالفاظ دیگر جو دولت ہے مگر مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر چونکہ اس کا انتقال ممکن نہیں اس وجہ سے تماشائی خالی ہاتھ نظر آتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص گانا اچھا جانتا ہے۔ اور دوسرا شخص بانسری بجانا۔ اور وہ باری باری اپنے کمال سے ایک دوسرے کو محظوظ کرتے ہیں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اُن کا یہ فعل مجنونانہ یعنی عبث اور بے کار ہے۔ نہیں بلکہ ایک دوسرے کی خدمت سے بحد لطف حاصل کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر دونوں کی خدمتوں میں افادہ موجود ہے اور باری باری گا بجا کر وہ اپنی خدمات کے استبدال کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ پس وہ اپنی دولت کا ایسا ہی مبادلہ کرتے ہیں جیسا کہ قلم کا کتاب سے یا مکان کا باغ سے یا روپئے کا غلہ اور کپڑے سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بوجہ سریع الفنا ہونے کے ان کی دولت کے مبادلہ میں انتقال ملک ممکن نہیں۔

یہاں یہ بتانا خالی از لطف نہ ہوگا کہ زمانۂ جدید کی ایجادات نے بعض غیر مادّی خدمات میں قابلیت ملک پیدا کر دیا ہے۔ مثلاً فونوگراف نے گانے میں کہ اکثر گویّے اپنے گانے ریکارڈ کی شکل میں کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں جس سے وہ کمپنی کی مستقل ملک ہو جاتے ہیں

یہی صفت تمام جسمانی کرتبوں میں بائیسکوپ نے پیدا کر دی ہے۔ گاما اور زبسکو کی مشہور عالم کشتی جس کے دیکھنے کو لوگوں نے صدہا روپیہ خرچ کیا ہوگا تمام بائیسکوپ کمپنیاں دکھاتی پھرتی ہیں۔

۱۲۔ واضح ہو کہ دولت کی بحث میں خلاف معمول بہت زیادہ تنقیح و توضیح سے کام لیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ عام اصول سے بعض دقیق مگر مفید و دلچسپ نتائج بطور خود اخذ کر کے جدّت نمائی کی بھی جا بجا جرأت کی گئی ہے۔ اپنی معلومات کی مدد سے ان جدید نکات کی بنیاد مستحکم اصول پر قائم کی ہے۔ معاشین کی تنقید سے آئندہ ظاہر ہوگا کہ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی۔ لیکن یہ سب کچھ علمی مذاق کی خاطر کیا گیا ورنہ علم المعیشت میں دولت کی ان ہی عام شکلوں سے بحث کی گئی ہے جو بکثرت ہر طرف نظر آتی ہیں اور جن کو سب لوگ حسب معمول پہچانتے ہیں۔ اس کی باقی شکلیں بوجہ نادر الوجود اور عملاً غیر اہم ہونے کے اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہیں۔ یہ اعتراف اس وجہ سے اور بھی ضروری معلوم ہوا کہ اکثر مروّجہ انگریزی کتابوں میں دولت کے عام فہم اصول بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ موجودہ تشریح کا اُن میں تلاش کرنا بے سود ہوگا۔

۱۳۔ دولت کی ماہیت۔ اُس کی اقسام اور اُس کی مختلف اشکال واضح کر دینے کے بعد ہم اصل موضوع علم المعیشت سمجھانے کے لئے ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ سوائے اُن معدودے چند خاص کاموں کے جو انسان مذہبی اثر سے بغرض مفادِ آخرت کرتا ہے۔ باقی جس قدر کام ہیں وہ براہ راست یا بالواسطہ ہماری ایک نہ ایک موجودہ یا آئندہ احتیاج رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں یا بالفاظ دیگر ہمارے اکثر کام کسی نہ کسی طرح پر دولت سے متعلق ہوتے ہیں اور ایسے تمام کام اصطلاح میں معاشی جدوجہد کہلاتے ہیں۔

۱۴۔ افادہ اور استبدال سے دولت کی ماہیت اور دولت کے ذریعے سے معاشی

حصہ اول باب ۱

جد و جہد کے معنی سمجھانے کے بعد اب ہم علم المعیشت یا معاشیات کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ معاشیات سے مراد وہ علم ہے جو انسان کی تمام معاشی جد و جہد سے بحث کرتا ہے اور اس مجمل تعریف کی تفصیل یہ ہے کہ معاشیات انسان کی معاشی جد و جہد سے بحث کرتا ہے اور معاشی جد و جہد سے مراد انسان کے وہ کام ہیں جو دولت سے متعلق ہوں اور دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور استبدال موجود ہو۔ یعنی جن میں احتیاج پوری کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور جن کا مبادلہ ہوتا ہو۔ معاشیات کی مختصر تعریف **علم دولت** بھی ہے۔ مگر بیان بالا سے ظاہر ہے کہ معاشیات کا اصلی موضوع انسانی احتیاجات اور اُن کے پورا کرنے کی جد و جہد ہے اور دولت سے جو کہ احتیاج پورا کرنے کا آلہ ہے۔ اس کا تعلق محض بالواسطہ ہے۔ اس مختصر تعریف نے معاشیات کے موضوع کے متعلق زمانہ گزشتہ میں نہایت بے بنیاد غلط فہمی پیدا کر دی تھی کہ گویا وہ دولت پرستی کی تلقین کرتا ہے۔ جس کی بدولت اس علم کی راہ ترقی میں تعصب اور مخالفت کی ایسی رکاوٹیں کھڑی ہو گئیں کہ سالہا سال کی کوشش سے بمشکل رفع ہو سکیں۔ علم المعیشت میں دولت کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو کہ ادویہ کی علم طب میں گویا وہ موضوع سے متعلق ضرور ہے۔ لیکن بذات خود موضوع نہیں۔

۱۵۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ معاشیات کا موضوع کیا ہے۔ اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ معاشی جد و جہد چار صورتیں اختیار کر سکتی ہے یا تو وہ پیدائش دولت سے متعلق ہو گی یا تقسیم یا مبادلہ یا صرفِ دولت سے اور ان چاروں صورتوں میں حسب ترتیب بالا ایک رشتہ تعلق بھی قائم ہے۔ اول دولت پیدا کی جاتی ہے۔ پھر جو لوگ پیدا کرنے میں شریک ہوتے ہیں اُسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ بعدہٗ بمقتضائے ضرورت اپنی چیز کا دوسروں کی چیز سے مبادلہ کرتے ہیں اور بالآخر اُس کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً کاشتکار اپنے ہل بیل کھاد اور بیج لگا کر کچھ مزدوروں کی مدد سے زمینداروں کے کھیت میں غلہ پیدا کرتا ہے۔ جب

راس تیار ہوتی ہی تو وہ کاشتکار، فردور اور زمیندار کے درمیان منافع، مزدوری اور لگان کی صورت میں تقسیم ہوجاتی ہی۔ اس میں سے ہر ایک اپنا کل حصہ یا اُس کا جزو بازار میں فروخت کرکے حسب ضرورت کپڑا، جوتہ اور ضروری سامان خریدتا ہی جن کو وہ اپنے گھر لاکر استعمال کرتا ہی۔ پس ہم اپنی کتاب میں انھیں چار صورتوں یعنی پیدایش، تقسیم، مبادلہ اور صرف دولت کے تحت میں حسب ترتیب مذکورۂ بالا بحث کرینگے۔

واضح ہو کہ معاشی جد و جہد کی چار صورتوں کی موجودہ ترتیب سے علمی بحث میں سہولت ہوگی ورنہ حقیقت یہ ہی کہ عملاً صرف پیدایش پر مقدم ہی اور مبادلہ تقسیم دولت پر واقعات و مشاہدات خود اس کی توضیح کرتے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ ضروری سمجھا گیا

۱۶ اوپر کے بیان سے واضح ہوگا کہ معاشیات انسان کی کوششوں اور کاموں کے ایک خاص پہلو سے بحث کرتا ہی۔ اس کی نظر میں تمام انسان کاروبار میں مصروف اور اپنی ضروریات زندگی حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض دیگر علوم انسانی گروہ کے افعال پر دوسرے نقطہ خیال سے نظر ڈالتے ہیں۔ مثلاً علم **قانون** کے نزدیک تمام لوگ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کے معاوضہ میں سزا کا مطالبہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ علم سیاست کے خیال میں سب آدمی سلطنت کے نظم و نسق اور حکومت کی کل چلانے میں مصروف ہیں تاریخ تمدن گروہ انسان کی مختلف طرز ہائے بود و باش اُس کے عجیب رسم و رواج اور عادات اور روایات کا تماشا دکھاتی ہی۔ علم الاخلاق عقل یا مذہب کی کسوٹی پر افعال انسانی کا حسن و قبح جانچتا ہی۔ غرضکہ یہ کئی علم ایک ہی چیز یعنی انسانی گروہ کے افعال کو مختلف نظروں سے دیکھتے اور اُن کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں اور ان کو اصطلاحاً **علوم متجانسہ** کہتے ہیں۔ چونکہ انسان کے تعلقات تمدن ان تمام علوم کا مشترک موضوع ہیں ان کو ایک جامع علم تمدن کی جنس کا نوع سمجھنا چاہیئے۔ یہ سب آپس میں

اس قدر ملے جلے ہیں کہ بھول بھلیاں معلوم ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حد فاصل قائم کرنا محال ہے۔ جس طرح کہ ہوا میں گرد و نواح کی چیزوں سے سردی گرمی، نمی، آواز اور بو پھیلتی ہے علوم متجانسہ کے اثرات بھی ہر ایک علم کی بحث میں اسی طرح پیوست نظر آتے ہیں جو کچھ تفریق کی جاتی ہے وہ بیشتر خود اختیاری ہے۔ کسی قطعی اصول کی پابند نہیں۔ تاہم سہولت مطالعہ سخت مقتضی ہے کہ علم تمدن جیسا وسیع مبحث چند کم و بیش جداگانہ علوم میں تقسیم کیا جائے چنانچہ اسی ضرورت سے تفریق باوجود ادھوری ہونے کے برقرار رکھی گئی اور تجربہ سے مفید بھی ثابت ہوئی ہے۔

مذکورۂ بالا علوم متجانسہ سے معاشیات کا میل جول جس کے سمجھنے کے واسطے مسائل معاشیات کا علم شرط اول ہے اس قدر گہرا اور گوناگوں ہے کہ اس کی دقیق و طویل تشریح یہاں پر قبل از وقت خیال کرکے ترک کرتے ہیں۔ آیندہ مسائل پر غور کرنے سے اس کی جھلک خود نظر آنے لگے گی۔

۱۷۔ علم المعیشت میں علوم متجانسہ کا گوناگوں اثر تو اس طرح پھیلا ہوا ہے جیسے ہوا میں گرمی سردی، نمی، آواز اور بو لیکن اس کے علاوہ معاشیات نے علوم غیر متجانسہ کی معلومات سے اپنے مباحث میں جابجا بلا تکلف سنگ بنیاد اور ارض اساسی کا کام لیا ہے دیگر علوم کے اصول و قوانین کو بطور مسلمات قبول کرکے ان پر معاشی مسائل کی عمارات قائم کی گئی ہیں ایسے مسلمات کی بعض علما نے لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کی ہیں۔ چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے استعمال کی تفصیل اور مثالیں آیندہ مباحث میں جابجا مل سکیں گی اور غور و تجسس سے ان کا پتا لگانا نہ صرف بے حد دلچسپ بلکہ مسائل سلجھانے میں کارآمد بھی ہوگا یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے:

(الف) **قانون تقلیل حاصل**۔ عمل پیدائش خصوصاً زراعت میں اگر اضافہ پیداوار کی اُمید سے مصارف بڑھاتے رہیں تو ایک ایسی حد آتی ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کا نتیجہ مصارف سے پیداوار کی نسبت میں بیش افزوں تخفیف ہوگا۔ یعنی بمقابلہ جدید مصارف

کے مزید پیداوار کی مقدار نسبتاً گھٹتی چلی جاوے گی مسئلہ لگان اسی قانون پر مبنی ہے۔

(ب) **قانون تکثیر حاصل**۔ مذکورۂ بالا قانون کا بالکل برعکس ہے اور صنائع میں اس کا عمل بکثرت رائج ہے۔ اس کی تفصیل پیدائیش بر پیمانہ صغیر و کبیر کی بحث میں کی جاوے گی

(ج) **قانون طلب**۔ شے مطلوبہ کی مقدار مقبوضہ میں ہر جدید اضافہ کا افادہ نسبتاً گھٹتا جاتا ہے حتی کہ اگر اضافہ برابر جاری رہے تو ایک حد پر مزید اضافہ کا افادہ بالکل غائب ہو جاتا ہے

(د) **قانونِ رسد**۔ ہر شخص قلیل ترین صرف سے اپنی احتیاج پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں قانون علم النفس سے متعلق ہیں اور معاشیات میں ان کا استعمال بحث مبادلہ دولت سے ظاہر ہوگا۔

۱۸۔ واضح ہو کہ ہر علم میں قانون کا مفہوم چند اسباب سے ہمیشہ یکساں نتائج پیدا ہونے کا واقعہ ہے۔ مثلاً جب ہم کوئی چیز ہوا میں اچھالتے ہیں تو وہ بالآخر زمین پر گرتی ہے۔ اسی واقعہ کو **قانونِ کشش مرکزی** سے تعبیر کرتے ہیں جس کا منشا یہ ہے کہ زمین ہر چیز اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن اگر اڑتے ہوئے پرند اور غبارے اور درختوں میں لگے ہوئے پھل میز پر رکھی ہوئی کتابیں زمین پر نہیں گرتیں تو کیا اس سے قانون کی صحت پر حرف آسکتا ہے؟ نہیں۔ ان چیزوں پر قانون برابر عمل کر رہا ہے۔ لیکن مخالف اسباب یکساں نتیجہ پیدا نہیں ہونے دیتے تقریباً ہر قانون سے ایسی مزاحمت ممکن ہے۔ چنانچہ قوانین کے عمل درآمد میں ہمیشہ موانع کی عدم موجودگی فرض کر لی جاتی ہے گویا قوانین مشروط ہوتے ہیں۔ مادّی علوم میں تو ہر قانون کے اسباب و نتائج اور موانع کی پوری تحقیق اور تفریق ممکن ہے۔ اسی وجہ سے یہ قوانین بہت زیادہ صحیح اور متحقق ہوتے ہیں۔ لیکن علوم متجانسہ کی بحث سے ظاہر ہوگا کہ علوم تمدن کے قوانین کی حالت بالکل برعکس ہے۔ مزید برآں چونکہ یہ علوم گروہ انسانی کے افعال سے بحث

کرتے ہیں اور انسان دیگر مخلوق کی مانند قدرت کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں بلکہ اپنے افعال کا وہ بہت کچھ مختار ہے۔ اس کی مرضی جو کسی قانون کی پابندی سے آزاد ہے، قوانین تمدن کے عمل درآمد میں بہت کچھ معاون یا مانع ہو سکتی ہے۔ اور لطف یہ کہ اس کی مداخلت بھی خود اختیاری ہے۔ نتیجہ یہ کہ علوم تمدن کے قوانین اکثر تخمینی اور کم و بیش غیر معین ہوتے ہیں اور مادّی علوم کے قوانین سے بدرجہا مشروط اور اس حیثیت سے معاشیات کے قوانین باقی سب پر فائق نظر آتے ہیں۔ مزید برآں معاشی قوانین نہ صرف پابند شرائط ہیں بلکہ اکثر ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو بحیثیت مجموعی خلاف حقیقت نہ سہی لیکن نادر الوجود اور بعید از واقعات ضرور ہیں۔ یہاں پر یہ اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایسے مفروضات میں اسباب زیر بحث ہمیشہ واقعی اور حقیقی ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بہت سے اسباب میں سے چند منتخب ہوتے ہیں اور اُن کے عملدرآمد کی حالتیں بھی بغرض سہولت نہایت سادہ فرض کی جاتی ہیں۔ چنانچہ اس آخرالذکر حیثیت سے یہ مفروضات بعید از واقعات کہے جا سکتے ہیں۔ ورنہ ان میں کبھی بے بنیاد اور خیالی اسباب سے ہرگز بحث نہیں کی جاتی۔ پس ان مفروضات کی بنا پر معاشی قوانین کو محض خیالی اور ناکارہ سمجھنا بجا نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں یہ مفروضات ناگزیر بھی ہیں جب کہ بے شمار موافق اور مخالف اسباب کا تصادم ہو اور اختلاف حالات کی کوئی انتہا نہ ہو تو تعین قوانین کا سوائے اس کے کوئی طریق نہیں کہ فروعات اور خصوصیات کو نظرانداز کر کے صرف چند قوی اسباب اور از حد سادہ حالات کے مفروضات پر اکتفا کیا جائے۔

ایسے مفروضات پر جو قانون مبنی ہونگے وہ بشکل اول گو معاشی واقعات کی سچّی تصویر نہ ہوں لیکن بتدریج مختلف اسباب کا لحاظ کر کے ان میں ایسی ترمیم اور اصلاح ممکن ہے کہ وہ حقیقی حالات کے مطابق بن جائیں اور واقعات کی تشریح کر سکیں۔ واضح ہو کہ جو قوانین اسباب کثیر پر مبنی ہوں اُن کے تعین کا یہی علمی طریقہ ہے اور اس کو اصطلاحاً طریق تسہیل

حصہ اول باب ۱

کہتے ہیں۔ لگان کی بحث میں بھی ہم نے معاشی قوانین کی فرضی حالت اور طریق تسہیل کی طرف اشارہ کیا ہی (۵/۹) غور کرنے سے دیگر مسائل میں بھی یہی کیفیت نظر آئے گی۔ قوانین جانے بغیر ان کے اساسی مفروضات کی مفصل بحث سراسر قبل از وقت ہوگی۔ یہاں اشارہ کافی ہی۔ آیندہ غور کرکے خود مفروضات اساسی کی تحقیق اور واقعات کی تطبیق کرنا طالب علم کے حق میں بے حد مفید کوشش ثابت ہوگی۔ بشرط ضرورت اشارہ سے ہم بھی مدد دینگے۔

معاشیات کی وسعت

۱۹ - علماء میں مدتوں سے یہ بحث جاری ہی کہ معاشیات آیا محض **علم** ہی یا **فن** یا دونوں کا مجموعہ اور آیا من حیث العلم وہ **علم التحقیقت** ہی یا **علم الہدایت** یا دونوں کا مرکب۔ اس بحث پر بے حد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہی۔ وجہ یہ ہی کہ جو موانع علوم متجانسہ کی تفریق میں پیش آتے ہیں وہی بدرجہ اولیٰ یہاں پر وسعت بحث کے تعین میں سد راہ بنتے ہیں اور اس سوال کا حل بھی بجائے کسی متفق علیہ اصول کے بیشتر خود رائی پر منحصر پایا جاتا ہی۔ معاشیات کی بحث پانچ جداگانہ درجوں میں منقسم ہوسکتی ہی (۱) جد و جہد معاشی کا صحیح وسالم بیان (۲) جد وجہد معاشی کی توجیہہ اور معاشی قوانین کی تحقیق (۳) کسی ایک معیار کا تعین جس سے معاشی معاملات کی بھلائی برائی دریافت ہوسکے (۴) مذکورۂ بالا معیار کے ذریعہ سے بہبودی اور مرفہ الحالی کے معاون اصول منتخب کرنا (۵) اصول منتخبہ پر کاربند ہونے کے طریق وتدابیر بتانا۔ ان میں سے پہلے دو درجے علم التحقیقت کے ماتحت ہیں۔ بعد کے دو علم الہدایت سے متعلق ہیں اور پانچواں فن میں داخل ہے۔ سچ پوچھئے تو معاشیات کی تینوں مذکورۂ بالا حیثیتوں کا لحاظ لابد اور ناگزیر ہی علم التحقیقت بغیر تو علم الہدایت اور فن کا مطالعہ ممکن ہی نہیں اور ہر حالت میں معاشیات کا علم التحقیقت ہونا لازمی ہی۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا ہی کہ محض علم التحقیقت بھی بذات خود عبث اور لا حاصل ہی۔ بھلا معاشی جد وجہد کے بیان و توجیہہ اور قوانین اساسی کی

تحقیق سے کیا فائدہ اگر بعد کو بہبودی اور مرفہ الحالی کے اصول نہ قرار دیئے جائیں اور نیز ان پر عمل پیرا ہونے کی تدابیر نہ نکالی جائیں۔ ان علوم اور فن کا گہرا تعلق اور باہمی انحصار سب تسلیم کرتے ہیں۔ جو کچھ بھی اختلاف رائے ہے وہ اُن کی ترتیب اور تسمیہ پر ہے مدت تک یہ تینوں بلا تفریق المعاشیات میں داخل رہے۔ لیکن ایک جدید گروہ نے جو ان تینوں کی تفریق مفید بلکہ ضروری خیال کرتا ہے تقسیم کار کے زرّیں اصول کے مطابق معاشیات کو علم التحقیقت تک محدود کر کے علم الہدایت اور فن کو علی الترتیب **فلسفہ تمدن** اور **مالیات** کے تحت میں منتقل کر دیا۔ مثلاً مسئلہ ٹکس لیجئے (۱) ٹکس کی ماہیت اور ادا کرنے والوں پر اس کا گوناگوں اثر دریافت کرنا معاشیات کا کام ہے (۲) ٹکس کے ایسے اصول قرار دینا کہ وہ ملک کے حق میں سراسر مفید ہو سکے فلسفہ تمدن سے متعلق ہے (۳) ٹکس کے مذکورۂ بالا اصول پر کاربند ہونے کی تدبیر نکالنا مالیات کے ذمہ ہے آیندہ ٹکس کی بحث میں اس مثال کی تشریح ملے گی یہاں پر مختصراً بیان کر دی گئی۔ واضح ہو کہ اس جدید تفریق کی چند نہایت معقول اور قابل لحاظ وجوہات پیش کی جاتی ہیں جن میں سے ایک صفائی بیان اور سہولت مطالعہ بھی ہے۔ گویا علمی بحث میں یہ تفریق نہایت مفید ہے اور علوم متجانسہ کے تعلق سے صاف ظاہر ہے کہ عملی حیثیت سے بعد تفریق بھی ان تینوں کے رشتہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح معاشئین بلا تکلف حسب ضرورت علوم متجانسہ کے قوانین اور اُن کے اثرات کا معاشی مباحث میں پورا لحاظ کرتے ہیں۔ اسی طرح بمقتضائے ضرورت مذکورۂ بالا حیثیتیں بھی معاشی بحث میں یکجا پیش کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حامیان تفریق نے بھی المعاشیات کی کتابوں میں جا بجا یہی طریق برتا ہے۔ لیکن اس سے ان پر ترک تفریق کا الزام عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آخری دو حیثیتوں کا لحاظ بطور علوم متجانسہ کرتے ہیں اور ان کو قدیم گروہ کی طرح خود معاشیات کا جزو تسلیم نہیں کرتے۔ بعض

علما نے معاشی فن اور مالیات میں بھی تفریق کرکے اول کو آخر کا ماخذ قرار دیا ہی لیکن یہ نکتہ کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ہی۔ نیز ظاہر ہی کہ مالیات اور فن قانون سازی میں وہی تعلق ہی جو جسم و روح یا مشین اور انجن میں۔ گویا قانون ہی جان ڈالتا اور حرکت پیدا کرتا ہی مالیات بذات خود معطل ہی۔

حاصل کلام یہ کہ علم المعیشت بذات خود نہ کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہی نہ فضول خرچی کی ممانعت، نہ دولت مند بننے کا راز بتاتا ہی نہ مفلسی دور کرنے کی تدبیر۔ وہ علم الحقیقت ہی اور محض معاشی جد و جہد کی تشریح و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق اس کا کام ہی اور ساتھ ہی اس کے فلسفہ تمدن اور مالیات کو اصول مرفہ الحالی کی تعین اور ان پر کاربند ہونے کی تدابیر معلوم کرنے میں ناگزیر مدد دیتا ہی۔ اگر ایک ہی شخص یہ تینوں کام سر انجام دے تو اس کی تین جداگانہ حیثیتیں ہوں گی۔ یعنی جہاں وہ معاشی کہلائے گا۔ وہاں تمدن کا فلسفی اور مدبر مالیات نہیں مانا جائے گا اور محض اول الذکر حیثیت میں آخری دو کام باوجود نہایت موزوں ہونے کے اس کے حلقہ فرائض سے باہر ہیں۔ چونکہ علم الحقیقت شرط اول اور علم الہدایت و فن غرض و غایت ہیں نہ صرف عملی میدان میں یہ تینوں دوش بدوش چلتے بلکہ علمی بحث میں بھی زانو بہ زانو بیٹھتے ہیں ان کے قریبی تعلقات سب کو تسلیم ہیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں۔ صرف ترتیب و تسمیہ پر اختلاف رائے ہی۔ ایک گروہ ان کی تفریق بے معنی دے کر تینوں کو معاشیات میں شامل کرتا ہی۔ دوسرا ایسی تفریق مفید بلکہ ضروری سمجھ کر ان کو علم المعیشت، فلسفہ تمدن اور مالیات میں تقسیم کرتا ہی اور یہی رائے آج کل زیادہ مقبول اور مقبول تر ہوتی جاتی ہی

علم المعیشت کی ایک تقسیم **معاشیات اصولی** اور **معاشیات عملی** بھی ہی قسم اول میں علاوہ علم الحقیقت کے علم الہدایت بھی شامل ہو سکتا ہی اور قسم دوم مالیات کا دوسرا

نام ہے اور اس میں سکہ بنک اور حصول ٹکس جیسے عملی مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

حصہ اول باب ا معاشیات کا طریق

۲۰ - واضح ہو کہ عملی تحقیق کے دو طریق ہیں۔ متفرق فروعات سے کسی اصول واحد کا پتا لگانا۔ تفصیل سے اجمال نکالنا یا کوئی اصول تسلیم کرکے اس سے فروعات اخذ کرنا اجمال سے تفصیل پیدا کرنا دونوں منطق کی شاخیں ہیں۔ اصطلاحی زبان میں اول کو **استقرا** اور دوم کو **استخراج** کہتے ہیں معیشت کی تحقیق میں یہ دونوں اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں۔ جیسے دال چاول کھچڑی میں۔ مدتوں معاشئین نے اس علم کو کسی ایک طریق کا پابند ثابت کرنے کی فضول کوشش کی۔ تجربہ سے تحقیق کے واسطے دونوں طریق کا اجماع اس طرح پر لازمی ثابت ہوا جیسے تراش کے واسطے قینچی کے دو پلڑوں کا ملنا۔ معاشیات کے جن مباحث میں عملی حیثیت غالب ہے۔ مثلاً اضافہ اصل۔ مسئلہ آبادی۔ پیدائش دولت وہاں طریق اول موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے اور جن مباحث پر اصول کا رنگ گہرا چڑھا ہوا ہے۔ مثلاً مبادلہ یا تقسیم دولت، وہاں طریق دوم بیشتر مستعمل ہے۔ لیکن یہ دونوں طریق نہ صرف اس طرح پر بحیثیت مجموعی تحقیق معاشیات کے واسطے ضروری ہیں۔ بلکہ خود ہر طریق کا عمل بغیر دوسرے کی شرکت اور معاونت کے ناقص اور نامکمل ہوتا ہے۔ چنانچہ نتائج استقرائی علمی حیثیت سے بے سود ہیں جب تک استدلال استخراجی سے ان کی توجیہ نہ کی جائے۔ علیٰ ہذا نتائج استخراجی عملاً بے کار ہیں جب تک کہ بطریق استقرا ان کی صحت واقعات سے ثابت نہ ہو جائے اور لازمی شرائط دریافت نہ ہوں۔ المختصر دونوں مذکورہ بالا منطقی طریق معاشیات کی تحقیق میں لابد ہیں۔ البتہ حسب حال مسئلہ زیر بحث کبھی طریق استقرا کا استعمال مقدم ہوتا ہے۔ کبھی طریق استخراج کا۔ لیکن ہر حال میں ان کا اجماع لازمی ہے۔ واضح ہو کہ طریق معاشیات کی بحث فی نفسہ دقیق ہے اور اس کے سمجھنے کے واسطے معاشی اصول و مسائل کا علم شرط مقدم ہے۔ یہاں

صرف مختصر اور سلیس بیان کافی اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۲۱۔ مذکورہ بالا بحث مباحثوں کا ذمہ دار خاص طور پر لفظ اکانمی ہے۔ جو اس علم کے معروف نام پولٹیکل اکانمی میں داخل ہے۔ اس لفظ کی سرگزشت نہایت دلچسپ ہے جس کو ہم یہاں مختصراً بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں گھر بار کا انتظام یعنی ضروریات خانہ داری کی بہم رسانی اور آمدنی اور خرچ کا حساب۔ اصطلاحاً اس کو تدبیر منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یورپ میں انقلابِ فرانس سے قبل حکومت لوگوں کے معاشی معاملات میں اسی طرح مداخلت کرتی تھی جیسے کوئی استبداد پسند بڑا بوڑھا اپنے گھر کے کاموں میں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ مثلاً ایسے قانون وضع کئے گئے تھے کہ کوئی مزدور ایک قصبہ سے دوسرے قصبہ میں جاکر بغیر اجازت خاص محنت مزدوری نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی پیشہ ور اپنا کاروبار بے اجازت جاری نہیں کر سکتا تھا۔ قیمتی دھاتوں کی برآمد قطعاً ممنوع تھی اور ایسے ہی بہت سے قانون جاری تھے جنھوں نے معاشی جد وجہد کو طرح طرح کی ناقابل برداشت بندشوں سے جکڑ دیا تھا اور معاشیات نہ جاننے کی وجہ سے یہ طرز عمل ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کا معاون سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ انتظام خانہ داری اور معاشی معاملات کی سرکاری نگرانی میں ایک مشابہت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا محض اکانمی یا تدبیر منزل سے مشابہت اور نیز فرق ظاہر کرنے کے لئے اس علم کا نام اکانمی پر اسم صفت یعنی لفظ پولٹیکل اضافہ کر کے پولٹیکل اکانمی یا تدبیر مدن قرار دیا اور چونکہ طلب منفعت ایسے کاموں کی لازمی خصوصیت ہے۔ لفظ اکانمی سے کفایت شعاری کا خیال تبدریج پیوست ہو کر بالآخر ایسا حاوی ہوا کہ لوگ اصلی معنی یعنی انتظام خانہ داری یا معاشی جد وجہد کی نگرانی بھلا بیٹھے اور مدت تک اچھے اچھے اس مغالطہ میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری، دولت پرستی اور حد درجہ کی خودغرضی سکھاتا ہے

لفظ اکانمی کی تحقیق

حصہ اول
باب ۱

اکثر پاک طینت علما نے اس پر بہت زہر اگلا ہی اور دل کھول کر اسے صلواتیں سنائی ہیں مگر در اصل ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی حق بجانب اور اس لئے قابل معافی ہیں۔

چونکہ لفظ پولیٹیکل اکانمی سے مغالطہ کا اندیشہ باقی رہتا ہی اس لئے اب یہ علم زیادہ تر اکنامکس کے سیدھے سادھے نام سے موسوم کیا جاتا ہی۔

اصطلاح یا معاشیات کی صحت

۲۲- اس علم کے اصلی موضوع اور اس کی وسعت کے متعلق جو جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں اُن کی جھلک اس کے اُردو ناموں میں بھی نظر آتی ہی- چنانچہ علم ثروت، اصول دولت، اصول تونگری اور ملکی کفایت شعاری وغیرہ جیسے مختلف خطابات اس کو دیئے جا چکے ہیں اور لفظ اقتصاد یا اقتصادیات کو اخبار اور رسالوں نے اس قدر رواج دے دیا ہی کہ اس پر انگلی اُٹھانے سے لوگ چونکتے ہیں لیکن اس ترجمہ میں بھی پولیٹیکل اکانمی کے قدیم اور متروک مفہوم یعنی میانہ روی، کفایت، ضبط و نظم کی ہلکی ہلکی جھلک صاف نظر آتی ہے اقتصادیات کے مفہوم پر تو اکنامکس کا ایک چھوٹا سا شعبہ فنانس یعنی مالیات بہت کچھ حاوی ہی اور خود اس علم کا جدید مفہوم اس سے کہیں وسیع اور اعلیٰ ہی- اکنامکس کے مباحث کی نوعیت اور وسعت مدنظر رکھتے ہوئے جو نام سب سے بہتر دریافت ہو سکا وہ علم المعیشت ہی جس کو مختصراً معاشیات کہنا اور بھی موزوں ہوگا۔

معاشیات کی مختصر سرگزشت

۲۳- یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ کسی زمانہ میں حکومت معاشی معاملات میں بہ کثرت جا و بیجا مداخلت کیا کرتی تھی اس طرز عمل کو اصطلاحاً طریق استبداد اور اس کے حامیوں کو مستبدین کہتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ اس زمانہ میں معاشیات بحیثیت فن سرکار کی معاشی پالیسی سے متعلق تھا اور بس۔ لیکن انقلاب فرانس کے بعد فرانس میں حکما کا ایک زبردست گروہ متوکلین نام پیدا ہوا جس نے سرکاری مداخلت کی بڑے زور سے مخالفت کی- اس کو بیحد مضر ترقی و بہبود ثابت کیا۔ اور اصول غیر مداخلت کی اس شد و مد سے منادی کی کہ

گھر گھر چرچا ہو کر وہ بہت جلد ہر دل عزیز ہو گیا اور بالآخر حکومت کو بھی عام رائے کے مطابق اپنی پالیسی تبدیل کرنی پڑی، روز بروز معاشی معاملات قانونی بندشوں سے آزاد ہونے لگے۔ چنانچہ جب آدم اسمتھ نے اس اصول کی انگلستان میں اشاعت کی تو قانون غلّہ جو درآمد غلہ کو روکتا تھا اور مدتوں تک نہایت ضروری و مفید خیال کیا جاتا تھا۔ منسوخ کر دیا گیا اور درآمد و برآمد غلہ میں پوری آزادی مل گئی۔ اصول غیر مداخلت کے اثر سے سرکاری نگرانی گھٹتے گھٹتے تقریباً بالکل مفقود ہو گئی۔ معاشی معاملات کو قانون کے نیچے سے رہائی ملی اور اسی عرصہ میں معاشیات نے بھی محض سرکار کی معاشی پالیسی کی بحث سے آگے بڑھکر علمی میدان میں قدم رکھا۔ کچھ تو انسان بالطبع نگرانی کا محتاج ہے اور کچھ کلوں کی ایجادات نے ملک کی معاشی حالت میں ایسا انقلاب عظیم پیدا کر دیا (اور اس انقلاب کی ہم مناسب موقع پر کافی تشریح کریں گے) کہ سرکاری نگرانی کی ضرورت پھر بشدت محسوس ہونے لگی۔ غیر مداخلت کا طرزِ عمل بالکل تو متروک نہیں ہوا لیکن اس میں مناسب ترمیمات ضرور کر دی گئیں اور بمقتضائے ضرورت سرکار نے پھر معاشی معاملات کی نگرانی کے واسطے قوانین پاس کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ قانون بنک، قانون فیکٹری وغیرہ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہیں مگر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حکومت کی گزشتہ اور موجودہ مداخلت میں نگرانی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اُس زمانہ میں مداخلت عام طرز عمل تھا اور بوجہ معاشی ناواقفیت کے اس کے کثرت استعمال سے بہت سی صورتوں میں مداخلت غیر ضروری اور مضر ہوتی تھی برخلاف اس کے آج کل غیر مداخلت عام طرز عمل ہے اور اگر بمقتضائے ضرورت کبھی نگرانی کی بھی جاتی ہے۔ تو بوجہ واقفیت معاشیات وہ ضروری اور مفید ہوتی ہے۔ یہ جدید پالیسی طریق استبداد و غیر مداخلت کا ایک معتدل مرکب سمجھنا چاہیئے جس کو سرکاری نگرانی کہنا موزوں ہوگا۔ اس تیسرے دور میں معاشیات کے علم و فن میں امتیاز پیدا ہونے سے دونو

جدا ہو گئے۔

حصہ اول باب ۱

اس بحث سے بظاہر معلوم ہوگا کہ تاریخی لحاظ سے معاشیات اول تشکیل فن نمودار ہوا لیکن ترقی کرتے کرتے اس نے ایک علم کی شان حاصل کرلی اور بالآخر اس میں علم اور فن کی دو جداگانہ حیثیتیں پیدا ہو گئیں۔ یہاں ایک یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم سے فن پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فن سے علم۔ لیکن یہ بحث بعینہٖ ایسی ہی جیسے کہ " انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی " واقعہ یہ ہے کہ اول انسان تجربۃً اپنی احتیاج پوری کرنے کی تدابیر نکالتا ہے اور کامیاب ہونے پر وہی تدابیر علم و فن کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ کچھ عرصہ تک علم و فن ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسے دودھ میں گھی لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں جدائی شروع ہونے لگتی ہے اور بالآخر علم فن سے بالکل ممیز اور ممتاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فن طب اور علم الابدان نجوم اور ہیئت کے تاریخی رشتہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ غرضکہ معاشیات میں بھی ترقی ہوتے ہوتے فن سے جداگانہ ایک علم الحقیقت کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ اور من حیث العلم گروہ انسان کے افعال کا ایک خاص نقطہ نظر سے مطالعہ کرنا اس کا مقصد اعلیٰ قرار پایا ہے۔

معاشیات کا حاضر اور مستقبل

۲۴ - ترقی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں جن کو سلجھانے کے لئے ناخن علم ناگزیر ہے۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں سے صرف ایک معاشی جد و جہد ہی پر ذرا غور کیا جائے کہ اب اس کا حلقۂ اثر شہروں، صوبوں بلکہ ملکوں سے نکل کر تمام عالم پر محیط ہو گیا ہے۔ زمانۂ جدید کی ایجادات تار، مطبع، ریل، جہاز اور طرح طرح کی کلوں نے تمام دنیا کو کیسے کیسے قوی تعلقات اور مضبوط رشتوں سے جکڑ دیا کبھی ہماری ضروریات انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں اور ان کو پورا کرنے کے وسائل کیسے سیدھے سادھے اور مختصر تھے۔ ہر قصبہ و شہر اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات کا بیشتر کفیل ہوتا تھا اور رسد ضروریات کے واسطے اپنے ملک سے باہر کوئی نظر بھی نہیں

ڈالتا تھا۔ مگر آج مہذب اور متمول طبقہ کا تو ذکر ہی کیا ہے، دنیا کا وہ کونسا ملک ہے جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز اُن کے محل یا کوٹھی کے سامان میں داخل نہیں۔ آپ ایک غریب اور جاہل گنوار کے جھونپڑے میں بھی کم از کم روس یا برہما کا مٹی کا تیل، امریکہ یا جرمنی کی لالٹین، جاپان یا آسٹریا، ناروے یا سوئیڈن کی دیاسلائی کا بکس اور انگلستان کا کپڑا ضرور موجود پائیں گے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سوئیٹزرلینڈ کی سستی گھڑیوں، امریکہ کے سگرٹوں انگلستان کے قلم، چاقو اور چھریوں کا رواج بھی گاؤں کے اسکول جانے والے بچّوں میں بکثرت پھیلتا جاتا ہے۔ اس سے ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک طرف تو ہماری ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف اُن کے پورا کرنے کے وسائل وسیع ہو رہے ہیں اور یہ تہذیب کی ترقی اور آبادی کی فراوانی کا مقتضا ہے۔ جس کی توضیح ہم آئندہ مناسب موقع پر کریں گے۔ یہاں صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ اس عالمگیر رجحان کو روکنا نہ ممکن ہے نہ مفید البتہ اس کو چند اصول کا پابند بنانا ضروری ہے۔ جس کی تفصیل تجارت بین الاقوام کے تذکرہ میں کی جائے گی۔ دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود پورا کر سکے اور دوسرے ممالک کا کم وبیش دست نگر نہ ہو۔ کسی ملک میں اشیائے صنعتی کی درآمد ہے جیسے ہندوستان میں اور کسی میں پیداوار خام کی مانگ ہے جیسے انگلستان میں۔ لیکن دنیا کے تمام ممالک اپنی ضروریات کے رفع کرنے میں کم وبیش اسی طرح محتاج ہیں جس طرح کسی چھوٹے سے گاؤں میں ایک پیشہ ور دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ رسد ضروریات کے وسائل نہ صرف وسیع ہو گئے ہیں بلکہ ان کی حالت میں بھی انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ ذرا جلاہے کے کرگے کا مانچسٹر یا بمبئی کی ملوں، موچی کی دکان کا نارتھمپٹن یا کانپور کی فیکٹریوں اور لوہار کی بھٹّی کا لیڈس یا ٹاٹا ورکس کے کارخانوں سے مقابلہ تو کرو۔ کوئی بھی نسبت ہے؟ حالانکہ اُن کے کام اب بھی یکساں ہیں۔ مزید براں سب سے زیادہ

حصہ اول
باب ۱

قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے نئے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو عام ملکی اور قومی بہبودی اور مرفہ الحالی کے سنگ بنیاد ہیں اور جن کا حل کرنا علم اور تجربہ کی مدد کے بغیر محال ہے۔ سکہ، نوٹ، بنک، مل اور فیکٹری، ریل، نہریں، معدنیات و جنگلات، تعلیم، صحت، ٹیکس، تجارت درآمد و برآمد اور عام مرفہ الحالی وہ چند جدید اور اہم مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں آج دنیا کے بہترین دماغ براہ راست یا بالواسطہ مصروف ہیں اور یہی وہ مسائل ہیں جو تمام مہذب سلطنتوں کی داخلی و خارجی پالیسی کے روح رواں بنے ہوئے ہیں۔ واقعات شاہد ہیں کہ عرصہ سے معاشی اغراض جنگ کے محرک ہوا کرتے ہیں اور معاشی تسلط اکثر ملک گیری کا پیش خیمہ ہوتا ہے/ قدیم و جدید طریق ملک گیری کے متعلق مولوی ذکاءاللہ صاحب مرحوم کا لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ پہلے تو قاعدہ تھا آگے لٹھیا پیچھے گھٹیا۔ لیکن آج کل اس کے برعکس آگے گھٹیا اور پیچھے لٹھیا پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ہندوستان، مصر، مراکش سب اسی مہلک راز کا زبانِ حال سے اعلان کر رہے ہیں۔ ٹرکی و فارس کی بیچارگی اور جاپان اور افغانستان کی خودداری سے معاشی تسلط اور آزادی کا کیسا افسوسناک فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پس جب کہ انسانی زندگی کا معاشی شعبہ اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہوگیا ہے اور اس کا اثر ہماری بہبود پر اس قدر حاوی ہے تو علم المعیشت کا جاننا ہم پر لازم ہے تاکہ ہم زندگی کے جدید ناہموار پیچیدہ اور طویل راستوں سے بآسانی گزر کر منزل مقصود تک پہنچ سکیں اور میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مردہ جسم میں معاشیات ہی ایک دن نئی روح پھونکے گا اور مسیحائی کا سہرا اسی کے سر بندھے گا۔

حصۂ دوم
باب ۲

حصۂ دوم

پیدائش دولت

باب دو

پیدائش کا مفہوم

تجزیہ ۔ انسان کے کارنامے ۔ (۲) پیدائش کی ماہیت (۳) پیدائش کا منشا (۴) خلاصہ

انسان کے کارنامے

۱۔ انسان کے کارناموں پر تو نظر ڈالیئے کہ اس نے پہاڑ کاٹے، سمندر پاٹے ریگستان روندے، برفستان کھوندے، جنگل میں منگل منائے، سمندر سے موتی رولے، زمین کے دفینے کھولے، کرۂ ارض کی طنابیں کھینچیں، وقت میں قیامت کی وسعت پیدا کی، اور آگ پانی کے عمل سے تمام دنیا کو مسخر کر ڈالا۔ چیزیں اتنی بنائیں کہ ان کا حد نہ حساب۔ اور ہر ایک ایسی انوکھی کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے اور ابھی نچنت ہو کر بیٹھنے کا نام نہیں لیتا بلکہ جس قدر اس کی استطاعت بڑھتی ہے ہوس بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اگر یہی لیل و نہار ہیں تو خدا جانے یہ سیلاب ترقی دنیا کو بہا کر کدھر لے جائے اور کیا انجام دکھائے۔ غرضکہ تمام عالمگیر تلاطم اور انقلابات کے باعث یہی چھوٹے سے حضرت انسان ہیں کہ جو جسامت جرأت، طاقت، تیز رفتاری، دور بینی اور دیگر صفات جسمانی میں حیوانوں سے کہیں

حصہ دوم
باب ۲

پھسڈی۔ اپنی بقا اور پرورش کے واسطے بیرونی امداد کے سب سے زیادہ محتاج لیکن خدا نے ان کو عقل کا ایسا اسم اعظم عطا کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے دو ہاتھ ایسے زبردست آلے دیئے ہیں کہ ساری دنیا قدموں سے لگی پڑی ہے۔

پیدائش کی ماہیت

۲۔ جس انسان نے تمام عالم کو تہ و بالا کر دیا ہو اس کی قدرت کا کیا ٹھکانا ہوگا اور کون چیز پیدا کرنے پر وہ قادر نہ ہوگا۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ اگر سچ پوچھو تو اُس کو پیدائش میں برائے نام بھی دخل نہیں۔ وہ نہ ایک ذرہ پیدا کر سکتا ہے نہ ناپید۔ یہ قدرت تو اُس خالقِ اکبر نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے کہ جس نے ایک لفظ ”کُن“ سے سارا جہان موجود کیا اور اک اشارہ سے معدوم کر دے گا۔ انسان البتہ خدا کی بنائی چیزوں سے بچوں کی طرح کھیل خوب رہا ہے۔ دنیا گویا ایک سیر بین ہے کہ جس میں رنگ برنگ کے شیشے ہلانے جُلانے سے اپنی ترتیب بدل بدل کر نت نئے بیل پھول اور عجیب و غریب نقش و نگار دکھاتے ہیں۔ نادان انسان اتراتا ہے کہ وہی تماشہ گر ہے۔ چنانچہ انسان کی تمام کارگزاریوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ یا تو وہ موجودہ چیزوں کا صرف مقام بدل دیتا ہے۔ مثلاً موتی اور معدنیات نکالنا۔ یا موجودہ اشیا کے اجزا کو نئی ترکیب دے دیتا ہے مثلاً لکڑی، لوہا، بیدا اور وارنش سے کرسی بنانا۔ اور یا عاملین قدرت کی وساطت کلی سے صورت بھی بدل دیتا ہے، مثلاً زراعت۔ کسان کا کام صرف اتنا ہی کہ بوقت معین اور بطریق مخصوص زمین، کھاد، تخم اور پانی یک جا کر دے، پودے اگانا، پھول کھلانا، پھل لگانا اور اُن کو پکانا، یہ سب کام عاملین قدرت مثل گرمی، سردی، ہوا اور روشنی کے متعلق ہیں۔ غریب کسان کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ وہ تو کھیتی بو کر بزبان حال قدرت سے کہہ دیتا ہی مصرع سپردم بتو مایۂ خویش را۔ کبھی ابر رحمت اور موسم موافق کی دعائیں مانگتا ہے۔ کبھی آفات سماوی سے پناہ چاہتا ہے۔ اکثر کھیت سے گونیں بھر بھر غلہ اٹھاتا ہی۔

حصہ دوم
باب ۲

اور کبھی ساری لاگت خاک میں ملا کر دست حسرت ملتا رہ جاتا ہے۔ عمل پیدائش میں کسان کی بے بسی بھی کس قدر قابل رحم اور عبرت آموز ہے۔ حالانکہ پیدائش کا سب سے اہم صیغہ اسی کے متعلق ہے۔ اور چونکہ ایک دانہ غلہ سے بہت سے دانے نکلتے ہیں اور چھوٹے سے تخم سے اونچے اونچے دیرپا اور بار آور درخت پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم نے کہ عاملین قدرت اُن کو ظہور میں لاتے ہیں لیکن کیا وہ ان کو نیست سے ہست کرتے ہیں؟ اُن کی تخلیق پر قادر ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں یہ قدرت تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ بلکہ حسب قوانین قدرت صرف مادہ کی صورت بدل کر نمودار کر دیتے ہیں۔ یہ پھل پھول سے لدے پھندے پودے اور درخت کیا ہیں؟ مادہ کے بیشمار اجزا عاملین قدرت کی مدد سے بطریق نامعلوم ہزار ہا رنگ روپ بدل کر پردۂ زمین سے نکلتے ہیں کہ گویا آسمان سے اترے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ پیدائش سے مراد تخلیق نہیں بلکہ چند خاص قسم کی تبدیلیاں ہیں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔

پیدائش کا منشا

۳۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیدائش کی غرض وغایت کیا ہے۔ اس کا جواب ہے افادہ حاصل کرنا یا بڑھانا۔ مقدمہ میں بیان ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں کم وبیش افادہ ضرور موجود ہے۔ لیکن ہم یا تو اس سے سراسر بے خبر ہیں۔ یا باوجود واقفیت بوجہ عدم دسترس اس سے مستفید نہیں ہو سکتے یا اگر ہوں بھی تو کمتر ہر ایک چیز سے پورا پورا افادہ حاصل کرنا اور موجودہ محرومی کے اسباب رفع کرنا پیدائش کی اصلی غرض اور منشا ہوتی ہے۔ صرف چند سال سے ہم نے گلی کوچوں کی خاک سے المونیم کے برتن بنانے سیکھے ہیں۔ موتیوں اور قیمتی دھاتوں کی قدر وقیمت سے تو واقف تھے۔ مگر سمندر اور کانوں کی تہ سے ان کا نکالنا بیحد مشکل تھا۔ جو سن آج ریشم کو بھی ماند کر رہا ہے، مدتوں ہم اس سے صرف رسی ڈور بٹا کئے۔ اور ظاہر ہے کہ افادہ پہلے ہی سے ہر چیز کی ذات میں مضمر ہوتا ہے۔

حصۂ دوم
باب ۲

کچھ پیدائش اس کو عدم سے وجود میں نہیں لائی۔ البتہ انسان کا قابو اور دسترس افادہ میں ضرور بڑھا دیتی ہو اور بس۔

خلاصہ

۴۔ بالفاظ مختصر علم المعیشت میں **پیدائش** سے یا تو **نقل مقام، تبدل ترکیب** اور **تغیر صورت** مراد ہوتی ہے یا ان افعال میں سے کسی دو یا تین کا **اجماع۔ پیدائش** کا منشا افادہ نکالنا یا بڑھانا ہوتا ہے۔ چیزیں اور اس میں خواص پیدا کرنا اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ محض جوڑ توڑ اور الٹ پھیر کی نام نہاد قدرت سے جب حضرت انسان نے یہ گل کھلا رکھے ہیں تو اختیار پانے پر کیا کچھ نہ کر گذرتے۔

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

حصہ دوم
باب ۳

باب تین

عاملین پیدائش

تجزیہ۔ (۱) زمین (۲) محنت (۳) اصل (۴) اصل کی سرگزشت
(۵) اصل کی کارگزاری (۶) خلاصہ

زمین
۱۔ پیدائش کا مفہوم تو بیان ہو چکا۔ اب دیکھیں کہ کون خاص خاص وسائل پیدائش کے واسطے لابد ہیں۔ کن عاملین کی کارگزاری پر پیدائش کا دارمدار رہے اور اُن میں ہر ایک اپنے اپنے طور پر کہاں تک اس کام میں حصہ لے رہا ہے۔ سب سے اوّل تو زمین ہے کہ وہ ہر ایک چیز کا مبدا اور منبع ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو خلقت کہاں رہے اور نباتات وجمادات کہاں سے آئیں۔ کیا ہوا پر دنیا بسے اور بے شمار ضروریات من وسلویٰ کی طرح آسمان سے اُتریں۔ غرض کہ اگر زمین نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ دنیا اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔ پس عاملین پیدائش میں اس پر کسی کو سبقت حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ صرف لابدا ور ناگزیر ہے بلکہ جتنی ضروریات زندگی ہیں شاید ہی کوئی ایسی ہو کہ اس کی پیدائش میں زمین مدد نہ دیتی ہو۔ ہماری خوراک، ہمارا لباس، ہمارے مکانات اور موجودہ زمانہ کے لاتعداد تعیشات، اگر اُن کی اصلیت پر غور کرو اور

حصۂ دوم
باب ۳
محنت

اُن کی ابتدا کا سراغ لگاؤ تو وہ یقیناً زمین پر ہی ختم ہوگا۔

۲۔ زمین مواد ضرور مہیا کر دیتی ہے۔ لیکن اس کو دولت بنانا انسان کا کام ہے زمین کی پیداوار بغیر انسان کی محنت کے دولت نہیں بن سکتی۔ جیسا کہ مقدمہ میں واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ اگر سونے کے پہاڑ اور جواہرات کے انبار ہوں۔ لیکن انسان کے ہاتھ نہ آسکیں تو یقیناً مٹی اور کنکر سے بھی زیادہ نکمے ہیں۔ کوئی ان کو دولت نہیں شمار کر سکتا ورنہ یہ بے شمار جگمگاتے ستارے جن میں خدا جانے کیسے کیسے عجائبات بھرے پڑے ہیں سب ہی ہماری دولت ہیں۔ اور شاید ہی کوئی چیز احاطۂ دولت سے خارج ہو سکے لیکن اس بات سے کوئی بھی ایک لمحہ کے واسطے متفق نہیں ہو سکتا۔ دولت کے واسطے افادہ اور استبدال لازمی ہیں اور مقدمہ کی مفصل بحث سے ظاہر ہوگا کہ ان کے واسطے انسانی دسترس لابد ہے۔ جو چیز انسان کے کام نہ آسکے اس کے افادہ کے کیا معنی اور جو انسان کی دسترس سے باہر ہو اس میں استبدال کیونکر ممکن ہے۔ وہی خودرو جنگل جن میں وحشی قومیں نہایت قابل رحم افلاس کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ جب مہذب قوموں کے ہاتھ آجاتے ہیں تو محنت کے ذریعہ سے اتنی پیداوار اگلتے ہیں کہ دنیا مالامال ہو جاتی ہے؟ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بہ حیثیت دولت وہ جنگل دونوں حالت میں یکساں ہے۔ اگر فرق ہے اور یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے، تو اس کا باعث کیا۔ یہی محنت۔ ورنہ وہی جنگل، اسی کی پیداوار۔ نہ جنگل بدلا، نہ پیداوار آسمان سے برسی۔ البتہ جب سے محنت کا دخل ہوا، اس جنگل کو کچھ ایسا پارس پتھر چھوا کہ سونا ہی سونا ہو گیا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ دولت کی پیدائش کے واسطے زمین اور محنت دونوں لابد ہیں۔ اور یہ طے کرنا کہ ان میں سے کون زیادہ ضروری ہے اور کون کم۔

بعینہ ایسا سوال ہے کہ اولاد کی پیدائش میں زیادہ حصہ کس کا ہوتا ہے۔ ماں کا یا باپ کا۔ بھاپ زیادہ تر پانی سے پیدا ہوتی ہے یا آگ سے۔ قینچی کا اوپر والا پھلر کپڑا کترتا ہے یا نیچے والا۔ اور ان سوالات کا صحیح جواب صرف ایک ہی، کہ دونوں یکساں لابد اور ناگزیر ہیں اور بس۔

اصل

۳۳۔ ایک لطیفہ سنیئے کہ زمین اور محنت کے عقد سے ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو ایسا بلند اقبال نکلا کہ آج چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ امیر غریب سب اس کے دست نگر ہیں۔ جدھر گزرتا ہے خلقت نہال ہو جاتی ہے۔ پیدایش کے میدان میں وہ کمال دکھا رہا ہے کہ والدین بھی اس کے توسل کے طالب نظر آتے ہیں۔ اس کی دستگیری سے ان میں بے حد چستی اور طاقت آتی ہے۔ اس کے تقرب سے ان کی بہت کچھ قدر و پرسش کی جاتی ہے۔ اگر ساتھ چھوٹ جاوے تو کس مپرسی میں والدین کو ہاتھ پیر ہلانا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ محض اشتیاق بڑھانے کی غرض سے تعارف میں نام ظاہر نہیں کیا۔ صاحب موصوف دراصل حضرت اصل ہیں۔ دوراندیش مغربی قوموں نے بے حد خاطر و مدارات کر کے ان کو اپنی طرف اس قدر مائل کر لیا ہے کہ اب وہ زیادہ تر انھی کے پاس مقیم رہتے ہیں اور اپنے کمالات سے ان کو فیض پہنچا پہنچا کر دنیا کی باقی اقوام سے بدرجہا معزز اور ممتاز بنا رہے ہیں۔ صاحب موصوف کی ولادت اور پرورش کا تھوڑا سا حال بیان کر کے ہم اُن کی کارگزاریوں کی ضروری تشریح کریں گے۔

اصل کی سرگزشت

۳۴۔ کسی زمانہ میں انسان خودرو درختوں کے پھلوں سے اپنا پیٹ پالتا اور پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتا ہوگا۔ زمین اور محنت کی ملاقات کا یہ سب سے پہلا موقع ہوگا۔ اوّل اوّل وہ صرف ہاتھ سے کام لیتا ہوگا۔ بلند درختوں کے پھل اور

حصہ دوم
باب ۳

پتے توڑنے میں دقت پیش آتی ہوگی۔ بالآخر فرصت کے وقت فراغت سے بیٹھ کر تدبیر سوچتے اس نے کسی سیدھی لمبی اور ہلکی لکڑی کے سرے پر چھوٹی سی بالشت بھر لکڑی گھاس سے ترچھی باندھ کر ڈنگی بنالی ہوگی کہ جس درخت سے چاہے پھل گرالے۔ یہی ڈونگی غالباً اصل کی ابتدا ہوگی۔ جب پھل توڑنے میں آسانی ہوگئی تو اس کے پاس فرصت کا وقت زیادہ نکل آیا۔ اور اس نے جال، تیر کمان اور سخت پتھروں کے دھاردار آلے بنا کر چھوٹے موٹے چرند و پرند کا شکار شروع کردیا۔ ان ایجادات کا بھی اصل میں اضافہ ہوا۔ اب روز غذا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ ایک دن شکار اور پھل جمع کرکے کئی دن کام چلاتا ہوگا۔ فرصت کے دنوں میں لاکھ تدبیریں کرکے اُس نے رفتہ رفتہ چند تربیت پذیر وحشی جانوروں۔ مثلاً گائے بھینس، گھوڑے بکری کو پکڑ پکڑ کر پالتو بنایا ہوگا۔ ان کا دودھ پیتا اور گوشت کھاتا ہوگا ان پر سوار ہوکر جنگل جنگل گھومتا ہوگا۔ اور اُن کی کھال کا لباس بناتا ہوگا۔ بالآخر خانہ بدوشی سے تنگ آکر کوئی اچھا سا سرسبز اور زرخیز قطعہ پاکر وہیں رہ پڑا ہوگا۔ ہل بنا، گھوڑے، بیل کی مدد سے زمین جوت کھیتی شروع کردی رہنے سہنے، پیداوار رکھنے اور بیل ڈھور باندھنے کے لئے کچھ کچے جھونپڑے بنالئے۔ گویا کسان نے گاؤں بسانا شروع کیا۔ پالتو جانور اور آلات کاشتکاری بھی اصل میں داخل ہوئے۔ کھانا، لباس، مکان، بیل، ڈھور کھیتی کا سامان۔ اب ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کا مہیا کرنا ایک آدمی کے قابو سے باہر ہوگیا۔ لہٰذا تقسیم عمل کے زرّیں اصول پر کاربند ہونا پڑا۔ کسان، گھسیارے، جولاہے، بڑھئی، لوہار، حجام اور موچی غرض کہ چند فرقے پیدا

ہو گئے اور معاشی ترقی آجکل کے پس ماندہ گاؤں کی حالت تک آپہنچی۔ ہر پیشہ کے آلات اور اوزار اصل میں اضافہ ہوئے۔ کسان کا اصل ہل، بیل، لوہار کا ہتوڑا اور دھونکنی، بڑھئی کا آرہ، بسولہ، جولاہے کا چرخہ اور کرگہ، گھسیارے کا جالی کھرپا اور حجام کا اُسترہ قینچی اور موچی کی رانپی سوتاری وہی اصل جو اول بہ شکل ڈنگی نمودار ہوا ہوگا اب کتنی مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ لیکن کام سب کا ایک ہی یعنی دولت کی پیدائش میں ہاتھ بٹانا۔ یہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ زمین اور محنت ہی نے مل کر اور فرصت کا وقت نکال کر اس کو پیدا کیا۔ اب خدا کی رحمت دیکھئے کہ اصل کی نسل مچھلی سے زیادہ بڑھی اور سرگ بیل سے زیادہ پھیلی۔ آج نہ اس کی قسموں کا شمار نہ اس کے تصرف سے کوئی پیشہ آزاد۔ درزی کی سوئی اور حجام کے اُسترے سے یورپ کے بے انتہا قیمتی انجنوں، مشینوں اور آلات تک اصل ہی کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ مثل آدمیوں کے اتنا فرق ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی قوی ہے کوئی ضعیف۔ کوئی معزز کوئی حقیر۔ لیکن ہیں سب ایک ہی نسل سے اور ہر ایک اصل کے لقب کا پورا پورا مستحق ہے۔ یہ تو اصل کی خاندانی سرگزشت تھی۔ اب اس کی کارگزاریوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔

اصل کی کارگزاری

۵۔ اگر مغرب و مشرق کی معاشی حالت کا موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک جوان رعنا ہے تو دوسرا پیر فرتوت ایک دریائے مواج ہے تو دوسرا چشمۂ تنک آب۔ ایک مالا مال ہے تو دوسرا خستہ حال۔ آخر اس قدر فرق کی وجہ؟ ایشیا کی زمین بحیثیت مجموعی یورپ کی زمین سے زیادہ زرخیز۔ یہاں کی آب و ہوا پیداوار زرعی کے واسطے زیادہ

موزوں۔ یہاں کے باشندے کم خرچ اور بیشتر محنتی اور جفاکش اور اس پر نتیجہ یہ کہ ایشیا یورپ کا محتاج، دست نگر، خوشہ چیں۔ اس معمے کا راز صرف یہی اصل ہے۔ ایشیا کے پاس دو عامل زمین اور محنت بدرجہ اولیٰ موجود مگر ایک اصل کے نہونے سے بےبس اور لاچار۔ یورپ کی معاملہ فہم دُور اندیش اور باریک بیں قوموں نے اصل کی قوت کا صحیح اندازہ کر کے اپنی تمامتر توجہ اس کے غور و پرداخت اور ترقی پر صرف کر کے آج وہ اقتدار پایا ہی کہ گھر بیٹھے دنیا کی دولت پر حکومت کرتے ہیں اور خلقت پر احسان دھرتے ہیں۔ لکڑی، لوہا، کوئلہ، پانی، زمین، سواری اور کارکنوں کی بڑی جماعت سب ہندوستانی لیکن ریل کے منافع کا مالک انگلستان۔ اور اس پر بھی ہم شاد و فرحاں، متشکر و ممنون۔ ریل کی تعریف میں رطب اللسان۔ اور کچھ بیجا بھی نہیں۔ کیونکہ یہاں اصل ملتا تو معلوم۔ اگر انگریزی اصل سے بھی ریلیں نہ بنتیں تو جو کچھ تھوڑا بہت آرام اور فائدہ پہنچ رہا ہے۔ جس کی ہم مناسب موقع پر تشریح کریں گے۔ ہندوستان اس سے بھی محروم رہتا۔ معاشی جدوجہد میں ایک عام اصول سا قرار پا گیا ہے کہ پیداوار خام ایشیا کی اور مصنوعات یورپ کے۔ حاصل کلام یہ ہی کہ اگر ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی پس ماندگی کی حقیقی وجہ دریافت کرو گے تو وہ نہ زمین کی کمی ہو گی۔ نہ محنت کی قلت۔ بلکہ کارآمد اور کافی اصل کی احتیاج ہو گی جس نے کمر ہمت توڑ دی اور دل کو بیشمار اُمنگوں کا مدفن بنا رکھا ہی ؎

آنکہ شیر اں را کند روبہ مزاج — احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

اور پھر احتیاج بھی کس کی۔ اصل جیسی لازمی چیز کی۔ معاذ اللہ۔ کیسی نامور قومیں آج اسی

احتیاج کی بدولت مفلس، پس ماندہ اور نیم مہذب کے خطابات پا رہی ہیں۔

۶۔ اصل کی احتیاج خود ہندوستان کہاں تک اور کیونکر پوری کر سکتا ہے اور اصل کی قلت کا وہ کس حد تک خود ذمہ دار ہے۔ یہ طویل بحث یہاں پر بے محل ہے۔ البتہ ایک جداگانہ کتاب معاشیات الہند کے واسطے بہت موزوں ہوگی یہاں حالات بیان کرنے سے یہ جتانا مقصود تھا کہ عمل پیدائش دولت میں ہر سہ عاملین کا کیا کیا حصہ ہے اور مقابلۃً ہر ایک کا کیا رتبہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پیدائش دولت کے واسطے زمین لابد، محنت شرط لازمی اور اصل سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے اور یہی تینوں مل جل کر دنیا میں دولت پیدا کر رہے ہیں۔ اب ہم چوتھے پانچویں اور چھٹے باب میں علی الترتیب زمین، محنت اور اصل کے حالات سے جداگانہ مفصل بحث کریں گے۔

خلاصہ

حصہ دوم
باب ۴

باب چار

زمین

تجزیہ - (۱) زمین کا مفہوم (۲) زمین کے خواص (۳) کاشت کے دو طریق اور اُن کے جُداگانہ فوائد (۴) زرخیزی کا مفہوم (۵) زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل (۶) گورنمنٹ ہند کا محکمۂ زراعت (۷) قانون تقلیل حاصل (۸) معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۹) شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۱۰) شہروں میں پارک کی ضرورت (۱۱) ٹریم کار کا شہر کی آبادی اور زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۱۲) اضافہ قیمت زمین کے حق دار

زمین کا مفہوم

۱۔ معاشیات میں لفظ زمین سے عموماً تو یہی زمین مُراد ہوتی ہے مگر اصطلاحاً اس میں چند دیگر عاملین قدرت مثل پانی، ہوا، گرمی، روشنی کے جو وجود خلقت اور پیدایش دولت کے واسطے لازمی ہیں شامل کر لیے جاتے ہیں۔ مثلاً دریا کھیتی باڑی کو شاداب کرتے ہیں۔ کشتیوں میں مال ڈھوتے ہیں۔ پن چکیاں چلاتے ہیں۔ سمندر جہاز تیراتے ہیں۔ آبشار بجلی پیدا کرتے ہیں۔ ہوا بھی علاوہ شرط زندگی ہونے کے بادبان سے کشتی کھیتی ہے۔ پنکھا گھا کر مشینیں چلاتی ہے۔ ہندوستانی کسان کا غلہ برساتی ہے۔ گرمی اور روشنی کی ضرورت بھی اظہر من الشمس ہے۔ پس ایسی چیزوں کو عاملین پیدایش

میں شامل نہ کرنا کس طرح ممکن ہے۔ اور ہر ایک کو جداگانہ شمار کرنا بھی نامناسب طوالت معلوم ہوتی ہے۔ ان کو محنت تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ وہ انسان کے کام سے مخصوص ہے اصل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ محنت اور زمین کے اتفاق عمل سے پیدا ہوا ہے۔ اور انسان کی مرضی کا مطیع ہوتا ہے۔ اور ان چیزوں کو پیدا کرنا تو درکنار قابو میں لانا بھی محال ہے۔ جب آندھی چلتی ہے، طوفان آتا ہے، گرمی پڑتی ہے، تو انسان کو فوراً اپنی بے بسی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور سوائے دعا کے اس سے کچھ نہیں بن پڑتا۔ البتہ لفظ زمین میں ان کو اصطلاحاً شامل کرنا کچھ نامناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اوّل تو یہ سب زمین سے قریب تر متعلق ہیں اور طریق عمل میں بھی زمین سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ ان سب کے اعمال براہ راست قدرت کے اٹل قوانین کے تابع ہیں اور محنت و اصل کی مانند ان پر انسان کو تصرف حاصل نہیں بعض مصنفین نے زمین کی بجائے لفظ **قدرت** ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور بلحاظ جامعیت یہ اصطلاح زمین سے بہتر ہے۔ مگر چونکہ ان تمام عاملین قدرت میں سب سے کثیر اور اہم کام زمین کا ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے زمین عاملین پیدایش میں جداگانہ شمار کی جاتی ہے۔ ایک نیا لفظ داخل کرنے کے بجائے زمین ہی میں اُن چیزوں کو شمار کر کے اصطلاحی معنے مع وجوہات واضح کر دینا زیادہ قرین اُصول معلوم ہوتا ہے اور اب زمین کے مذکورہ بالا اصطلاحی معنے علم المعیشت میں بالعموم تسلیم کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ (ا)، ہم عاملین پیدایش کے بیان میں بتا چکے ہیں کہ زمین وجود خلقت اور پیدایش دولت کے واسطے لابد ہے۔ اب یہاں چند دیگر خواص اور ان کے معاشی اثرات واضح کرنا چاہتے ہیں۔ زمین کے خواص

(ب)، زمین کی دوسری قابل توجہ خصوصیت تعیّن مقدار ہے۔ خدا نے جتنا کرۂ ارض بنانا چاہا بنا دیا۔ کچھ سمندروں سے ڈھک دیا۔ کچھ پہاڑوں سے گھیر دیا کچھ ناقابل

آبادی برفستان اور ریگستان بنا دیا۔ اور باقی ہموار میدانوں میں دریا بہائے بارآور درخت اُگائے اور موسم خوشگوار بنائے تاکہ انسان وہاں بود و باش اختیار کر سکے۔ یہ تو ممکن ہی کہ کوئی سمندر ساحل سے ہٹ کر زمین چھوڑ دے جنگل میں اور پہاڑوں پر آدمی جا بسیں۔ امریکہ کی طرح اب بھی کسی نامعلوم برِاعظم کا پتہ لگ جائے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی ایک زمین کے اجزا کا تغیر و تبدل ہوگا۔ خود زمین کی وسعت میں ایک انچ اضافہ ممکن نہیں۔ عام قاعدہ ہی کہ جس چیز کی مانگ بڑھتی ہی۔ اس کی پیداوار بھی بڑھائی جاتی ہی۔ جب سے روئی ولایت جانے لگی۔ ہندوستان میں اس کی کاشت بہت وسیع ہوگئی اور مصر میں بھی یہی حال ہی جب سے افیون چین جانی شروع ہوئی اس کی کاشت بھی بہت رواج پاگئی۔ یہی حال مصنوعات کا ہی۔ گھڑیاں، بائیکل، اسٹیل ٹرنک، گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر زمین کا معاملہ بالکل برعکس ہی۔ اس کی ضرورت اوّل تو لابد۔ دوسرے بوجہ ترقی آبادی روزافزوں اور اس پر لطف یہ کہ مقدار معین۔ اس کا اضافہ ناممکن۔ نتیجہ ظاہر کہ زمین روز بروز نایاب اور بیش قیمت ہوتی جاتی ہی۔

(ج)، زمین کی تیسری خصوصیت یہ ہی کہ وہ غیر منقولہ ہی۔ عام قاعدہ ہی کہ جہاں مانگ زیادہ ہوتی ہی اور قیمت اچھی اُٹھتی ہی۔ وہیں چیز لے جا کر فروخت کرتے ہیں چنانچہ تمام تجارت داخلہ اور خارجہ اسی اصول کی تشریح ہی۔ اگر اصول یہ نہوتا تو جو چیز جہاں پیدا ہوتی بس وہیں بکتی۔ حلقہ تجارت ہر ایک بستی تک محدود ہوتا حالانکہ آج کل گوشت پھل اور ترکاریاں جیسی جلد خراب ہو جانے والی چیزیں بھی ہزارہا میل جا کر فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان کو گوشت اور مچھلی زیادہ تر آسٹریلیا مہیا کرتا ہی۔ صدہا من پھل اور میوے مثل آم و سیب ہندوستان سے جاتے ہیں اور دیرپا چیزوں مثل غلہ اور معدنیات کی دُوررسی کا تو کیا ذکر ہے۔ لیکن زمین اٹل ہی۔ گاؤں

والے زیادہ قیمت کی ہوس میں غلہ اور ترکاریاں تو شہر لا کر بیچتے ہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو صدہا بیگہ ناکارہ بنجر زمین اُٹھا کر شہر لے آتے اور بے شمار دولت رولتے۔ گاؤں میں زمین کی کمی نہیں اور گنجان شہروں میں بیحد نایاب ہوتی ہے۔ لیکن جو قطعہ زمین جہاں ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک قصبات میں عموماً زمین روپیہ گز ملتی ہے اور ہندوستان ہی کے بعض شہروں میں چار سو روپیہ گز تک فروخت ہو چکی ہے۔ ایک دو آنہ روپیہ کے نفع پر ہندوستان کا غلہ اور روئی ولایت پہنچتی ہے۔ لیکن صدہا روپیہ گز کے منافع پر قرب و جوار سے زمین نہیں لائی جا سکتی۔ تیسری خصوصیت غیر منقولیت بھی زمین کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے۔

(د) چوتھی خصوصیت **تعین پیداوار** ہے۔ سکونت سے زیادہ پیدائش ضروریات ناگزیر مثلاً خوراک و لباس کے واسطے زمین درکار ہے۔ غلہ پھل اور ترکاریاں جو انسان و حیوان کی غذا ہیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایندھن اور عمارت کی لکڑی اس سے اُگتی ہے۔ لباس کی اکثر اشیا زمین سے ملتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ زمین کی قوت پیدائش محدود رکھی گئی ہے۔ ایک قطعہ زمین مقدار معین سے زیادہ غلہ یا ترکاری پیدا نہیں کر سکتا۔ ہر ایک کسان اس کی تصدیق کرے گا۔ قانون تقلیل حاصل کے تحت میں اس خصوصیت کی مزید تشریح کریں گے (دیکھو)۔ لیکن اس کا اثر زمین کی قدر و قیمت پر جو پڑتا ہے ظاہر ہے۔

(ر) **پابندی وقت** زمین کے عمل پیدائش پر وقت کی پابندی بھی لازم کی گئی ہے کہ ہر چیز اپنے ہی فصل و موسم میں پیدا ہو سکے۔ مثلاً جوار، باجرا، اور مکا فصل خریف میں گیہوں جو اور چنا فصل ربیع میں۔ اس کے خلاف ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں ہر چیز کی پیدائش کے واسطے جتنا وقت درکار ہے وہ بھی معین ہے۔ اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں۔ فصل خریف دو مہینے میں تیار ہوتی ہے۔ ربیع چھ مہینے میں۔ نیشکر تمباکو آلو اور

کپاس نو نو مہینے میں۔ انسان بے وقت محنت کر کے اصل سے شب و روز کام لے کر پیداوار بڑھا سکتا ہے۔ مگر زمین پر اس کا کچھ بس نہیں چلتا۔ وہ تو قدرت کے پروگرام کی پابند ہے۔ اگر سائنس کے جدید انکشافات سے پیدائش زمین کے اوقات میں کچھ ردّ و بدل ہوتا بھی ہے تو اتنا قلیل کہ قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

(س) علاوہ مذکورۂ بالا ایک سے ایک سخت پابندیوں کے جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں خود عمل پیدائش میں انسان کا حصہ نقل مقام و تبدیل ترکیب پر ختم ہو جاتا ہے۔ کھیت جوتنا کسان کا کام ہے۔ لیکن کھیت پروان چڑھانا عاملین قدرت کے ہاتھ ہے۔ کسان لاچار محض ہے۔ پس بلحاظ عمل پیدائش بھی زمین انسان کے تصرف سے بہت کچھ آزاد ہے۔ حالانکہ اس کی پیداوار سب سے زیادہ ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زمین پر قدرت نے عجیب و غریب پابندیاں عاید کر کے انسان کے اختیار اور قابو سے اس کو بالکل باہر کر دیا ہے۔ اوّل تو اس کو لابد قرار دیا پھر اس کی ضرورت روز افزوں بنا کر اس کی مقدار محدود کر دی۔ اس کو غیر منقولہ بنایا۔ اس کی قوت پیدائش کو محدود کیا۔ اس پر پابندی وقت کی سخت قید لگائی اور عمل پیدائش کا بیشتر حصہ عاملین قدرت کی تصرف میں دے کر انسان کو بے بس اور لاچار کر دیا۔ ان خصوصیات کی اصلی مصلحت تو خدا جانے۔ لیکن ایک بیّن نتیجہ جو ان سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ زمین کی قدر و قیمت دن دونی رات چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے اور علم معاشیات میں ایک اہم ترین حل طلب مسئلہ یہ پیش ہو رہا ہے کہ اس اضافہ قیمت کا حقدار کون ہے مالک زمین یا گورنمنٹ۔ اور اگر دونوں تو کس اصول کے مطابق کس نسبت سے یہ اضافہ ان میں تقسیم ہونا چاہیے۔ اضافۂ قیمت زمین کا مسئلہ بہت غور طلب ہے اور اس سے جزء بجزء حسب موقع بحث کرنا زیادہ موزوں گا۔

(۳) یوں تو زمین سکونت اور کان کنی کے کام بھی آتی ہے۔ لیکن اس کا سب سے بڑا حصّہ زراعت میں مصروف نظر آتا ہے۔ کاشت کی دو قسمیں ہیں **کاشت عمیق** و **کاشت وسیع**۔ ایک قطعہ زمین خوب جوتے۔ بہت سا کھاد ڈالے جتنا تخم بویا جا سکے بوئے۔ اچھی طرح پانی دے اور کافی محنت واصل اس پر صرف کرکے **بیشترین** مقدار پیداوار حاصل کرے۔ اس کو کاشت عمیق کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کھیت کو کچھ یوں ہی جوت کر اور تھوڑا سا کھاد ڈال کر **کمترین مصارف** سے کچھ پیداوار حاصل کرے تو اس کو کاشت وسیع کہتے ہیں۔ کاشت عمیق میں نسبت مصارف تو زیادہ موافق نہیں ہوتی مگر مقدار پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کاشت وسیع میں اس کے برعکس مقدار پیداوار کم ہوتی ہے مگر نسبت مصارف بہت موافق ہوتی ہے۔ مثلاً اگر دس بیگہ زمین سے بصرف تین روپیہ من پچاس من غلّہ پیدا ہوا اور پندرہ بیگہ زمین سے بصرف دو روپیہ من کل تیس من پیدا ہو تو پہلی کاشت عمیق اور دوسری وسیع کہلائے گی۔

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب پیداوار زمین کی زیادہ مانگ ہو اور قیمت اچھی اٹھتی ہو تو کاشت عمیق سے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے اور بصورت دیگر کاشت وسیع زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر مذکورۂ بالا کھیتوں کی پیداوار پانچ روپیہ من کے نرخ سے فروخت ہو تو پہلے کھیت سے بحساب دو روپیہ من کل سو روپیہ منافع ہوگا اور دوسرے کھیت سے بحساب تین روپیہ من صرف نوّے روپیہ لیکن اگر قیمت گھٹ کر صرف چار روپیہ من رہ جائے تو منافع حسب ترتیب پچاس روپیہ اور ساٹھ روپیہ ہوگا۔ اور قیمت بہت ہی گر جائے گی مثلاً ڈھائی روپیہ من تو حسب ترتیب پچیس روپیہ گھاٹا اور پندرہ روپیہ منافع ہوگا۔ غرض کہ زیادتی قیمت کاشت عمیق کی معاون ہے اور کمی قیمت کاشت وسیع کی۔ ان دونوں نتائج کو جداگانہ حسب ترتیب قیمت کے

اثر موافق و مخالف سے تعبیر کریں گے اور دونوں کا مشترکہ نام صرف اثر قیمت ہوگا۔ چنانچہ ناخواندہ کسان بھی تجربہ کی مدد سے اسی اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ شہر و قصبات کے گرد و نواح میں عموماً کاشت عمیق ہوتی ہے اور دور افتادہ گاؤں میں کاشت وسیع طریق عمل اس اثر کا یہ ہے کہ اگر ہر دو قسم کی کاشت کے اوسط مصارف میں فرق کم ہوگا مثلاً تین روپیہ اور دو روپیہ من اور اوسط پیداوار میں فرق زیادہ ہوگا مثلاً پانچ من اور دو من بیگہ تو اثر موافق بہت قوی ظاہر ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اوسط مصارف میں فرق زیادہ ہو مثلاً چار روپیہ اور دو روپیہ من اور اوسط پیداوار میں کم مثلاً پانچ من اور تین من بیگہ تو اثر موافق ضعیف ہوگا یا اثر مخالف حسب حالت ضعیف یا قوی نمودار ہوگا۔ کسی مقام میں دونوں قسم کی کاشت کے اعداد مصارف و پیداوار دریافت ہونے پر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کونسی کاشت کس حد تک مفید تر ہوگی۔

علاوہ اثر قیمت کے طریق کاشت ایک اور قوی اثر کے بھی تابع ہے۔ ہر ایک کسان کو پیداوار کا کچھ حصّہ زمیندار یا سرکار کو دینا پڑتا ہے۔ ایسے لگان کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں خواہ وہ بشرح منافع ہو یا پیداوار کلی یا وسعت زمین مثلاً پچاس فی صدی منافع یا ۲۰ فی صدی پیداوار یا دو روپیہ بیگہ۔ مذکورۂ بالا "دو کھیتوں کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ شرح منافع کا کوئی اثر، اثر قیمت کے عملدرآمد پر نہیں پڑے گا۔ بشرح ۵۰ فی صدی مثال بالا میں لگان ادا کرنے کے بعد منافع ۵۰ اور ۴۵ روپیہ حسب ترتیب رہ جائے گا گویا حسب سابق کاشت عمیق ہی زیادہ نافع ہوگی اور اسی طرح بحالت کمی قیمت۔ لگان ادا کرنے کے بعد بھی کاشت وسیع مفید رہے گی۔ لیکن لگان بشرح پیداوار کے اثر کا عمل درآمد ذرا پیچیدہ ہے۔ یہ اثر قیمت کے اثر موافق کے مخالف اور قیمت کے اثر مخالف کے موافق کام کرتا ہے۔ گویا کاشت عمیق کا منافی اور کاشت وسیع کا معاون ہے۔

حصہ دوم
باب ۲

اگر لگان بشرح پیداوار کا اثر قیمت کے اثر مخالف سے ملا دیا جائے تو دونوں یکساں اثر مل کر بہت قوی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر قیمت کے اثر موافق سے مقابلہ آپڑے تو جو اثر قوی تر اور غالب ہوگا کاشت کا طریقہ اس کے مطابق ہوگا۔ لگان بشرح وسعت کا اثر بھی بعینہ لگان بشرح پیداوار کا سا ہے پس معلوم ہوا کہ کاشت کے دو طریق ہیں۔ اور قیمت پیداوار و لگان کے مختلف اثرات کے تابع ہیں۔ قانون تقلیل حاصل (۱/۲) لگان کی بحث میں واضح ہوگا کہ منافع زراعت کو ماحصل زائد کہتے ہیں۔

زرخیزی کا مفہوم

۴۔ زرخیزی زمین کی کوئی خاص صفت نہیں۔ بلکہ اس سے زمین کی کئی حالتیں مراد ہو سکتی ہیں۔ اول تو زرخیزی طریق کاشت سے متعلق ہے۔ کاشت عمیق میں وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے جو بلالحاظ لنسبت مصارف بڑی مقدار پیداکرے۔ مثلاً کسی کھیت میں ۴ یا ۵ من بیگہ غلہ پیدا ہو۔ صرف مصارف پیدائش خواہ زیادہ مثلاً ۴ یا ۵ روپیہ من تک ہوں اس کے برعکس کاشت وسیع میں زرخیز زمین سے مراد یہ ہے کہ بلا لحاظ مقدار پیداوار مصارف کا اوسط کمتر ہو۔ مثلاً کسی کھیت میں صرف دو یا تین روپیہ من کے صرفہ سے غلہ پیدا ہو، اوسط پیداوار خواہ ایک یا دو من فی بیگہ ہو۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعض زمینیں تو ان میں سے صرف کسی ایک طریق کاشت میں زرخیز ثابت ہوتی ہیں اور بعض دونوں حالتوں میں زمین کی زرخیزی فصل سے بھی متعلق ہوتی ہیں۔ بعض زمینیں نیشکر کی کاشت کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اور بعض تمباکو، کپاس، سن یا ایسی ہی کسی خاص چیز کے واسطے اگر فصل موزوں کے علاوہ کوئی چیز کاشت کی جائے گی تو نتیجہ حسب دل خواہ نہ ہوگا گویا ایک ہی قطعہ زمین بعض فصل کے لحاظ سے زرخیز ہے اور بعض کے لحاظ سے نہیں پنجاب میں گیہوں عمدہ پیدا ہوتا ہے۔ برار کی روئی نرم اور لمبے ریشہ کی ہوتی ہے

حصہ دوم باب ۲

مشرقی بنگال کا سن جو جوٹ کہلاتا ہے، تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح پھل مثلاً آم، انار، سیب، ناشپاتی وغیرہ کے واسطے بھی خاص خاص مقام مشہور ہیں۔ کبھی بلالحاظ مقدار پیداوار یا اوسط مصارف، یا موزونی فصل، محض پیداوار کی قیمت بہت بڑھ جانے سے زمین زرخیز شمار ہونے لگتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زرخیزی صفت اضافی ہے اور وہ کبھی طریق کاشت کبھی نوعیت فصل اور کبھی اضافہ قیمت سے متعلق ہوتی ہے۔

زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل

۵۔ زرخیزی کی نوعیت سمجھانے کے بعد اب ہم مختصراً وہ وسائل بتانا چاہتے ہیں جو زرخیزی پیدا کرنے اور بڑھانے کے واسطے عموماً اختیار کئے جاتے ہیں اور تجربہ سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔

عمدہ زمین کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ نہ اتنی سخت ہو کہ نازک پودے جڑ نہ پکڑ سکیں اور پانی جذب ہونے کے بجائے سطح پر بہتا ہوا گزر جائے۔ اور نہ اتنی نرم اور بے دم ہو کہ جڑ مضبوط نہ جمے۔ پودے گر گر پڑیں اور نہ پانی رُکے، سب رِس رِس کے نکل جائے۔ بلکہ وہ اتنی تو نرم ہو کہ نازک جڑیں اس میں جگہ کر سکیں مگر اتنی سخت بھی ہو کہ جڑوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ وہ پودے سنبھال سکیں۔ پانی جو زمین سے پودے کو غذا پہنچاتا ہے کھیت میں بآسانی پھیل سکے لیکن پودے کی غذا بہا کر باہر نہ لیجا سکے ورنہ یا تو پودے نہیں جمیں گے یا بعدہٗ خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ کھیت جوتنے کا اصلی مقصد یہی صفت پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سخت سطح اور ڈھیلے ٹوٹ کر حسب ضرورت نرم ہو جائیں۔ ریتیلی زمینیں بھی نئی مٹی ہل کے ذریعہ سے ملا کر سخت کی جاتی ہیں۔

زمین کی دوسری ضروری صفت یہ ہے کہ اس میں وہ تمام اجزا جو پودے کی غذا ہیں پوری مقدار میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے اجزا کی مقدار کم ہوگی یا ایک جزو بھی

غائب ہوگا تو پودوں کی نشو ونما پر مضر اثر پڑے گا اور پیداوار علاوہ مقدار میں کم ہونے کے ادنیٰ قسم کی ہوگی۔ کھاد کے ذریعہ سے زمین میں پودوں کی غذا بڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں تو ناداں کسان تھوڑے بہت تجربہ کے بھروسہ پر جیسا کھاد میسر آتا ہے کوڑی سے اُٹھا کر کھیت میں ڈال دیتا ہے۔ مگر یورپ والوں نے اس میں بھی بہت تحقیق سے کام لیا ہے۔ اول ہر قسم کے پودوں کی غذا کے اجزا دریافت کیے۔ مثلاً آلو کے پودے کی نشو ونما کن کن چیزوں سے ہوتی ہے اور نسبتاً وہ کن کن مقدار میں درکار ہیں۔ غرضکہ بہت سے مروّجہ پودوں کی خوراک کے اجزا اور ان کی ترکیب سائنس اور مشاہدات کی مدد سے دریافت کرلی گئی ہے۔ اور کیمیائی طریق سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین میں کیا کیا اجزا کس مقدار میں موجود ہیں۔ چنانچہ جرمنی وغیرہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں کسان اپنے کھیت کی تھوڑی سی مٹی کسی کھاد کے کارخانہ میں بھیجدیتا ہے اور جو چیز بونی مقصود ہوتی ہے اس سے اطلاع دیتا ہے۔ کارخانے میں زمین کے موجودہ اجزا اور پودے کی غذا کو پیش نظر رکھ کر کوئی مناسب کھاد اسی طرح تجویز کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں مریض یا کمزور کے واسطے ڈاکٹر دوا یا غذا تجویز کرتے ہیں۔ کارخانہ میں ہر قسم کی کھاد بھی تیار رہتی ہے اور فرمائش آنے پر باحتیاط بکسوں میں بند کرکے روانہ کردی جاتی ہے۔ چنانچہ دواسازی کے ساتھ کھادسازی بھی یورپ میں ایک فن ہوگیا ہے اور اس کے باقاعدہ کارخانے قائم ہیں۔ کبھی کبھی دو مختلف الخواص مٹیوں کے ملانے سے بھی کھاد کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر دو زمینوں میں سے ہر ایک میں انھیں اجزا کی بہت کثرت ہو جن کی دوسری میں قلت ہے۔ تو ان کی مٹی ملانے سے زمین زرخیز بن جائے گی۔ چنانچہ چونا، کھریا، چکنی مٹی، کوئلہ کا چورا زمین میں ملانے سے اکثر زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ مختلف الخواص مٹی ملانے کا

حصہ دوم باب ۲ طریقہ کھاد سے بھی زیادہ مروج ہوگا۔

معلوم ہوا کہ انسان زمین کی زرخیزی بڑھا کر اور نیز نگہداشت کر کے نباتات کو بیش بہا مدد پہنچا سکتا ہے۔ لیکن اس کے مدارج مختلف ہیں۔ نازک بیل اور پودے بحالت کس مپرسی اپنا وجود بھی بمشکل قایم رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانی امداد سے حیرت انگیز ترقی کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ نباتی باغات اور نمائش گاہوں میں اتنے خوش رنگ لذیذ اور بڑے بڑے پھل پھول اور ترکاریاں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ان کی شناخت میں دھوکا ہوتا ہے۔ غلے، ایکھ، کپاس اور دیگر مزروعہ چیزوں کے پودے بھی انسان کی مدد کے خواستگار ہیں۔ یہ چیزیں خود رو بھی پائی گئی ہیں۔ مگر اس قدر ادنی قسم کی کہ ان کو اپنے مزروعہ ہمجنسوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ مستقل چراگاہیں بھی بقدر نگہداشت انسانی توجہ کی مستحق ہیں مگر جنگلات کے درخت انسانی امداد سے بالکل مستغنی ہیں۔ وہاں بقائے اصلح کا قانون جاری ہے اور ہر ایک درخت اور پودا اپنا خود نگہبان ہے۔ اور اگر انسان چاہے بھی تو بھلا جنگل کے ان بلند اور گنجان درختوں کی نشو و نما میں کیا قابل لحاظ اضافہ کر سکتا ہے جن کی زور دار جڑیں تھر تھیر کر پانی کے سوت سے طراوت اور ارد گرد کی صدہا گز وسیع زمین سے خوراک وصول کرتی ہیں۔

گورنمنٹ ہند کا محکمۂ زراعت ۶ - ہندوستان خاص طور پر زرعی ملک ہے۔ تقریباً ۷۰ فی صدی کی معاش براہ راست یا بالواسطہ زراعت پر منحصر ہے۔ اور ملک کی سب سے بڑی آمدنی کا ذریعہ بھی زراعت ہی ہے۔ چند سال سے زراعت کی اہمیت پر نظر کر کے گورنمنٹ نے اس کی ترقی کے واسطے خاص اہتمام شروع کیا ہے سنہ ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ نے صوبہ بنگال میں بمقام پوسا ایک نہایت مکمل اور مہتم بالشان زرعی کالج قایم کرنا تجویز کیا تاکہ نہایت اعلیٰ پیمانہ پر علم نباتات کی باقاعدہ تعلیم دی جائے اور سائنس کی جدید تحقیقات کی مدد سے ہندوستان کی

زراعت میں نئی روح پھونکی جائے۔چنانچہ تقریباً بائیس لاکھ روپیہ کی لاگت سے یہ کالج
تیار ہو چکا ہے۔ اس کی کارگزاری دیکھنے کا اشتیاق ہے ۱۹۰۵ء میں گورنمنٹ کی
جانب سے زرعی ترقیات پر بیس لاکھ روپیہ سالانہ خرچ منظور رہوا۔ماہرین زراعت ونباتات کا ایک زرعی بورڈ بنا وہ محکمہ زراعت کے کاروبار کا اہتمام اور نگرانی کرے اور مفید تجاویز وقتاً فوقتاً گورنمنٹ ہند میں پیش کر کے تکمیل کی اجازت حاصل کرتا رہے مرکزی کالج پوسا کے علاوہ ہر صوبہ میں جداگانہ زرعی کالج قائم کئے گئے ہیں چنانچہ ہمارے صوبہ کا کالج کانپور میں جاری ہے۔ کالجوں کے علاوہ ہر صوبہ کے متعدد اضلاع میں سرکاری زرعی مرکز قایم کئے جارہے ہیں۔ سرکاری ملازمین کے اہتمام اور نگرانی میں صدہا بیگہ زمین پر ہر قسم کی فصل بو بوکر تجربہ سے بہترین پیداوار کے اسباب دریافت کئے جاتے ہیں۔ جب قابل اطمینان طور پر تحقیق ہو جاتے ہیں تو بذریعہ تحریر عام لوگوں کی اطلاع کے واسطے مشتہر کئے جاتے ہیں۔ اور مزید برآں یہ کہ سرکاری ملازم گاؤں گاؤں منادی کرتے پھرتے ہیں اور کاشتکاروں کو ترغیب دیتے ہیں کہ ان کی ہدایات پر کاربند ہو کر زراعت سے پورا پورا فائدہ اُٹھائیں۔ جدید طرز کے آلات کشاورزی بھی تجربتاً استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور جو سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ ان کو رواج دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ کسانوں کو تجربہ کے لئے عاریتاً مفت دیتے ہیں۔ نہایت کم شرح سے کرایہ پر دیتے ہیں، مناسب شرائط پر اُدھار فروخت کرتے ہیں اور برائے نام منافع پر نقد بھی بیچتے ہیں۔ چنانچہ علی گڑھ میں بھی کالج سے تھوڑے فاصلہ پر ایک سرکاری زرعی مرکز قایم ہے جو اپنے مفید معلومات اور مشوروں سے گرد و نواح کے کسانوں کو مدد دینے میں بہت کوشاں نظر آتا ہے۔ بحالت ضرورت سرکاری خزانہ سے کسانوں کو روپیہ بھی بطور قرض تقسیم ہوتا ہے تاکہ وہ ساہوکار وں

حصۂ دوم باب ۳

کے دام میں گرفتار نہ ہوں۔ قانون کے ذریعہ سے کسان کو زمیندار کی گرفت سے بھی بہت کچھ آزاد کردیا ہے۔ غرض کہ ہر ممکن طریقہ سے گورنمنٹ زراعت کی ترقی کے واسطے کوشاں نظر آتی ہے۔ لیکن اسی سلسلہ میں آگے چل کر مسئلہ مالگزاری بھی قابل غور ہے۔

قانون تقلیل حاصل

۷۔ زراعت کے متعلق زمین کی ایک عجیب خاصیت تجربہ سے معلوم ہوئی ہے جس کا نام قانون تقلیل حاصل ہے۔ یہ قانون ترقی زراعت پر ایک لازمی حد قایم کرتا ہے اور مسئلہ لگان کے اصول بھی اسی قانون سے اخذ کئے گئے ہیں۔ لہذا اس کی ضروری تشریح یہاں پر برمحل معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتایا جاچکا ہے کہ قدرت نے ہر زمین کی قوت پیدائش معین اور محدود کردی ہے۔ فن زراعت کے اصول کے مطابق جوت کر کھاد ڈال کر ہم زمین کی قوت پیدائش میں اضافہ ضرور کرسکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ زمین کی پیداوار ہم ڈیوڑھی، دوگنی یا سہ گنی کرلیں، مگر اس کو دس بیس یا پچاس گنی حسب دل خواہ بڑھانا ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو ہر ایک کسان چھوٹا سا کھیت لے کر جتنی چاہے پیداوار حاصل کرلیا کرتا۔ اس کو بڑے بڑے کھیت جوتنے بونے اور ان کی نگہداشت کرنے کی زحمت اُٹھانی نہ پڑتی ہے اور نہ پھر زراعت کے واسطے زمین کی اس قدر مانگ ہوتی اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو قطعات صدہا برس سے کس مپرسی کی حالت میں ویران پڑے ہوئے تھے رفتہ رفتہ زیر کاشت آرہے ہیں۔ اگر زمین کی قوت پیدائش لامحدود ہوتی تو موجودہ کھیت کافی ہوتے اور غیر مزروعہ زمینوں پر کاشت پھیلانے کی ضرورت کیا تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک زمین خواہ کیسی زرخیز کیوں نہ ہو۔ اور خواہ فنِ زراعت کا سارا کمال اس پر صرف کردیا جائے، صرف ایک خاص حد تک

کاشت کی متحمل ہوسکتی ہے اگر اس حد سے تجاوز کرکے اضافہ پیداوار کی ہوس میں زیادہ محنت اور حاصل صرف کیا جائے تو یقیناً وہ سب اکارت جائے گا۔ اگر کسی کسان سے سوال کیا جائے کہ وہ اپنے کھیت کو بجائے دو مرتبہ جوتنے کے چار مرتبہ نرائے اور دس مرتبہ پانی دینے اور ایک من تخم بونے کے بجائے بیس مرتبہ جوت کر چالیس مرتبہ نرا کر سو مرتبہ پانی دے کر اور دس من بیج بو کر دس گنی پیداوار حاصل کیوں نہیں کرتا تو وہ صاف جواب دے گا کہ زمین میں اتنی پیداوار کی گنجائش نہیں ایسا کرنے سے ساری لاگت خاک میں مل جائے گی۔ جو پیدا ہوتا وہ بھی نہ ہو سکے گا۔ دس گنی پیداوار کے واسطے ایسے ایسے دس کھیتوں کی ضرورت ہے۔

یہ تو بخوبی ذہن نشین ہوگیا کہ زمین کی قوت پیدائش محدود ہے۔ اب اس خاصیت کے عمل سنئے۔ بغرض سہولت بیان۔ ہم کھیت کو جوتنے، بونے، ترانے اور پانی لگانے کو جداگانہ جرعوں سے تعبیر کریں گے اور ہر جرعہ کی لاگت دس روپیہ قرار دیں گے اگر کھیت ایک مرتبہ جوتا گیا تو گویا ایک جرعہ صرف ہوا۔ اسی طرح بونے، ترانے وغیرہ کے متعلق ہر فعل ایک جرعہ کہلائے گا۔ فرض کرو کہ کسی مناسب ترکیب سے کسان نے ایک کھیت پر دس جرعے صرف کئے۔ یا بالفاظ دیگر سو روپیہ لاگت لگائی اور تیس من غلہ پیدا ہوا اوسط ۳ من فی جرعہ پڑا۔ تجربتاً اسی کھیت پر بارہ جرعے صرف کئے اور پیداوار ۳۷ من ہوگئی۔ گویا دو جدید جرعوں کا ماحصل ۳½ من فی جرعہ ہوا۔ اضافہ کی امید پر سہ بارہ پندرہ جرعے صرف کئے اور پیداوار پچاس من ہوئی۔ آخری تین جرعوں کا اوسط چار من فی جرعہ پڑا۔ اب تو کسان کو چسکا لگ گیا اور چوتھی مرتبہ اس نے سولہ جرعے صرف کئے۔ مگر قدرت نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور اس مرتبہ پیداوار صرف ۵۲ من ہوئی۔ یعنی سولھویں جرعہ کا ماحصل صرف دو من ہوا معلوم ہوا

حصہ دوم
باب ۲

کہ پندرھویں جرعہ پر قوت پیدائش کمال پر پہنچ گئی۔ اور سولھویں جرعے سے انحطاط شروع ہوا۔ پس اصطلاحاً کہیں گے کہ پندرھویں جرعہ تک تو **قانون تکثیر حاصل** جاری رہا مگر سولھویں جرعے سے **قانون تقلیل حاصل** کا عمل شروع ہوا۔ زراعت میں قانون تکثیر حاصل کچھ زیادہ قابل توجہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا اثر کمتر ظہور میں آتا ہے اور محض عارضی ہوتا ہے۔ البتہ مصنوعات میں اس کا اثر بہت اہم ہوتا ہے اور مناسب جگہ ہم اس کی تشریح کریں گے۔ یہاں ہم کو صرف قانون تقلیل حاصل سے بحث کرنی مقصود ہے کیوں کہ اس کا اثر زراعت پر ہر حالت میں یقینی اور دائمی ہوتا ہے اور اس کا مسئلہ لگان اور قیمت زمین سے بہت قریبی تعلق ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل جاری ہونے کے بعد بھی کسان جرعوں میں اضافہ کرے گا یا نہیں اور اگر کرے گا تو کہاں تک۔ اس کا جواب قیمت پیداوار پر منحصر ہے عام اصول یہ ہی کہ خواہ قانون تقلیل حاصل جاری ہو یا نہ ہو کسان اپنے جرعوں میں اُس وقت تک برابر اضافہ کئے جائے گا جب تک کہ ہر جدید جرعہ کی پیداوار کی قیمت جرعہ کی لاگت سے زیادہ ہو حتّٰی کہ کسی جدید جرعہ کی پیداوار کی قیمت اس کی لاگت کے برابر آ پہنچے تو کسان اضافہ فوراً بند کر دے گا اور یہ آخری جرعہ اصطلاحاً جرعہ مختتم اور اس کی پیداوار **حاصل مختتم** کہلائے گی۔ کاشت کی اس حالت کو **اتمام کاشت** سے تعبیر کرتے ہیں صاف ظاہر ہے کہ جرعہ مختتم کسی خاص حد پر قائم نہیں ہوتا بلکہ پیداوار کی قیمت بڑھنے گھٹنے پر حسب ترتیب یہ بھی آگے بڑھتا اور پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ اضافہ قیمت کے زور پر کبھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور کمی قیمت کے باعث کبھی اس کی حد سے پیچھے چلا جاتا ہی۔ چنانچہ ترقی یافتہ اور آباد ممالک میں اس قانون کا اثر بہت قوی اور وسیع پایا جاتا ہی اور پس ماندہ غیر آباد

حصہ دوم
باب

ممالک میں اس کے عمل کی نوبت تک نہیں آتی۔ آخر میں ہم پھر یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ قانون تقلیل حاصل کا تعلق مقدار پیداوار سے ہے کہ قیمت پیداوار سے جب کسی جرعہ کی پیداوار اپنے ماسبق جرعہ کی پیداوار سے مقدار میں گھٹ گئی تو قانون کا عمل شروع ہوا قیمت پیداوار سے قانون کو کچھ سروکار نہیں۔ البتہ جرعہ مختتم تمام و کمال قیمت کے تابع ہوتا ہے۔ قیمت کی بیشی کمی جرعہ مختتم کو قانون تقلیل حاصل کی حد سے فٹ بال کی مانند کبھی اس طرف پھینک دیتی ہے کبھی اُس طرف۔

چوں کہ جرعہ مختتم کی لاگت حاصل مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ لہذا کسی کھیت میں جتنے جرعے صرف ہوں اتنی مرتبہ حاصل مختتم پیداوار کل سے منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ ماحصل زاید کہلائے گا۔ یہ کبھی کسان کا خالص حصہ ہوتا ہے اور کبھی زمیندار و کاشتکار میں باہم تقسیم ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ بھی اس کی مستقل شریک بن گئی ہے اگر کسی کھیت میں دس جرعے صرف ہوں اور پیداوار مقدار کل بارہ من ہو اور حاصل مختتم کی مقدار ایک من تو گویا دس من مصارف کاشت ہوئے اور باقی دو من ماحصل زاید کہلائیں گے۔ اور یہی ماحصل زاید بہ ترمیمات خاص جن کی تشریح مناسب موقع پر کی جائیگی معاشی لگان کہلاتا ہے۔

معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

۸۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ مستقل اسباب تو خواص زمین کے تحت میں واضح ہو چکے۔ چند اسباب جو ترقیات جدید کا نتیجہ ہیں بیان کئے جاتے ہیں۔ جو قطعات شہر اور قصبات سے بہت دور واقع تھے اور بوجہ فاصلہ و قلت ذرائع آمد و رفت ان کی پیداوار منڈی تک لانا نہایت دشوار اور صرف طلب تھا، وہ بیکار پڑے ہوئے تھے نہ کوئی ان کو جوتتا بوتا تھا نہ ان کی کچھ قیمت اُٹھ سکتی تھی۔ کس مپرسی کی حالت میں لاوارثی پڑے ہوئے تھے مگر جب سے

حصہ دوم باب ۲

ہندوستان میں ریل کے قدم آئے اور اس کا جال تمام ملک پر پھیل گیا۔ دور افتادہ زمینوں کے دن پھرے اور جس ویران میدان میں اس کا گزر ہوا بشرط صلاحیت تختۂ عدن بن گیا۔ از کار رفتہ زمینوں سے دولت اُبل پڑی۔

اب تک کھیتوں کی آب پاشی کا دار و مدار بارش یا کنوؤں کے پانی پر تھا بمقابلہ چاہی زمینوں کے بارانی کی قیمت بہت کم تھی۔ بارش کا کیا بھروسہ ہو نہ ہو لہٰذا ایسی زمینوں کی پیداوار بھی اتفاقی تھی۔ لیکن جب سے شمالی ہندوستان میں بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں، نالے نکال کر اور دکن کے پہاڑوں میں گھرے ہوئے میلوں وسیع قدیم تالابوں سے کام لے کر تمام ملک پر پانی کا جال پورا گیا، آب پاشی بہت کچھ بارش اور کنوؤں سے مستغنی ہو گئی ہے۔ اور جہاں چھوٹی سی نالی بھی گزر گئی ہے، غیر چاہی زمینوں کی قیمت چاہی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ غرض کہ ریلوں اور نہروں کی بدولت ملک کا بہت سا ناکارہ حصہ قابل کاشت بن کر بہت کچھ قیمتی ہو گیا۔

جنگلات کی پیداوار سے بھی روز افزوں منافع حاصل ہو رہا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصہ میں جنگلات گورنمنٹ ہند کا نہایت مستقل اور کثیر آمدنی کا ذریعہ بن جائیں گے علم معدنیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ کان کنی کا حلقہ بھی وسیع ہو رہا ہے میسور اور حیدر آباد میں سونا نکلتا ہے، لوہا اور کوئلہ بنگال کے اکثر حصوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ مٹی کے تیل کے ذخیرے بھی دریافت ہوئے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ جستجو کرنے پر ہندوستان میں بہت سی نامعلوم معدنیات سے بیشمار منافع حاصل ہو گا غرض کہ مزروعہ زمین جنگلات و معدنیات سب روز بروز بیش بہا ہو رہی ہیں۔ سکنی زمینوں سے ہم شہروں کے تحت میں جداگانہ بحث کریں گے۔

۹۔ کسی زمانہ میں زیادہ تر لوگ دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں رہتے

حصہ دوم
باب ۶
شہروں کی افزونی کا زمین کی تعدد قیمت پر اثر

تھے ذرائع آمد و رفت کم اور دقت طلب تھے۔ بالعموم لوگ اپنے وطن یا اس کے گرد و نواح میں عمر بسر کر دیتے تھے۔ جہاں بادشاہ، اُمراء، اور حکام کا قیام رہا وہاں البتہ شہر آباد ہو گئے۔ لیکن جب سے ایجادات جدیدنے فیکٹریوں، ملوں، عظیم الشان کارخانوں کی بنا ڈالی اور ریل نے آمد و رفت کو ایک کھیل بنا دیا، ڈاک اور تار نے ناواقفیت کا پردہ اٹھا دیا تب سے بڑی بڑی تجارت گاہوں اور صنعت و حرفت کے مرکزوں کی بنیاد قائم ہوئی۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بانی اکثر معاشی اسباب بنے۔ لندن برطانیہ عظمیٰ کا دار السلطنت سہی۔ لیکن اس کی عظمت کے حقیقی اسباب اس کے معاشی خصوصیات میں مضمر ہیں۔ خود ہندوستان کے نامور شہر کلکتہ، بمبئی، مدراس، ناگپور، دہلی، لاہور تجارت اور صنعت و حرفت کی وجہ سے اس قدر پُر رونق اور آباد ہیں۔ ورنہ محض بحیثیت دار السلطنت ان کو موجودہ عروج ہرگز میسر نہ ہوتا۔ آبادی اب اس قدر کثیر او رنقل پذیر ہو گئی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مہذب ملک ہوگا جہاں کے کم از کم دو چار باشندے بڑے شہروں میں مصروف کاروبار نہ پائے جائیں۔ خود ہندوستانی جیسے گھر گھسنے لوگ، چین، جاپان، افریقہ اور امریکہ تک تلاش معاش میں چکر لگا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشی ترقیات کے ساتھ شہروں کی وسعت اور تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر ایک منارے پر چڑھ کر کسی شہر کا منظر دیکھو تو بوجہ گنجانی آبادی بھڑوں کا چھتا نظر آئے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہر کے گرد و نواح میں زمین خالی پڑی ہے تو پھر لوگ شہر کے اندر تنگ و تاریک مکانات میں رہنے پر کیوں جان دیتے ہیں۔ شہر سے باہر ہوادار مکان بنا کر آرام سے کیوں نہیں رہتے۔ شہری لوگ کچھ دیوانے تو ہوتے نہیں۔ ضرور کوئی زبردست مصلحت ہوگی کہ وہ شہر کی کوٹھری کو بیرونِ شہر کی

کوٹھی پر ترجیح دیتے ہیں۔ بازاروں، کارخانوں، دفتروں، عدالتوں، کالجوں، اور ریلوے اسٹیشن کے قرب وجوار میں شرح کرایہ مکانات بہت زیادہ ہوتی ہے اور باوجود زیادتی کرایہ لوگ ایسے ہی مکانات کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ بتانا دشوار نہیں۔ لوگ اپنی کاروبار کی جگہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں۔ اور کفایت وقت وسہولت آمدورفت کو زیادتی کرایہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ شاہی زمانہ کے محلات جن کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا دہلی کے اندرونی محلوں میں سُنسان اور غیر آباد پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی اگر برائے نام ہی کرایہ دے تو مکان کی صفائی، روشنی آبادی غنیمت سمجھی جاتی ہے۔ اور ریلوے اسٹیشن کے قریب سراؤں کی کوٹھریاں اور ہوٹلوں کے معمولی مکانات صدہا روپیہ ماہوار کرایہ کما رہے ہیں۔ یہی حال بازاروں کا ہے جو بازار کسی غیر آباد حصہ میں بے موقع بنا ہے کہ وہاں کوئی بھولا بچھڑا خریدار آنکلے تو آنکلے ورنہ ساری خرید وفروخت پڑوس کے غریب لوگوں تک محدود ہے۔ وہاں وسیع دُکانیں نہایت قلیل کرایہ پر چلتی ہیں۔ یہاں کے دُکاندار محض بوجہ مجبوری تھوڑی سی خردہ فروشی کو بیکاری سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بازار عام گزرگاہ شہر کے آباد حصہ میں واقع ہے۔ جہاں خریداروں کا دن بھر ہجوم رہتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی دُکان بھی دس گنے کرایہ پر اُٹھتی ہے اور اس پر بھی لوگ متلاشی پھرتے رہتے ہیں۔ دُکان دار اپنی تجارت کے فروغ پر ایسے پچاس کرایہ بھی قربان کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دہلی میں چاندنی چوک اور کشمیری دروازہ کی دُکانوں کا جو کرایہ ہے۔ دوسرے بازاروں میں اس کا نصف بھی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ شہر کی گنجانی اور تنگی بے وجہ نہیں ہوتی۔ بلکہ زبردست معاشی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہر کی زمین کی قدر وقیمت کا باعث جائے

وقوع ہے۔ موقع کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے بخوبی واضح ہوگا۔ مدراس
میں ساحل کے قریب قریب نہایت کشادہ، ہموار اور صاف سڑک کئی میل تک چلی گئی
ہے۔ اس کو بیچ لائن کہتے ہیں۔ مناظر کی دل کشی اور ساحل کی خوبصورتی کے لحاظ سے
نیپلس کے بعد دنیا بھر میں وہ دوسرے درجہ کی خیال کی جاتی ہے۔ شہر کے حکام معززین
تاجر، عالم، صدہا یوروپین عورتیں اور بچے شام کے وقت چہل قدمی کے لئے جمع ہوتے
ہیں۔ عجیب سماں ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے سمندر کی ریتی پر خوب دوڑ لگاتے
اور لوٹتے ہیں۔ مگر ریتی ایسی صاف کہ کیا مجال کپڑا میلا ہو۔ جہاں ذرا جھٹکا کپڑا صاف
قریب ہی منتہائے نظر تک سمندر لہریں مارتا ہے اور غروب آفتاب کا منظر کچھ عجب
پارعب اور شاندار ہوتا ہے۔ سڑک پر بینڈ بجتا ہے۔ جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں۔ کہیں
دوستوں کی ٹولی خراماں خراماں چلی جا رہی ہے۔ کہیں لوگ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔
بعض لوگ کسی کے انتظار میں یا دم لینے کو بیٹھے ہوئے ہیں، اور تمام مجمع نہایت صاف
و پاکیزہ۔ پانچ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک یہی سماں بندھا رہتا ہے۔ خصوصاً
چاندنی بارھویں سے سولھویں شب تک جب کہ سمندر میں جوار بھاٹا زور شور پر
ہوتا ہے۔ آدھی آدھی رات تک لوگ قدرت کے اس شاندار تماشے میں محو رہتے
ہیں۔ سڑک کے کنارے پرنس آرکاٹ کی کچھ خاندانی عمارتیں ہیں جن میں آج کل سرکاری
دفاتر قائم ہیں تحقیق طور پر سنا ہے کہ یہاں کے قرب و جوار میں چار سو روپیہ گز تک
زمین فروخت ہونے کی نوبت آگئی۔ بالآخر پرائیویٹ خرید و فروخت بند کر کے
گورنمنٹ نے وہ کل قطعہ اپنے قبضہ میں لے لیا اور اب وہ سرکاری ملک تصور ہوتا
ہے۔ امریکا کے مشہور شہر نیویارک میں جہاں سنا ہے بوجہ کثرت آمد و رفت صدر
اسٹیشن سے شب و روز ہر چوتھے منٹ پر ایک ٹرین گزرتی ہے، وال اسٹریٹ اور

حصّہ دوم باب ۴

براڈوے بازاروں کے قرب و جوار میں بارہ ہزار روپیہ اور لندن کے مشہور بازار لمبارڈ اسٹریٹ میں تقریباً ۱۷ ہزار روپیہ مربع گز کی شرح سے زمین فروخت ہو چکی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے مکان کے واسطے کچھ نہیں تو دو سو گز زمین تو ہو۔ اس کی قیمت کیا ہوئی؟ چوبیس بلکہ چونتیس لاکھ روپیہ! گویا وہاں کے جھونپڑے یہاں کے محلات سے بدرجہا قیمتی ہوتے ہیں۔ کیا وہاں کی زمین سونے کی ہے؟ زمین تو ہمارے ہاں کی روپیہ گز والی قصباتی زمین سے کسی طرح بہتر نہ ہوگی جو کچھ قیمت ہے وہ قیمت موقع ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ شہر کی زمینوں کی قیمت میں قیمت زمین اور قیمت موقع دو جداگانہ چیزیں شامل ہوتی ہیں اور قیمت موقع میں اضافہ کی بے حد گنجائش ہے۔ موقع کا اثر تو مزروعہ زمینوں کی قیمت پر بھی پڑتا ہے۔ چنانچہ قصبات کے قرب و جوار کے کھیت دیہات کے کھیت سے زیادہ قیمتی خیال کئے جاتے ہیں۔ مگر سکنی زمین کے مقابلہ میں مزروعہ زمین کی قیمت موقع کی کچھ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ اور اسی وجہ سے صرف شہر کی زمینوں کے ساتھ قیمت موقع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہروں میں پارک کی ضرورت

۱۰۔ گنجانی آبادی اور افزونی قیمت زمین کا اثر شہر کی ساخت پر یہ پڑتا ہے کہ گلی کوچے تنگ اور عمارتیں کئی کئی منزل بلند بنائی جاتی ہیں۔ امریکا میں سات سات منزل تک عمارت اٹھ چکی ہے۔ روشنی اور پاک و صاف ہوا جو زندگی کے واسطے لازمی ہیں، کافی میسر نہیں آتیں۔ باشندوں کی صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔ کچھ دنوں سے یہ طریق بہت مروج ہو چلا ہے کہ ہر شہر میں ایک یا زیادہ وسیع پارک بنائے جاتے ہیں جہاں دن بھر کے تھکے ماندے لوگ شام کو آکر دل بہلاتے ہیں۔ سبزہ سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہیں۔ پاک صاف ہوا کا لطف اٹھاتے ہیں۔ اکثر جگہ ہفتہ میں ایک یا دو روز بینڈ بھی بجتا ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کی تفریح سے دن بھر کے کام کاج کی تکان اتار کے تازہ دم گھر

حصہ دوم
باب ۳

جاتے ہیں۔ یورپ میں تو شہر شہر پارکوں کی کثرت ہے لیکن اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی ان کی ضرورت محسوس ہو چلی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، مدراس، بنگلور جیسے مقامات میں جہاں انگریزی آبادی کی کثرت ہی مدت سے کئی کئی پارک موجود ہیں۔ الہ آباد میں ایک پارک تیار ہو چکا ہے اور دوسرا زیر تجویز ہے۔ لکھنؤ کا مختصر سا امین آباد پارک بھی بہت پُر فضا ہی۔ اب اس کی توسیع کی جا رہی ہی جس قدر شہروں کی آبادی زیادہ گنجان ہو گی۔ پارک کی ضرورت بڑھے گی۔ عرف عام میں پارک شہر کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں اور آبادی کی صحت کے واسطے وہ اسی قدر ناگزیر ہیں جس قدر کہ جسم انسان کے واسطے پھیپھڑے۔

ٹریم کار کا شہروں کی آبادی اور زمین کی قیمت پر اثر

۱۱۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ٹریم کار کا شہر کی حالت پر بہت مفید اثر پڑ رہا ہے موٹر تو قیمتی بہت، بائیسکل کی معمولی قیمت بھی معمولی لوگوں پر گراں، اور شہر کی تنگ گلیوں اور بھیڑ دار سڑکوں پر اس کا چلانا خطرناک۔ گھوڑا گاڑی کا کرایہ زیادہ اور ہمیشہ وقت پر ملنا دشوار لیکن ٹریم کار کا حسب قاعدہ ہر چوتھے چھٹے یا دسویں منٹ اپنے راستہ سے گزرنا یقینی، کرایہ نہایت واجبی، تیز رفتار حسب دلخواہ، اور پھر کافی مطیع۔ ستون کے قریب ذرا ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کھٹ سے رک گئی۔ اطمینان سے چڑھے کہ چلدی منزل مقصود پر حسب ہدایت چلانے والے نے بلا منت روک دی، اور چند پیسے دے کر چشم زدن میں میلوں دور، کارخانے، دفتر، کالج، عدالت، دوکان، جہاں ضرورت ہوئی پہنچ گئے نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ کاروباری جگہ کے قرب کے اس قدر خواہشمند نہیں جتنا کہ ٹریم کار جاری ہونے سے پہلے تھے۔ اب بجائے زیادہ گنجان ہونے کے شہر کی آبادی گرد و نواح میں پھیلنے لگی ہی۔ بیرون شہر کی زمینوں میں صرف فاصلہ کا نقص تھا سو وہ ٹریم کار نے رفع کر دیا۔ ورنہ بحیثیت آب و ہوا تو یقیناً شہر کی زمینوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ لوگ وہاں بشوق آباد نہ ہوں جس طرح نالیوں سے کسی تالاب کا پانی بہتا ہے، ٹریم سے

حصّہ دوم
باب ۶

شہر کی آبادی ہر چہار طرف پھیل رہی ہے مضافات شہر کی زمینوں کی قیمت بڑھ رہی ہے اور اندرون شہر زمینوں کی قیمت کی رفتار ترقی سست پڑ گئی۔ شہر کی گنجانی اور قیمت زمین کے بے حد اضافہ کا تشویش ناک مسئلہ ٹرام کار نے حسب دل خواہ حل کر دیا اور ظاہر ہے کہ اس کا رواج دوسری سواریوں سے شہر کے حق میں بہت زیادہ مفید ثابت ہوا۔

اضافہ قیمت زمین کی مقدار

۱۲۔ چوں کہ اضافہ قیمت زمین کے اسباب قدرتی خصوصیات اور معاشی ترقیات ہیں اور مالک کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت ہی کم دخل ہے۔ یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ اضافہ قیمت زمین کا حق دار کلی کون سمجھا جائے۔ اگر کل نہیں تو اضافہ کا ایک معقول حصّہ ضرور گورنمنٹ کو ملنا چاہیئے تاکہ تمام ملک کی ترقی اور بہبودی پر صرف کیا جا سکے اسی اصول پر زمینداروں سے مالگزاری اور مکان داروں سے ہاوس ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ تقسیم اضافہ کی بحث ہم آئندہ بالتفصیل کریں گے (۵-۴/۱۷) اب زمین کا بیان ختم کرتے ہیں۔

حصہ دوم
باب ۵

باب پانچ

محنت

تجزیہ (۱) محنت کا مفہوم (۲) محنت کے اقسام (۳) محنت کے خواص (۴) کارگردگی کا مفہوم (۵) لوازم کارکردگی.

محنت کا مفہوم

۱۔ محنت کے اصطلاحی معنوں میں قدیم معاشیین کی کوتہ نظری اس قدر جذب ہوگئی ہے کہ باوجود تحقیق نقص اب تک اکثر مصنفین پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور محنت کی وہی قدیم ناقص تعریف دہرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مارشل تک نے نہ معلوم کیوں دولت کی تعریف میں محض تقلید پر اکتفا کیا مگر ساتھ ہی اتنا ضرور کیا کہ مروجہ تعریف کے نقص و خامی کی پوری توضیح کردی اور کم از کم دوسروں کو اصلاح اور ترمیم کی جرات دلائی۔ آج سے پچاس برس پہلے تک بہت سے مسائل ناواقفیت اور غلط فہمیوں کے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ آدم اسمتھ کے زمانہ تک دولت میں صرف مادی چیزیں شامل تھیں اور قیمتی دھاتیں مثل سونا، چاندی بوجہ دیرپا ہونے کے بالخصوص اعلیٰ قسم کی دولت مانی جاتی تھیں۔ دولت کے اسی مفہوم کے مطابق محنت سے صرف وہی کام جسمانی یا دماغی مراد تھے جن کے معاوضہ میں کچھ مادی آمدنی ہوسکے۔ اس میں شک نہیں کہ اب تک محنت کی عام شکل یہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ لیکن دولت کے جدید معنی جن کو ہم مقدمہ میں واضح کرچکے ہیں مدنظر رکھتے ہوئے محنت کا مفہوم وسیع تر بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یعنی محنت میں وہ کام بھی شمار کرنے چاہئیں جن کے

حصۂ دوم
باب ۵

بدلہ میں مادی آمدنی کے بجائے کوئی لطف مسرت جیسی افادہ والی دولت حاصل ہو۔ ہم نے مانا کہ اس آخری قسم کی محنت کا حلقۂ عمل تنگ اور مختصر ہے اور ہونا چاہئے ورنہ نظام عالم منقلب ہو جاتا، لیکن اصولاً محنت کے معنوں میں صرف قسم اول کے کاموں کو شامل اور قسم دوم کو خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ملازم تنخواہ کے لالچ سے خدمت کرتا ہے۔ لیکن ماں باپ کو اولاد کے پالنے اور عاشق کو محبوب کی نازبرداری میں جو لطف آتا ہے وہ اس دولت کا افادہ ہی جو بشکل مخدومیت بمعاوضہ محنت خدمت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ ماں باپ یا عاشق کیا لایعقل ہیں کہ بے کار اپنی جان کھپاتے اور دولت لٹاتے ہیں۔ پھر ملازم کے کام کو محنت شمار کرنا اور والدین و عاشق کی جانفشانی کو نظر انداز کرنا سراسر بے جا اور خلاف اصول معلوم ہوتا ہے۔ کھیل کود اور ورزشیں بھی جن کے معاوضہ میں قدرت، تفریح، صحت و قوت عطا کرتی ہے فی نفسہ محنت ہیں اور مروجہ محنت سے اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ ان کا لحاظ کرنا لازمی ہے۔ بیکار پڑا رہنا اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ بشکل قید تنہائی ایک سخت سزا تجویز کیا گیا ہے۔ اگر محض جی بہلانے کی غرض سے بیکار آدمی کہیں آئے جائے تو یہ فعل گو بظاہر بے سود نظر آتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ ایک تکلیف سے نجات دے کر دل کو آرام پہنچاتا ہے اور محنت میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ اگر کوئی سوال کرے کہ جو لوگ مفت بیگار میں بہزار ناخوشی کام کرتے ہیں اُن کو تو کوئی بھی معاوضہ نہیں ملتا یعنی نہ مزدوری نہ لطف۔ ان کا کام محنت کیسے کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ سطحی دھوکا ہے۔ بیگار نہ کرنے پر جو سزا کی تکلیف پہنچتی اس سے نجات ملنا گویا کام کا معاوضہ ہے۔ اور بیگاری بھی محنت کرتے ہیں۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب محنت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے تو آخر وہ کون کام ہیں جو محنت نہیں۔ جواب صاف ہے۔ جن کاموں کا معاوضہ نہ ملے وہ محنت نہیں۔ مثلاً راستہ بھٹکنا جرم کرنا

حصۂ دوم

بات بھولنا، حادثات سے مجروح یا ضائع ہونا۔

باب ۵ یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ جس طرح متقدمین تفریط پر اڑے تھے۔ ہم بھی افراط کی جانب بڑھے ہیں۔ تاکہ دونوں منتہی دیکھنے سے ناظرین میں وسعت نظر پیدا ہو اور وہ عقل سلیم سے کام لے کر خیر الامور اوسطہا کے اصول پر خود طے کر سکیں کہ محنت کا مفہوم کیا ہے اور کس قسم کے کام اس میں شمار ہونے چاہئیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے متعلق ہیں اُن کے اصول و قوانین کم و بیش تخمینی اور مذبذب ہوتے ہیں ان میں بھلا علم ہندسہ یا طبیعات کے اصول و قوانین کا سا استحکام اور تیقن کہاں۔ یہ دشواری علم المعیشت میں بوجوہات معلومہ خاص طور پر پیش آتی ہے۔ تحقیق جدید جس قدر وسعت مفہوم کی متقاضی تھی وہ ہم نے بیان کر دی اور محنتی و غیر محنتی کاموں میں جہاں تک ممکن تھا حد فاصل قایم کر دی لیکن قطعی طور پر ان دونوں قسم کے کاموں کی کوئی جداگانہ فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ اکثر کام تو محنت ہوتے ہیں۔ بعض کے متعلق کوئی رائے قایم کرنا دشوار ہے اور معدودے چند محنت سے خارج کئے جاتے ہیں۔

جو کچھ بیان ہوا یہ سب مفہوم محنت کی ایک علمی بحث تھی۔ عملاً اس کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں۔ معاشیات میں ہم کو بیشتر ایسی ہی محنت کے اصول و نتایج سے سروکار رہتا ہے جس کو عام طور پر سب محنت سمجھتے ہیں۔ یعنی وہ کام جس کا کچھ مادی معاوضہ ہاتھ آئے۔ والدین عشاق اور شوقین لوگوں کے مشاغل سے ہم کو معدودے چند مفید مطلب باتیں تحقیق ہوئی ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ بیان کی جائیں گی۔ یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں ان کا ذکر بھی کرنا ضروری معلوم ہوا۔

(پس بالفاظ مختصر محنت سے وہ تمام جسمانی اور دماغی کام مراد ہیں جو بغرض حصول معاوضہ کئے جاویں۔ اکثر یہ معاوضہ بشکل مادی اور کمتر بشکل حظ و لطف وغیرہ مطلوب ہوتا ہے۔)

حصہ دوم باب ۳ محنت کے اقسام

ہمارے نزدیک محنت کو معاشی جد و جہد سے تعبیر کرنا نہایت مختصر جامع اور صحیح تعریف ہوگی۔ معاشی جد و جہد کی تشریح مقدمہ میں موجود ہے۔

۲۔ مدّت سے محنت کی دو قسمیں چلی آتی ہیں۔ پیدا آور اور غیر پیدا آور یہ تفریق بھی محض قدیم ناواقفیت اور تنگ نظری کی یادگار رہے۔ وہ محنت ہی کیا جو غیر پیدا آور ہو اس سے گویا اجتماعِ ضدین لازم آتا ہے۔ مگر چوں کہ یہ بحث تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے اور ترقی خیالات کا تمام سلسلہ اس سے پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ ہم اس کا لبِّ لباب بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

سترھویں صدی میں حکمائے مستبدین کا زمانہ معاشیات کا دورِ اول خیال کیا جاتا ہے۔ ان حکما کے نزدیک صرف سونا چاندی ٹھیٹ دولت تھی اور جس محنت کا معاوضہ براہ راست چاندی سونا ملتا تھا وہ تو پیدا آور تھی اور باقی غیر پیدا آور۔

انقلاب فرانس کے زمانہ میں جب حکمائے متوکلین کا گروہ نمودار ہوا تو اس نے معاوضہ میں زر و سیم کی شرط توڑا دی لیکن صرف زراعت کو محنت پیدا آور اور باقی کو غیر پیدا آور قرار دے دیا اور وجہ تفریق یہ قایم کی کہ تمام پیداوار کا مخزن و منبع زمین ہے۔ باقی تمام پیشے اسی زمین کی پیداوار میں تغیّر و تبدّل کرتے رہتے ہیں اپنی ذات سے پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

دولت کی تعریف اور پیدائش دولت کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی مد بغیر زمین کی پیداوار دولت نہیں کہلا سکتی۔ اس کی کافی تشریح کی جا چکی ہے۔ پس جب پیدائش دولت کے واسطے صنعت شرط لازمی ہے تو وہ محنت غیر پیدا آور نہیں ہو سکتی صنعت بھی مثل زراعت محنت پیدا آور رہی۔

حمالی و بار برداری کسی زمانہ میں محنت غیر پیدا آور مانی جاتی تھی کیوں کہ کسی چیز کو

حصۂ دوم
باب ۵

ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی۔ وہی کی وہی چیز باقی رہتی ہے۔ پھر باربرداری کیونکر محنت پیدا آور ہوسکتی ہے۔ لیکن مفہوم پیدائش کی بحث میں ثابت ہوچکا ہے کہ پیدائش کی ایک حالت محض نقل مقام ہوتی ہے۔ کان کنی اور باربرداری میں فرق ہے۔ صرف یہی نہ ایک معدنیات کو غار سے سطح زمین پر لاتی ہے۔ گویا حرکت عمودی ہوتی ہے اور دوسری ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں پہنچاتی ہے۔ گویا حرکت افقی ہوتی ہے صرف حرکات کی سمت میں فرق ہے۔ ورنہ نتیجہ دونوں کاموں کا ایک ہی ہے۔ یعنی ایک ایسے مقام سے جہاں چیز ناکارہ پڑی ہے یعنی صفت دولت سے معرّا ہے ایسی دوسری جگہ لیجانا جہاں وہ کارآمد ہوکر دولت بن جائے۔ دونوں کاموں سے محض بذریعہ نقل مقام دولت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ کان کنی تو محنت پیدا آور ہو اور باربرداری نہ ہو۔ اگر زمین کی پیداوار زمین ہی پر چھوڑ دی جائے اور مصنوعات کارخانوں میں انبار ہوتی رہیں اور منڈی تک نہ لائی جائیں تو کسی طرح پر دولت نہیں شمار ہوسکتیں نقل مقام ان کے دولت بننے کی شرط لازمی ہے اور خصوصاً اس زمانہ میں تو باربرداری پیدائش دولت میں بے حد مدد دے کر بدرجۂ اولیٰ محنت پیدا آور کہلانے کی مستحق ہے۔

کسی زمانہ میں تجارت اور باربرداری دونوں کام ایک ہی شخص کے متعلق تھے۔ تاجر اپنے ذاتی اہتمام و نگرانی سے مال شہر بشہر لئے پھرتے تھے۔ مگر معاشی ترقیات کی بدولت اب یہ دونوں کام جدا ہوگئے۔ تاجر اپنی دوکان سے مال روانہ کرتے ہیں دردوکان پر وصول کرتے ہیں۔ باربرداری کا کام اب ریلوے کمپنی نے اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ باربرداری تجارت سے اس قدر وابستہ ہے جیسے چولی سے دامن اور جسم سے روح۔ باربرداری کا باعث اور غرض تجارت نہیں تو اور کیا ہے۔ پس جب باربرداری محنت پیدا آور قرار پاچکی تو اس کی روح رواں یعنی تجارت اس سے بڑھ کر محنت پیدا آور سمجھنی چاہئے

حصۂ دوم زراعت، صنعت، باربرداری اور تجارت، درحقیقت ایک ہی عمل پیدائش کے
باہم لازمی حصے ہیں اور ہر ایک بطور خود محنت پیدا آور ہے۔

لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدمات عامہ بھی محنت پیدا آور ہو سکتی ہے مثلاً جج جو فیصلے لکھتا ہے، ڈاکٹر شگاف دیتا ہے، طبیب دوا تجویز کرتا ہے۔ پروفیسر لڑکے پڑھاتا ہے۔ اڈیٹر اخبار رسالے چھاپتا ہے مصنف کتابیں لکھتا ہے۔ ان کاموں سے کیا دولت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اوّل تو مقدمہ سے ان خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے۔ لہٰذا محنت پیدا آور ہیں۔ کیوں کہ افادہ اور استبدال کے ہوتے ہوئے غیر پیدا آور ہونے سے اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کی بیشمار قسمیں تو پیدا ہو گئیں لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں منسلک ہیں کہ کسی ایک کا بھی باقی سے جدا کرنا محال ہے۔ اگر انسان تمام پیشوں کی باہمی تعلق پر غور کرے تو وہ ہر ایک کو باقی تمام کا جزو لاینفک پائے گا۔ تحقیق ہوا ہے کہ جو روٹی ہم کھاتے ہیں اس کی تیاری سے براہ راست اور بالواسطہ تین سو پیشے متعلق ہیں۔ حتیٰ کہ ادیب و شعراء اور تمام علوم کے حکماء جو ملک میں پاکیزہ خیالات، عمدہ جذبات اور بیداری پیدا کرتے ہیں طرح طرح کے مفید معلومات پھیلاتے ہیں وہ بھی روٹی کے اہتمام میں کم و بیش شریک ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی کا تعلق قریبی ہے اور کسی کا بعید۔ کسی کا ظاہر، کسی کا پوشیدہ، مگر سلسلۂ تعلق میں سب تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔ جدا ایک بھی نہیں۔

تفصیل بالا سے واضح ہوا کہ تمام قسم کی محنت پیدا آور ہے۔ اگر کوئی کام غیر پیدا آور ہے تو وہ محنت ہی کہاں رہا۔ پس محنت پیدا آور اور غیر پیدا آور کی تفریق سراسر بے معنی ہے لیکن کسی زمانہ میں جب کہ پیدائش کا مفہوم نہایت دھندلا تھا محنت کی یہ تفریق بہت اہم خیال کی جاتی تھی۔ یہ خیال کرنا بے جا ہوگا کہ مذکورۂ بالا خامیوں سے متقدمین کی علمیت پر کچھ

حصہ دوم
باب ۵

الزام آتا ہے کوئی علم دنیا میں مکمل نہیں اُترتا بلکہ صدہا سال کی مسلسل کوشش سے بتدریج ترقی پاتا ہے۔ اور خواہ کسی درجہ پر پہنچ جائے لیکن جو متقدمین کسی علم کی بنا ڈالتے ہیں اور جہالت کی ابتدائی تاریکی سے نکال کر دنیا سے متعارف کرتے ہیں، ان کا فخر کسی دوسرے کو کب نصیب ہو سکتا ہے۔ جن علماء کی تنگ نظری کا ہم نے ذکر کیا ہے انھوں نے اپنی قابلانہ تحقیق سے اس علم میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کرکے اگر سچ پوچھو تو دنیا پر احسان کیا ہے۔ ان کے علمی خیالات میں جو آج کل خامیاں نظر آتی ہیں آئندہ چل کر موجودہ خیالات میں اس سے بڑھ کر نقص نکالے جائیں گے۔ یہ تو ترقی علم کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس سے کسی کی قابلیت پر حرف نہیں آتا۔ اور اسی اصول کی روشنی میں ہماری نکتہ چینی پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

محنت کی ایک تقسیم اور بھی کی گئی ہے۔ محنت بامہارت و بے مہارت دونوں قسموں کے کچھ خواص مقرر نہیں۔ صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ جس کام کے سیکھنے میں کچھ وقت اور ذہانت درکار ہو وہ بامہارت کہلاتا ہے۔ اور جو بلا غور جلد آجائے وہ بے مہارت لیکن ان دو قسموں کے درمیان کوئی بین اور مستقل حد فاصل قائم نہیں ہو سکتی۔ علمی اخلاقی اور معاشی پس ماندگی اور ترقی کے مطابق ان کے حلقوں میں کام داخل یا خارج ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں کی محنت بامہارت قصبہ میں بے مہارت اور قصبہ کی بامہارت شہر میں بے مہارت شمار کی جاتی ہے۔ درزی کی محنت لو۔ گاؤں میں معمولی کُرتہ پاجامہ قصبہ میں اچکن انگرکھا۔ اور شہروں میں فیشن ایبل کوٹ، پتلون، محنت بامہارت سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح گاؤں میں ہل، چرخہ، قصبہ میں صندوق، چوکی، اور شہروں میں خوشنما میز کرسی، بڑھئی کی محنت بامہارت مانی جاتی ہے۔ عام شناخت تو وہی ایک ہے۔ سیدھا سادہ آسان کام بے مہارت اور دقیق و دشوار بامہارت۔ البتہ ترقی کے ساتھ آسانی اور دشواری کے معیار بدل جاتے ہیں اور اسی کے مطابق کام داخل خارج ہوتے رہتے ہیں۔

حصّہ دوم محنت کا مفہوم اور اس کے اقسام بیان ہو چکے۔ اب ہم ضروری خواص بتانا چاہتے ہیں۔
باب ۵ ۳۔ (۱) جب کوئی شخص مکان تعمیر کراتا ہے، باغ لگاتا ہے، ہاتھی گھوڑے جیسے جانوروں
محنت کے سدھانے میں روپیہ صرف کرتا ہے، یا کوئی قیمتی مشین خرید تا ہے تو وہ جس چیز پر
کے روپیہ صرف کرتا ہے اس کا پورا مالک ہوتا ہے اور اس کے استعمال یا فروخت سے اپنی
خواص لاگت وصول کر سکتا ہے۔ لیکن جو روپیہ انسان کی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا جاتا ہے
اس کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ ماں باپ محض فطری محبت کے جوش میں اولاد کی پرورش
اور تعلیم و تربیت پر ہزارہا روپیہ لٹا دیتے ہیں لیکن ان کو اپنے مصارف کی واپسی کا
کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اگر اولاد اہل ہو تو شاید اپنی کمائی سے بوڑھے والدین کی قدمت
کرے ورنہ والدین تمام عمر کی کمائی اور محنت، سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں خصوصاً جب سے
رسمِ غلامی بند ہوئی اور شخصی آزادی نے زور پکڑا۔ ہر کوئی خود مختار بن بیٹھا۔ کسی کی ملک ہونا تو
درکنار اب انسان سوائے قانون کے کسی کا مطیع نہیں رہا۔ جب یہ حالت ہے تو غیروں کو
کیا پڑی ہے کہ کسی کی تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کریں چنانچہ حیوانات، نباتات، مکانات، آلات
اور دیگر مادی سامان کی اصلاح و ترقی میں روپیہ جس قدر بیدریغ صرف کیا جاتا ہے تعلیم
و تربیت کے خرچ میں اسی قدر بخل برتا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصارف اول الذکر کی بنا
منفعت طلبی ہے۔ اور آخر الذکر کی محبت و انسانی ہمدردی، اور ان دو جذبات کی قوت
اور وسعت عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ محبت اور ہمدردی جیسے پاک جذبات تو کمتر
دلوں میں بستے ہیں مگر منفعت طلبی جیسی قوی خواہش کی کسی دل میں کمی نہیں۔ پس جن مصارف
میں منفعت طلبی داخل ہے ان کی کثرت ہے اور جو محض ہمدردی پر مبنی ان کی قلت
جو روپیہ غیروں کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اس کی واپسی میں قانون سے مدد لی جا سکتی ہے
مگر وہ مدد بھی پوری کارگر نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے کہ کوئی شخص وظیفہ سے تعلیم حاصل کر کے

اس کی واپسی میں تساہل کرے تو اُس سے روپیہ وصول کرنا بہت دشوار رہتا ہے۔ البتہ وہ حیران و پریشان کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی وظائف کی واپسی زیادہ تر نیک نیتی اور خوش معاملگی پر منحصر ہے نہ کہ جبر اور قانونی کارروائی پر۔ اگر وظائف جائداد کی ضمانت پر دیئے جائیں تو جائداد ہوتے ہوئے وظیفہ کی حاجت کیا۔ وظیفہ کی غرض تو نادار اور ذہین طلبہ کی امداد ہے۔ جائداد کی ضمانت سے گویا وظیفہ کی اصلی غرض فوت ہوتی ہے۔ اور اگر ضامن طلب کئے جائیں تو وظیفہ چاہنے والے جیسے لوگوں کو ضامن میسر آنا معلوم۔ غرض کہ وظیفہ عاریتاً محض اعتماد پر دیا جاتا ہے یا مفت بطور ہمدردی۔ مثل دیگر مصارف کے وظائف کا دینا کبھی کاروباری حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ اگر کسی متمول تاجر سے دریافت کیا جائے کہ جب وہ لاکھوں روپیہ کارخانوں کی تعمیر اور مشینوں کی خرید میں صرف کرتا ہے تو تعلیم میں جو تمام ترقیوں کا منبع ہے وہ کچھ روپیہ کیوں نہیں لگاتا۔ غالباً جواب دے گا کہ اس سے مجھ کو کیا فائدہ۔ اگر یقین دلائیے کہ پڑھ لکھ کر جب لوگ کمائیں گے تمھارا روپیہ واپس کر دیں گے تو اس کی ہرگز تشفی نہ ہوگی۔ اور اگر سمجھائیے کہ قوم ترقی کرے گی اور تعلیم کا پھیلانا بہت ثواب کا کام ہے تو جواب دے گا کہ ثواب کے کام میں سو پچاس روپیہ سے ہم بھی شریک ہو سکتے ہیں، ہزاروں کی رقم خیرات کرنا ہماری حیثیت نہیں۔ اور تعلیم دلانے سے بھی جو زیادہ ثواب کے کام ہیں (بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ اپاہجوں کی مدد کرنا) اول وہ کام کرنے ضروری ہیں۔ البتہ کچھ بچا تو تعلیم میں بھی دیں گے۔ جو لوگ تعلیمی وظائف کے واسطے چندہ فراہم کرتے ہیں۔ قدم قدم پر یہ جواب اُن کے سننے میں آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں میں بیداری پیدا ہو چلی ہے۔ ہمدردی کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ تعلیم کی ضرورت اور عام ملکی بہبودی کے فوائد محسوس ہونے لگے۔ چنانچہ نادار اور ہونہار طلباء کو وظیفہ دینے والی انجمنیں جگہ جگہ قایم ہو رہی ہیں۔ گورنمنٹ بھی بحیثیت مُربّی بنے*

حصّہ دوم باب ۵

خزانے سے وظیفے دیتی ہے۔ لیکن اگر شبنم سے کنویں بھر سکیں تو ان وسائل سے تعلیمی ضروریات بھی پوری ہو جائیں۔ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہے۔ انگلستان جیسے بیدار اور ترقی یافتہ ملک میں جہاں گورنمنٹ اور قوم کی جانب سے بے شمار روپیہ عوام کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے نادار طلبہ کو تعلیم میں خاص دقتیں پیش آتی ہیں۔ اور وہاں بھی زیادہ تر والدین ہی کو تعلیمی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان انسان ہے اور ذاتی منفعت کا شوق محبت وہمدردی کے جذبات پر غالب ہے ممکن نہیں کہ تعلیم و تربیت پر روپیہ ایسی بے تکلفی سے خرچ کیا جائے جیسا کہ پرورش حیوانات و باغات اور تعمیر عمارات و خرید آلات پر۔ اور وجہ صرف وہی ہے، جو بیان کی گئی کہ انسان آزاد ہے اور اپنے فعل کا مختار۔ وہ اپنی محنت بمعاوضہ اُجرت فروخت کر دیتا ہے۔ مگر خود اپنی ملک رہتا ہے۔ مشین کی طرح وہ محنت خریدنے والے کے ہاتھ خود نہیں بک جاتا۔ اور نہ اس کی محنت پر خریدار کو مشین کے کام کی طرح پورا اقتدار۔ پس جب مزدور اس قدر آزاد اور مختار ٹھیرا تو اس کی تعلیم و تربیت میں منفعت کی غرض سے روپیہ لگانا بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی کسان جس کو زمیندار حسب شرائط پٹہ بلا معاوضہ ہر وقت بے دخل کر سکے۔ اپنے کھیت کی درستی میں لاگت لگائے۔

مذکورۂ بالا خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت میں سخت دقت پیش آرہی ہے۔ اس کا زیادہ تر دارومدار والدین کی کوشش پر ہے۔ مگر بہت سے بچے کم عمری میں والدین کے ظل عاطفت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بہت سے والدین اس قدر نادار ہوتے ہیں کہ تعلیم تو درکنار اولاد کا روٹی کپڑا ہی بار گراں ہوتا ہے۔ بہت سے والدین اس قدر بے مہر اور دولت پرست ہوتے ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ صرف کرنا گوارا نہیں کرتے۔ بہت سے اس قدر کم عقل اور ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں کہ محبت

میں اندھے ہو کر اولاد کو بے جا صرف سے ناکارہ اور بد اطوار بنا دیتے ہیں اور جو تھوڑے باقی بچے وہ البتہ دنیا کے حالات سے باخبر، اولاد کے سچے بہی خواہ اور روپیہ کے صحیح مصرف سے واقف ہوتے ہیں۔ اپنی اولاد کو خاص اہتمام سے تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا میں عزت و ناموری کی زندگی بسر کر سکے۔

ادھر والدین کی یہ لاچاری و بے اعتدالی، ادھر عوام کی وہ بے تعلقی اور عدم توجہی اور اس کا صریح نتیجہ تعلیم و تربیت کی قلت و خامی۔ کیا معلوم کتنے ذہین، طباع اور ہونہار بچے جو قوم و ملک بلکہ دنیا کے سرمایۂ ناز و افتخار بن سکتے تھے حالات نامساعد کا شکار ہو کر اور اپنی زندگی گمنامی و تلخ کامی میں کاٹ کر خداداد قوتوں اور صلاحیتوں کا بیش بہا خزانہ دل و دماغ میں لئے زمین کے نامعلوم تنگ و تاریک غاروں میں پڑے سوتے ہیں سبحان اللہ میر انیس مرحوم نے اس نامرادی کو کیا خوب بیان فرمایا ہے ؎

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جاتے | کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں سماتے | غنچے بہت ایسے ہیں کہ کھلنے نہیں پاتے

(ب) تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کرنے میں ایک اور امر بھی مانع ہوتا ہے وہ یہ کہ اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کے واسطے بہت سا وقت اور صرف درکار ہے۔ پھر اگر کوشش میں کمی رہ جائے یا استعداد ناقص ہو یا حالات نامساعد پیش آجائیں تو وقت اور صرف سب اکارت جاتا ہے۔ چنانچہ اس وجہ سے بہت سوں کی تو ہمت ہی نہیں بندھتی اور کوشش کرنے والوں میں بھی صرف تھوڑے سے تو منزل مقصود تک پہنچتے ہیں باقی سب تھک کر منزل بمنزل پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر خوش قسمتی سے کوئی بصد کوشش بہت سا بیش بہا وقت اور مقدار کثیر صرف کر کے کمال حاصل کرتا ہے اور کسی کام کے قابل بنتا ہے تو اس کی زندگی کا ایک لمحہ اعتبار نہیں۔ خواہ سالہا سال قابلیت سے فیض پہنچائے۔

حصہ دوم فائدہ اٹھائے۔ خواہ اس کو اچھوتا اپنے ساتھ قبر میں لے جائے۔

باب ۵ پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

گویا انسانی تعلیم و تربیت مثل ایک لب دریا کاشت کے ہے کہ جس کے طغیانی سے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہر لمحہ لگا رہتا ہے۔

(ج) محنت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مزدور سے جدا نہیں کی جاسکتی یہاں محنت درکار ہوتی ہے مزدور کا اپنی ذات سے وہاں موجود ہونا لازمی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر عاملین پیدائش یعنی زمین و اصل اکثر اپنے مالک سے جدا رہتے ہیں۔ زمیندار کی زمینیں بہت سے گاؤں میں مصروف کاشت رہتی ہیں۔ اور زمین تو غیر منقولہ ہے۔ اصل کو دیکھئے کہ وہ مالک سے جدا رہ کر ہر جگہ کام کر سکتا ہے۔ ان یوروپینوں کا کروڑہا روپیہ کا قیمتی اصل ہندوستان میں لگا ہوا ہے جنھوں نے سوائے نقشہ کے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ یہاں یہ جتانا ضروری ہے کہ محنت مزدور سے جدا نہیں ہو سکتی لیکن محنت کے اثرات بہت دُور دُور تک پھیل سکتے ہیں۔ مثلاً وزیرِ ہند انڈیا آفس لندن سے اور ویسرائے دہلی یا شملہ بیٹھے بیٹھے اپنے محنت کا اثر تمام ہندوستان پر پھیلاتے رہتے ہیں۔ اخبارات اور ٹیلیفون ان کی تحریر اور تقریر کو بھی ملک کے ہر گوشہ تک پہنچا سکتے ہیں۔ مگر خاص محنت ان کی ذات سے وابستہ ہے جسم سے سایہ جدا ہو سکتا ہے مگر مزدور سے محنت جدا نہیں ہوتی۔ اس خصوصیت کا اثر محنت کی مقامی نقل و حرکت پر بہت پڑتا ہے۔ کبھی گھر کی محبت کبھی آمد و رفت کی دقت۔ کبھی نئے ممالک کی آب و ہوا کی ناموافقت کبھی زبان و معاشرت کی ناواقفیت۔ کبھی خریدار محنت یعنی آجر کی سخت گیری و تند مزاجی۔ کبھی خود پیشہ کی ناخوشگواری۔ اور اسی قسم کی بہت سی مزاحمتیں نقل محنت میں پیش آتی ہیں اور مزدور وطن نہ چھوڑنے کی وجہ سے دُور افتادہ مقامات میں جانے اور اعلیٰ اُجرت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ محنت نہ تو مانند زمین قطعاً غیر منقولہ ہے اور نہ اصل کی مانند سریع الانتقال بمنقولہ ضرور ہے مگر مزدور کے ساتھ ساتھ۔ اور برخلاف زمین و اصل کے مزدور کی ذات سے جدا نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ خصوصیت محنت کی نقل و حرکت میں مزاحم ہوتی ہے۔

(د) مزدور کی چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اس کو محنت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں اس کی دو وجہ ہیں۔ اول تو وہ اس قدر خوش حال نہیں کہ کچھ روز بھی بیکار بیٹھ کر فراغت اور اطمینان سے بسر اوقات کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ بیکاری کے نام سے وہ سہم جاتا ہے۔ اکثر کی تو حالت یہ ہے کہ کچھ کما یا تو روزی ورنہ روزہ۔ دوسرے اگر مزدور کو کچھ استطاعت بھی ہو تو بیکار پڑے رہنے سے اس کی کاریگری اور مہارت کو بٹہ لگتا ہے۔ ہاتھ میں وہ پہلی سی صفائی اور تیزی نہیں رہتی۔ کام سے دل اچاٹ سا ہو جاتا ہے۔ مزدور اگر کام چھوڑ بیٹھے تو اس کی حالت بھی کچھ دنوں میں ایسی ہو گی جیسے کہ بے کار پڑے پڑے کسی مشین کو زنگ لگ جاتا ہے۔ گویا مزدور کے واسطے یہ ضروری اور مفید ہے کہ وہ اپنے کام سے لگا رہے۔ البتہ کبھی کبھی آرام لینا دوسری بات ہے۔ اس خامی کا نتیجہ یہ ہے کہ آجر کے مقابل مزدور کمزور بلکہ بے بس ہو جاتا ہے اجرت کے معاملہ میں پوری آزادی سے ردّ و قدح نہیں کر سکتا۔ جو کچھ ملتا ہے اکثر اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ البتہ کچھ روز سے اس فرقہ میں جان پڑنی شروع ہوئی ہے اور خصوصاً انجمنہائے اتحاد مزدوران مزدوروں کی بہت حمایت کر رہی ہیں۔ اور ان کی مالی حالت سُدھارنے کی تدابیر نکالنے میں بہت سرگرمی سے مصروف ہیں۔ چنانچہ ہم آگے چل کر اس واقعہ کی مختصر تفصیل پیش کریں گے۔

(س) زراعت حسب قوانین قدرت پیدا ہوتی ہے۔ مشین بھی ایک معمول پر چلتی ہے مگر محنت کی حالت جداگانہ ہے۔ اس میں مزدور کی مرضی کو بھی دخل ہے۔ مزدور اگر چاہے تو باوجود

حصّہ دوم
باب۵

تاکید و نگرانی کام سُست کرے۔ بگاڑ دے، اور چاہے تو بحالت آزادی کام جلد سے جلد اور عمدہ سے عمدہ کر دکھائے۔ مزدور کو سرزنش اور جرمانہ کے ذریعہ سے قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ترقی اور انعام کے لالچ سے کام کی ترغیب دی جاتی ہے۔ لیکن فی نفسہ مرضی کا عمل محنت سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ "گندم از گندم بروید جو زجو"۔ سنگر مشین ایک سا بخیہ کرتی ہے۔ لیکن وہی درزی ایک ہی کپڑے کا عمدہ سے عمدہ اور خراب سے خراب لباس تراش سکتا ہے۔ گویا محنت مزدور کی مرضی کے تابع ہے۔ چنانچہ مقولہ ہے کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش"۔ اور یہی وجہ ہے کہ قانوناً اس کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔

(ص) محنت پر بھی قدرت نے وقت کی پابندی کئی طرح پر لازم کر دی ہے۔ اوّل تو طوالت عمر کا حال سنیئے۔ یورپ کی مردم شماری کے تازہ ترین اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ ایک چہارم بچے چھ سال کی عمر تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ ان کو شامل کر کے سولہ برس کی عمر تک مرنے والوں کی تعداد نصف کے قریب ہوتی ہے۔ ایک تہائی ۵۴ اور ۶۰ سال کے درمیان عمر پاتے ہیں اور ۶۵ سال سے تجاوز کرنے والوں کا اوسط صرف ایک فی صدی پڑتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ اس مختصر عمر کا کتنا حصّہ محنت میں صرف ہوتا ہے۔ ابتدائی چھ سات سال تو بچپن کے کھیل کود کی نذر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تعلیم شروع ہوئی اگر استعداد موزوں ہو کوشش کافی کی جائے، دیگر حالات بھی مساعد ہوں تو آج کل کم از کم بیس سال اور زیادہ سے زیادہ تیس سال کی عمر تک تکمیل تعلیم و تحصیل فن سے فارغ ہو کر انسان کام کے قابل بنتا ہے۔

مزدور کل تو ہے نہیں کہ رات دن چلے اور تھکنے کا نام نہ لے۔ کھانا، پینا، سوتا، سیر تفریح اس کی قیام صحت کے واسطے لازمی ہیں۔ اگر قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کریگا جلد سزا پائے گا اور پچھتائے گا۔ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بالعموم صحت کو مضرت پہنچائے بغیر تندرست انسان آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ محنت نہیں کر سکتا ہفتہ وار یک روزہ تعطیل اور

حصۂ دوم
باب ۵

متفرق تعطیلات کا مجموعہ تین ماہ اور بعض محکموں مثلاً تعلیمات میں چار مہینے سے بھی زیادہ ہوتا ہی۔ علالت اور اتفاقی ضروریات کی رخصتوں کا اوسط بھی سال میں ایک مہینے سے کم نہیں پڑتا۔ مذکورۂ بالا حساب سے کل وقت جو جزءً جزءً محنت میں صرف ہوتا ہی سال میں ڈھائی ماہ کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتا بلکہ بعض پیشوں میں اس سے بھی کم۔ بیس پچیس سال کی عمر میں لوگوں نے کام شروع کیا۔ پچاس سال کے بعد سے ضعف پیری کے ہاتھوں جلد ناکارہ بن کر بحالت ملازمت مستحق پنشن قرار پاگئے۔ ورنہ اندوختہ پر بیکاری کی زندگی بسر کرنے لگے؟

غرضکہ اوقات کی مذکورۂ پابندی نے محنت کی مقدار بہت گھٹادی اور معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ صرف محنت کی بے شمار راہیں پیدا ہوگئیں۔ مگر بایں ہمہ محنت ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہی۔ اور بیکار مزدور متلاشی روزگار نظر آتے ہیں۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں باعث تشویش بنا ہوا ہی۔ اُجرت (۲/۱۰) اور ترقی آبادی (۲/۱۳) کے تحت میں ہم بھی اس سے مزید بحث کریں گے۔

کارکردگی کا مفہوم

۴۔ سخت محنت خواہ جسمانی ہو یا دماغی بلا اکراہ و تکان دیر تک برداشت کرنا، کام میں سمجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور ہوشیاری دکھانا۔ غرضکہ طاقت، چُستی، استقلال، تندہی اور ہوشیاری جیسے صفات جو عمدہ مزدور کا باعث امتیاز ہوتی ہیں مجموعۃً کارکردگی کہلاتی ہیں۔ مہارت اور کارکردگی دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جو قابلیت کسی ایک کام سے مخصوص ہو مثلاً جراحی، مصوری، انجینیری، یا درزی کی فیشن ایبل تراشش مہارت کہلاتی ہی۔ مگر جو صفات ہر ایک کام کی عمدگی کے واسطے عموماً لازمی ہیں وہ کارکردگی میں شامل ہیں۔

کارکردگی کا کسی قوم کی عام جسمانی و دماغی صحت اور اخلاقی و معاشرتی حالت سے نہایت قریبی تعلق ہی۔ کارکردگی محنت کی جان اور قومی ترقی کا سنگِ بنیاد ہی۔ چنانچہ جاپان

حصہ دوم کا موجودہ عروج اسی کارکردگی کی تازہ ترین تفسیر ہی۔ اس کی سی اور خود مختاری آج دنیا میں
باب ۵ کتنے ملکوں کو میسر ہی؟ رہی معاشی حالت، ہندوستان میں جو مصنوعات خارجہ کی سب سے بڑی منڈی ہی، وہ جرمنی کا جانشین ہوتا جاتا ہی۔ کچھ نہیں تو ۶۰ فیصدی مصنوعات ہندوستان میں جرمنی سے آتے تھے۔ اور اگر آج کسی دکاندار سے دریافت کیجئے کہ فلاں چیز موجود ہی تو اکثر جواب ملتا ہی کہ جرمنی سے تو آمد بند ہوگئی۔ البتہ جاپان سے ابھی آئی ہی۔ لیکن بعینہ جرمنی کی سی اور قیمت اس سے بھی کم۔ ہمارا باتیں بنانے والا اور کام چور ہندوستان جس نے سودیشی کی منادی سے آسمان سر پر اُٹھالیا تھا۔ آج موقع ملنے پر اپنا گھر بار کیوں نہیں سنبھالتا۔ کیوں نہیں مُردہ صنعت و حرفت میں جان ڈالتا۔ کل تک جرمنی کا محتاج تھا۔ کل کو جاپان کا دست نگر ہو جائے گا۔ ہم نہیں کہتے کہ وہ نعوذ باللہ کُن فَیَکُون کر دکھائے۔ مگر یہ اصرار بیجا نہ ہوگا کہ وہ ہاتھ پیر ہلائے۔ پیداوار خام پر نظر ڈالے اور موجودہ علم و آلات سے جو چیزیں تیار کر سکے، زیادہ نہیں تو تھوڑی ہی تیار کرے۔ مُحبّانِ وطن اور حامیانِ قوم کے امتحان کے واسطے خدا نے ہندوستان کو یہ موقع دیا ہی تاکہ خلوص و نمایش، دلسوزی و خود غرضی، نیک نیتی و فتنہ انگیزی، کہنے اور کرنے میں پورا پورا فرق ظاہر ہو جائے۔ معاشی حالت کی اصلاح اور ترقی کا اس سے بہتر موقع دوبارہ ملنا دشوار ہی۔ جبکہ قوی تر مقابلوں سے میدان خالی ہی۔ اگر سُودیشی کے رواج میں دل توڑ کر کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ بیکاری و افلاس کا تسلّط ہندوستان سے نہ اُٹھ جائے! خدا نہ کرے کہ اغیار طعن دیں ؎

بہت شور سُنتے تھے پہلو میں دل کا — جو چیرا تو اِک قطرۂ خون نکلا

لوازم ۵۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا حالات خاص طور پر کارکردگی کی ترقی کے واسطے
کارکردگی موزوں اور مساعد ہیں۔

(۱) سب سے مقدم آب و ہوا اور موسم کا اثر ہی۔ انتہا درجہ کی گرم اور سرد آب وہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا، کارکردگی پر مضر اثر ڈالتا ہی۔ منطقہ حارہ میں سخت محنت خصوصاً جسمانی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاسکتی اور محنت کی وہاں ضرورت بھی کم ہی۔ بوجہ کثرت نباتات زمین کی پیداوار سے بلا مشقت غذا حاصل ہو جاتی ہی۔ گرمی میں اتنا کپڑا کافی کہ بدن ڈھک جائے گھنے درختوں کے ٹھنڈے سایہ سے زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہی۔ مختصر چیز بست رکھنے کو ایک جھونپڑا کافی۔ گرم اور خشک ممالک کی زندگی بھی نہایت سادہ ہوتی ہی۔ بوجہ قلت پیداوار۔ وہاں کی ضروریات بھی مایحتاج زندگی سے آگے کم بڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ منطقہ حارہ کی معاشی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آتی ہی اور غالباً کبھی قابل لحاظ تغیر واقع نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح پر منطقہ باردہ میں بوجہ شدت سردی و کثرت برف، نہ زمین سے پیداوار ہوتی ہی، نہ باشندوں کو محنت کا موقع ملتا ہی۔ ہفتوں جھونپڑوں میں بند رہ کر خدا جانے جانوروں کے گوشت پر کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہی کہ ریگستان اور برفستان کبھی زراعت، صنعت و حرفت، تجارت اور دیگر معاشی ترقیات کے مرکز بن سکیں۔ موسم جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی کے واسطے مضر ہی۔ ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں۔ کبھی تراقے کی گرمی، کبھی کڑاکے کا جاڑا۔ اور کبھی موسلا دھار بارش۔ طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پاتی کہ دوسرے کی پڑتی عاید ہو جاتی ہی۔ اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوئی کہ تیسرا موسم آپہنچا۔ غرضکہ تمام سال اسی ردوبدل میں ختم ہو جاتا ہی۔ طبیعت کو کبھی سکون اور یکرنگی میسر نہیں آتی۔ نتیجہ کمزوری اور اضمحلال ہوتا ہی۔ چنانچہ علاوہ دیگر اسباب کے تغیرات موسم بھی ہندوستانیوں کی آرام طلبی کا باعث خیال کیے جاتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ ہی کہ تبدیلی موسم کے زمانہ میں کم از کم ہفتہ عشرہ طبیعت کُند اور کسلمند ضرور رہتی ہی۔ اور بارش و سرما کے وسطی زمانہ میں بوجہ گرمی و

حصّہ ۲ رطوبت ملیریا اور ہیضہ اکثر مقامات میں بلا ناغہ ہر سال پھیلتا ہی۔ چونکہ طبیعت پورے طور پر عادی
باب ۵ نہیں ہوتی، ہر موسم کی شدّت سے مغلوب ہو جاتی ہی۔ جون جولائی میں ہاتھ سے پنکھا اور گلاس
نہیں چھوٹتا۔ ہر شخص کسی تاریک کوٹھری میں دن بھر خاموش پڑا رہنا پسند کرتا ہی۔ صبح
کی ٹھنڈ ٹھنڈ میں سب ضروری کام کر لیے جاتے ہیں، یا غروب آفتاب کے قریب لوگ
باگ گھر سے نکلتے ہیں۔ دوپہر کو شہر بھر میں ہُو کا عالم ہوتا ہی۔ بارش میں سوائے زراعت
کے کُھلے میدان کے اکثر کار و بار بند ہو جاتے ہیں۔ آب و ہوا کی خرابی محنت کرنے سے مانع
ہوتی ہی۔ البتہ جاڑے کے چار مہینے کام کاج کے واسطے نہایت موزوں ہیں۔ اسی موسم
میں عدالتیں، دفتر، اسکول، کالج، فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں اور بازار آباد اور
مصروف کار نظر آتے ہیں۔

اس کے برعکس منطقہ معتدل خصوصاً شمالی حصّہ کے ممالک میں خوشگوار آب و ہوا اور
یک رنگ موسم بدن کو چُست اور طبیعت کو قوی و بشّاش رکھتے ہیں۔ نہ پسینہ آئے، نہ بدن
ٹھٹھرے۔ بہت دیر تک محنت کی تکان محسوس نہیں ہوتی موسمی تغیرات نہ طبیعت پراگندہ
کریں نہ محنت میں ہارج ہوں۔ سال بھر کار و بار ایک رفتار پر چلتا ہی پیداوار زمین کی نہ اسقدر
کثرت کہ آدمی قناعت کر بیٹھے۔ نہ اس قدر قلت کہ لاچار بن بیٹھے۔ بلکہ اس کی مقدار ایسی
مناسب ہوتی ہی کہ عمل پیدائش میں محنت اور اصل کو بھی حصّہ لینے کا کافی موقع مل جاتا ہی۔
حاصل کلام یہ کہ منطقہ معتدل کارکردگی کی نشو و نما اور معاشی ترقیات کے واسطے بغایت موزوں
ہی۔ منطقہ حارہ کمتر اور منطقہ باردہ سب سے کم۔ چنانچہ واقعات اس اصول پر بالاتفاق شاہد ہیں۔

(ب) آب و ہوا اور موسم کا اثر کم و بیش تمام ضروریات زندگی پر پڑتا ہی۔ سب سے
اوّل خوراک کو لیجیے کہ وہ زمین سے پیدا ہوتی ہی۔ اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہی پیداوار زمین
کی نوعیت بیشتر آب و ہوا اور موسم سے وابستہ ہی۔ ہندوستان کا آم افغانستان میں نہیں

پھلتا اور نہ کاشمیر کا سیب دکن میں۔ برار کی عمدہ روئی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہوتی حصۂ دوم
جوٹ کی کاشت مشرقی بنگال تک محدود ہے۔ کھجور ریگستان کی نعمت ہے۔ اور ایسا ہی حال باب ۵
تمام نباتات کا ہے۔ ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف
بعض میں مادہ نشو و نما بہت زیادہ۔ بعض میں متوسط اور بعض میں بہت کم۔ اسی طرح پر
بعض مفید اور معاون صحت ہیں اور بعض مضر اور مخرب۔ افغانستان میں میوے کی وہ کثرت
کہ کھائے بن نہیں پڑتا۔ اور قریب ہی راجپوتانہ میں جوار باجرہ نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے
اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالت جسمانی سے صاف ظاہر ہے۔ مدراس
اور بنگال کی غذا عام طور پر چاول مچھلی ہے۔ یہ دونوں پانی کی مقدار بڑھا کر خون کو رقیق
اور اس کی حرارت کو کم کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ گندھک کا جزو غالب ہے دماغ کو خاص طور
پر تقویت پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ بنگالی نہایت ذہین و طباع دیکھنے میں بھی جسیم مگر جسمانی محنت
سے کمتر مانوس ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے پنجاب کی خوراک گیہوں اور گوشت دونوں چیزیں
خون میں فولادی ذرات پیدا کر کے حرارت بڑھاتی ہیں جسم کو قوی کرتی ہیں۔ چنانچہ
پنجابی لوگ ذہین تو کچھ ایسے نہیں، مگر اکھڑ، غصیل، جفاکش خاص طور پر ہوتے ہیں۔ ترشی
اور منشیات کی کثرت سے دکن میں اکثر لوگ ضعیف و ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ عرب دیکھنے میں
کیسے دبلے پتلے مگر چونکہ اُن کی غذا عموماً گرم خشک ہوتی ہے اُن کے پٹھے فولاد جیسے مضبوط
اور دل شیر کا سا قوی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سرد و تر چیزوں کی کثرت استعمال سے
بنیوں کے جسم خمیر کے مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ صحت و قوت
کا دار و مدار خاص طور سے خوراک پر ہے اور خوراک مقامی آب و ہوا اور موسم سے مخصوص
ہوتی ہے۔ پس آب و ہوا کارکردگی پر بذریعہ خوراک بھی قوی اثر ڈالتی ہے۔ اور کسی ملک
میں عمدہ نباتات کی کثرت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔

حصۂ دوم
باب ۵

اس لحاظ سے ہندوستان خاص طور پر خوش قسمت نظر آتا ہے۔ معدودے چند عمدہ نباتات ایسے ہیں جو کم و بیش یہاں پیدا نہ ہوتے ہوں۔ آم، امرود، اور خربزہ جیسے لاجواب پھل اس قدر بکثرت پیدا ہوتے ہیں کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی شخص ان سے محروم رہتا ہو۔ واقعہ ہے کہ جو پھل اور میوے فصل کے زمانہ میں یہاں کے غربا بھی جی بھر کر کھا لیتے ہیں اُن کے چکھنے کی تمنا دوسرے ملکوں کے اچھے اچھوں کو مدّتوں بےچین رکھتی ہے۔ ہندوستان کے آموں کی تعریف میں ہم سے ایک تازہ ولایت پروفیسر نے نہایت صاف گوئی سے اعتراف کیا کہ آم تو ولایت میں بھی شیشوں میں بند دیکھے تھے اور اُن کے ذائقے کا دل میں اشتیاق بھی بہت تھا مگر کبھی خریدنے کا موقع نہ ملا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ تمام دنیا کے کاشتکاروں میں ہندوستانی کسان بہترین غذا کھاتا ہے۔ اُس کے دودھ دہی جو چنے کی روٹی اور مکّا یا جوے کے ملیدہ کے سامنے دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ اور درحقیقت اگر معدے میں قوت ہاضمہ کافی ہو تو یہ چیزیں قیمتی حلووں سے کہیں بڑھکر مقوی بدن ہیں۔ یورپ میں اکثر کاشتکاروں کی مُروّجہ غذا اُبلے ہوئے آلو اور پیاز ہے۔ جس کو نمک مرچ ملاکر وہ بہت رغبت سے کھاتے ہیں۔

ریل اور جہازوں نے ہر ایک پیداوار تمام دنیا میں پھیلا دی ہے۔ گوشت جیسی جلد سڑنے والی چیز کو طرح طرح کے مصالحہ لگا کر اور پھل جیسی گلنے والی چیز کو شہد و شراب میں ڈال کر ہزاروں میل لے جاتے ہیں اور مہینوں رکھ کر کھاتے ہیں۔ علم نباتات کے زور سے غیر ملکوں کی چیزیں بھی بو سکتے ہیں۔ چنانچہ ولایت میں گرم ملکوں کے پھل اور ترکاریاں شیشے کے مکانات میں عارضی گرمی کی مدد سے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں سے قدرتی پیداوار کی سی کثرت کہاں ہو سکتی ہے۔ صرف اُمرا اور دولت مند اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں۔ عوام کو تو خواب و خیال میں بھی وہ چیزیں مُیسّر نہیں آتیں۔

(ج) خوراک کے بعد لباس اور مکان قابلِ غور ہیں۔ سرد ممالک میں ان کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کافی میسر نہ آسکیں، تو بیماری کا اندیشہ قوی ہو جاتا ہے۔ گرم ممالک میں کپڑا صرف بقدر ستر پوشی درکار ہوتا ہے۔ اگر گھنے درختوں کی کثرت ہے تو اُن کے سایہ میں جنت کا لطف آتا ہے ورنہ دُھوپ سے بچنے کے لیے جھونپڑے کافی ہیں۔ اُن کو سرد ملک والوں کے برابر محفوظ اور مضبوط مکان کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر موسم معتدل ہو تو لباس و مکان اس قدر لابد نہیں کہ اگر میسر نہ آسکیں تو جان پر آبنے اور صحت تباہ ہو جائے۔ جب بارش نہیں ہوتی اور سردی نہیں پڑتی تو بہت سے محتاج اور مفلس ہمارے قصبوں اور شہروں کی سڑکوں کے کنارے اور دھرم شالوں مسافر خانوں کے پختہ چبوتروں پر خوابِ راحت کا وہ لطف اُٹھاتے ہیں جو امرا کو نرم بستروں پر خواب میں بھی میسر نہیں آسکتا۔ اُن کو نہ بچھونے کی ضرورت نہ اُوڑھنے کی۔ وہی ایک کپڑا جو جسم ڈھانکے ہوئے ہے ہر حال میں کافی۔ غریب لوگ بھی مکان اور لباس میں زیادہ صرف کرنے پر مجبور نہیں۔ دھوتی کرتا اور ٹوپی، وہ بھی اونی نہیں بلکہ سستے گاڑھے مارکین کی ہمارے مزدوروں کا ضروری لباس اور ایک چھوٹا سا چھپر کا کچا مکان اُس کی آرام گاہ ہے۔ جوتا وہ صرف بیاہ شادی یا عید تیوہار کو پہنتا ہے۔ مگر چونکہ محض تکلف ہے راستہ بھر ہاتھ میں لٹکا کر لے چلتا ہے اور صرف منزل مقصود کے قریب اُس کو زیر باری کی تکلیف دینا گوارا کرتا ہے۔ سرد ملکوں کی حالت اس سے مختلف ہے۔ وہاں پر جن کا کوئی ٹھکانا نہیں اپنی بھیک میں کم سے کم ایک پیسہ بچا لیتے ہیں۔ تاکہ کرایہ دے کر کسی پینی بیڈ میں رات بسر کرسکیں۔ ورنہ شدت سردی سے ٹھٹھر جانا یقینی ہے۔ اب اِن پینی بڈوں کی کیفیت سُنئے۔ یہ عموماً زمین دوز کوٹھریاں یا تہ خانے ہوتے ہیں جن میں پیال جیسی کوئی گھاس بچھی ہوتی ہے۔ اکثر میں بخوف سردی ہوا کی آمد و رفت کے واسطے کافی دریچے بھی نہیں

ہوتے۔ شام کو صدہا غریب بمبئی بیڈوں میں کھچا کھچ بھر جاتے ہیں۔ بوڑھے، بچے، جوان مرد اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ سب اُسی گھاس پر پال کے آموں کی طرح ایک دوسرے سے اڑ کر سو رہتے ہیں۔ اور صبح کو پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ خیال کرو کہ ہمارے ملک کے غربا کی رات بمقابلہ ان کے کس قدر راحت سے کٹتی ہے اور اس فرق کا باعث آب وہوا اور موسم نہیں تو کیا ہے۔ اب مزدور کا حال سُنیے کہ تمام جسم کو گرم اونی لباس سے ڈھانکنا اُس کے واسطے لازمی ہے نہ صرف جوتا بلکہ اونی موزے بھی سردی سے محفوظ رہنے کے واسطے ضروری ہیں۔ مکان بھی اس قدر پختہ ہونا چاہیے کہ برف باری کا مقابلہ کر سکے اور سرد ہوا کو پورے طور پر روکے۔ غرضکہ لباس ومکان جن کا صحت سے قریبی تعلق ہے آب وہوا اور موسمی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔ کہیں وہ لابدہ ہوتے ہیں اور کہیں راحت کا سامان خیال کیے جاتے ہیں۔ کہیں اُن پر کمائی کا معقول حصہ صرف کرنا پڑتا ہے اور کہیں بہت کم لیکن ہر ملک کی ضروریات کے مطابق کافی مکان ولباس ملنا کارکردگی کے واسطے ضروری ہے۔ اگر کمی ہوگی تو صحت کمزور، نشو ونما ادھوری اور کارکردگی ادنیٰ درجے کی ہو جائے گی۔

(د) اُمنگ آزادی اور سیاحت بھی کارکردگی کے لیے ازحد موزوں وموافق ہیں۔ اُمنگ تو تمام ترقی کا منبع ہے۔ آزادی کام کو آسان اور خوشگوار بنا دیتی ہے۔ علم النفس سے ثابت ہے کہ آدمی جو کام شوق سے کرتا ہے اُس میں تکان بہت کم ہوتی ہے۔ چنانچہ تفریح کھیل کود اور مزدوری کے کاموں کا طبیعت پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بطور چہل قدمی چار میل جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ کسی ضروری کام سے دو میل جانا۔ غلام جو کوڑے کے ڈر سے کام کرتا ہے اور آزاد مزدور جو کمائی کے شوق میں جان کھپاتا ہے ان کی کارکردگی میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے۔ رہی سیاحت اس سے اوّل تو معلومات میں اضافہ، خیالات میں وسعت اور حوصلے میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ ہر قسم کے حالات آنکھ سے دیکھ کر

انسان بُرائی بھلائی اور اُن کے اسباب سمجھنے لگتا ہے چنانچہ سفر تعلیم کا لازمی جزو مانا جاتا ہے انسان کتنا ہی کتابی علم حاصل کرے جب تک سفر کے تجربوں اور مشاہدات سے اپنے علم کی تصدیق اور اصلاح نہیں کرے گا اُس کی تعلیم ناقص رہے گی اور وہ تالاب کے مینڈک سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہوگا۔

دوسرے ایک عجیب بات یہ ہے کہ وطن میں انسان کی ہمیشہ نسبتہً کم قدر کی جاتی ہے ہندی مثل ہے "گھر کا جوگی جوگنا اور آن گاؤں کا سِدھ" اسی مضمون کی ضرب المثلیں تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور کسی ملک و قوم کی خصوصیت نہیں۔ احباب و اعزا پر قابلیت و کمال کا اثر اور رُعب اتنا نہیں پڑ سکتا جتنا کہ اغیار اور ناواقف لوگوں پر۔ چنانچہ بالعموم بڑے بوڑھے ترقی یافتہ نوجوانوں کو جتایا کرتے ہیں کہ آپ پڑھ لکھ کر قابل بن گئے تو اوروں کے لیے ہماری نظر میں تو وہی ہو جو بچپن میں تھے۔ تمھارے بھولے پن اور ناسمجھی کی باتیں سب یاد ہیں۔ دوست احباب کو بھی ترقی و امتیاز کا اثر ناگوار معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کسی کا قدیم سطح سے بلند ہونا کم از کم اپنے مقابلے میں ناپسند کرتے ہیں۔ ان وجوہات سے قابل آدمی اپنے وطن میں زیادہ نہیں اُبھر سکتا اور غیر جگہ ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وکیل طبیب جیسے پیشہ ور جن کو حُسنِ ظن اور رُعب کی ضرورت ہوتی ہے ہمیشہ وطن سے دُور جا کر کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر اور قصبے کے معزز پیشہ ور جماعتوں میں سربرآوردہ لوگ اکثر باہر والے ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وطن میں بھی اُن کو یہی ترقی و امتیاز نصیب ہو سکتا تو احباب و اعزا کو چھوڑ کر دور کیوں بستے۔ سفر کے متعلق عربی کے مشہور مقولے ہیں "السفر وسیلۃ الظفر" و "السفر کالسقر"۔ انقلابات زمانہ سے سفر نے ظفر کے تو صد ہا نئے راستے نکال لیے۔ مگر اب وہ سقر نہیں رہا اور

حصہ دوم باب ۵

قیام سے بدرجہا پُرلطف و راحت رساں بن گیا۔

ہندوستان میں صدہا برس کی فرقہ بندی اور مذہبی رسم و رواج نے اُمنگیں اس درجہ پامال کیں کہ ان کے سرچشمے اٹ گئے۔ معاشی آزادی سلب کرتے کرتے اس کی خواہش و خیال دل سے محو کر دیئے۔ ہر ایک کا پیشہ اور اس کی ترقی کا معیار نسلاً بعد نسل کے واسطے مقرر کر دیا کہ اس سے سرِمو تجاوز کسی طرح ممکن نہ تھا۔ رہا سفر آج تک پابند مذہب ہندوؤں کو سفر میں بعید دقتیں پیش آتی ہیں۔ البتہ جو لوگ مذہب کو پس پشت ڈال چکے ہیں ان کا ذکر نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کچھ خداداد استعداد و ذہانت قدیم استبدادی نظام سے ضائع ہوتی رہی۔ البتہ کچھ دنوں سے جو جدید اثرات نے پُرانی بندشیں توڑ ڈالیں تو ادنیٰ طبقوں میں کچھ جان پڑنے لگی۔ ان کو اپنے انسانی حقوق یاد آنے لگے۔ ان کو اپنی استعداد کا پتہ لگتا جاتا ہے۔ آزادی کی ہوا سے ان کے دل میں بھی ترقی کی پھُریری آ گئی۔ ادنیٰ طبقوں کی بیداری نہ صرف خود ان کو فائدہ پہنچائے گی بلکہ اعلیٰ طبقوں کی غیرت و حمیت پر بھی جو بجھ ہو گئی ہے۔ تازیانہ لگا کر خواب خرگوش سے بیدار کرے گی اور سب کو شاہراہ ترقی پر لے چلے گی۔

(ر) عام معاشرتی اور اخلاقی حالت کا بھی کارکردگی پر نہایت اہم اثر پڑتا ہے صحبت کا اثر مشہور ہے۔ خربزہ کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اور پھر بچوں کی طبیعت موم جیسی نرم ہوتی ہے۔ جس سانچہ میں چاہو ڈھال لو۔ پس جس فرقہ کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جہد پرور ہے وہ لوگ بالعموم بلند خیال عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی مرکزوں کے مصروف کار اور پس ماندہ قصبوں کے کاہلی پسند باشندوں کی حالت کے موازنہ سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ہندوستان کے سکون پسند نووارد کو انگلستان کی ہلچل سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ جسے

دیکھو چیونٹی اور شہد کی مکھی کی مانند اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف ہی۔ لمحہ لمحہ جان سے زیادہ عزیز ہی ہفتہ میں ایک روز اتوار کا آرام کے واسطے مخصوص اور اس روز کاروبار قانوناً ممنوع ورنہ کام کے شوق میں لوگ صحت قربان کر گزرتے۔ ہندوستان میں اس گرمجوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا اور نووارد یورپین کو یہاں کی سہل انکاری افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کچھ کم عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اور کس کو انکار ہو سکتا ہی کہ شہر شہر اور قصبہ قصبہ میں بہبودی کی اُمنگ اور کاروبار کا شوق پیدا کرنا ہندوستان کی ترقی کا پہلا قدم ہی۔

اخلاق و عادات کا اثر بھی صحت و تندرستی پر نہایت قوی اور دیرپا ہوتا ہی آج کل بدقسمتی سے بہت سے نوجوانوں کی پس ماندگی، خستہ حالی، اور دایم المرضی کا باعث خود ان کی غلط کاریاں، بے اعتدالیاں اور اخلاقی کمزوریاں ہوتی ہیں۔ نہ معلوم بعض لوگوں کی یہ شکایت کہاں تک درست ہی کہ مشرقی اقوام کو مغلوب اور پس پا کرنے کی غرض سے ترقی یافتہ قومیں قصداً اخلاقی کمزوری کا خوفناک آلہ اپنے مفید مطلب استعمال کر رہی ہیں۔ اور خصوصاً بادہ نوشی و آوارگی کا رواج، جو قوموں کو دیمک کی مانند کھوکھلا کر دیتی ہیں، جونک کی مانند خون چوس لیتی ہیں، سیاسی پالیسی جزو بنا ہوا ہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ عادت ملعونہ شعلہ کی طرح ہمارے ملک میں ہر چہار طرف پھیل رہی ہی۔ اکثر شہروں کی حالت اخلاقی لحاظ سے تشویش ناک ہو چلی ہی۔ اسکول اور کالجوں کی حالت ابھی تک تو غنیمت ہی مگر اثرات بد وہاں بھی راستہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر جلد مداخلت و حفاظت کا کافی اہتمام نہیں کیا گیا تو اندیشہ ہی کہ قوم کا بہترین حصہ جس کی ذات سے ملک کی بیشمار اُمیدیں وابستہ ہیں۔ ان موذی اثرات کا شکار ہو کر ہمیشہ کے واسطے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دے گا لہذا بہی خواہان ملک کا اولین فرض ہی کہ اس آتش

جہاں سوز کو جلد بجھائیں۔ لوگوں میں نہ صرف اپنی تحریر و تقریر بلکہ اپنے طرزِ عمل اور ذاتی مثال سے اعتدال ورزی، پاکبازی، بلند خیالی اور جدید پسندی کی مستقل عادتیں پیدا کرکے ان کو شاہ راہ ترقی پر لائیں۔ اگر اخلاق کی نگہداشت نہیں کی گئی تو عادات خبیثہ جن کا طوفان ہر طرف بڑھ رہا ہے دیکھتے دیکھتے اس بدبخت ملک کو زنگ خوردہ لوہے کی مانند از کار رفتہ کر دیں گی۔

بداطواری کی ابتدا ہمیشہ نادانی و اشتیاق سے ہوتی ہے۔ بیتدی کو مضرت کی تو کچھ خبر نہیں ہوتی دوسروں کی مثال یا ترغیب سے تقلید کا شوق پیدا ہوتا ہے اور چند قدم بڑھتے ہی ایسی دلدل میں جا پھنستا ہے کہ صحیح سالم نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ بچے سب سے زیادہ والدین پر اعتماد کرتے ہیں۔ انھیں کی بات وہ سب سے زیادہ مانتے ہیں۔ اگر والدین اس معاملہ میں مروجہ مہر سکوت توڑ ڈالیں اور سب سے اول خود عاقلانہ طریقے سے بچوں کو تمام ضروری باتوں سے آگاہ کرکے ان کے اچھے بُرے نتائج بخوبی ذہن نشین کر دیں تو ممکن نہیں کہ جس طرح بچے کی نرم طبیعت اور باتوں سے متاثر ہوتی ہے، اس سے نہ ہو اور اس اثر کا رنگ افعال و عادات پر نہ چڑھے۔ یہ عام خیال صحیح نہیں کہ اس قسم کی آگہی سے بچے بگڑ جائیں گے۔ موزوں وقت پر یعنی قبل رسائی اثرات بد اگر مناسب طور سے صحیح واقفیت بچوں کے ذہن نشین کر دی جائے تو حفاظت کا اس سے زیادہ کارگر کوئی طریق نہیں۔ چنانچہ ایک ماہر تربیت نے والدین کی موجودہ خاموشی اور بے التفاتی کو سراسر خلاف عقل و مصلحت قرار دے کر مذکورہ بالا طرزِ عمل کی بہت تاکید کی ہے اور ہم بھی اس رائے سے پورا اتفاق رکھتے ہیں ؎

چو کارے بے فضولِ من بر آید — مرا در وے سخن گفتن نشاید
وگر بینم کہ نابینا و چاہ است — دگر خاموش بنشینم گناہ است

(س) اس زمانہ میں ہر قسم کے کام اور پیشوں کے واسطے تعلیم کس قدر ضروری ہو اور ہوتی جاتی ہو۔ ہر ایک سمجھدار آدمی خود اندازہ کر سکتا ہو۔ مولٰنا حالیؔ مرحوم نے علم کی ضرورت کا فوٹو اپنی مشہور نظم میں کس خوبی سے کھینچا ہو ؎

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہو باری | جہاں میں چارسو علم و عمل کی ہو عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہو رہے معلوم یہ ان کو | کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہو ہر فن اور صناعت میں | نہ چل سکتی ہو اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر | تجارت کی نہ ہوگی تا قیامت گرم بازاری
نہ آئیگی پسند اُن نوکروں کی خدمت و طاعت | جنھیں پائیں گے آقا زیور تعلیم سے عاری
اگر چاہیں گے کرنی آدمی گھوڑوں کی سائیسی | تو دینا ہوگا ان کو امتحانِ علم بیطاری
نہ مستغنی بکاول علم سے ہیں اب نہ باورچی | ہوا ہو مدرسوں سے مطبخوں تک فلسفہ جاری
یقیں جانو کہ آیندہ ملے گی درس گاہوں میں | گر آٹا پیسنے کو چاہیئے گی اک پسنہاری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز | نہ فصادی، نہ جراحی۔ نہ کحالی نہ عطاری

جہاں تک دیکھیے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہو اوپر خدائی ہے

گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انساں کا اک زیور | ہوئی ہو زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہو کر کھا نہیں سکتا | نہ زرگر اور نہ آہنگر نہ بازی گر نہ سوداگر
ھندسہ چاہیے مزدور اب اور راج اُقلیدس | بس اب دنیا میں بے علموں کا ہو اللہ ہی یاور
گئے وہ دن کہ تھے محدود کام انسان کے سارے | برابر تھا بئے کا گھونسلا اور آدمی کا گھر
یہ دورہ ہو بنی آدم کی روزافزوں ترقی کا | جو آج اک کام ہو اعلیٰ تو کل ہو اس سے اعلیٰ تر
کوئی دن میں خسارہ سب سے بڑھکر اس کو سمجھیں گے | کہ دو دن آدمی ٹھیرا رہے یاں ایک حالت پر

حصہ دوم
باب ۵

دیا ہے امتیاز انساں کو یہ تعلیم نے آکر نہ تھا غیر از ترقی فرق کچھ انسان وحیواں میں

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھا دوں گا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام ان کا مٹا دوں گا

اب غور کیجئے کہ موجودہ طریق تعلیم کہاں تک ہمارے درد کی دوا اور ہماری ضروریات کی کفیل ہے۔ پنجاہ سالہ کوششوں کے پھل کروڑہا روپیہ تعلیمی مصارف کے ماحصل ترقی کے زندہ آثار سرمایۂ نازو افتخار۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے کمالات پر ذرا نظر دوڑائیے۔ ایک انبوہ کثیر سرگرداں وحرماں نصیب سائلوں اور امیدواروں کا ایک جم غفیر سپاس گزار وفرماں بردار محرروں کا ایک روزافزوں گروہ نزاع پرور وجدال پسند وکیلوں کا دو فرقے آزاد کیش وبیباک اور مصلحت اندیش وکرم خواہ مقرروں کے، اور سب سے چھوٹی جماعت خود دار ومتانت شعار کارگزاروں کی جو صنعت وحرفت زراعت وتجارت کو ترقی دے کر صحیح اصول کے مطابق ملک کی بہبودی اور مرفہ الحالی کے وسائل پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ مطالبات جیسے چاہو اعلیٰ ہمت جتنی چاہو پست قول بغایت فصیح وبلیغ عمل نہایت بدسلیقہ وبے ترتیب۔ نہ خیال میں تمکنت نہ جدوجہد میں استقلال۔ جذبات سریع الاشتعال۔ ارادات سریع الزوال۔ اکثر منصوبے کڑھی کا اُبال۔ بقول حضرت اکبر ؎

ضعف مشرق نے تو رکھا پاؤں کو جھکڑا ہی
مغربی فقروں نے لیکن مُنہ کو انجن کر دیا

ہماری جیسی بے اُصول ونامکمل طریق تعلیم سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ جسم کے تمام اعضا کو مُعطل کر کے دماغ مجسم بننے کی کوشش کا نتیجہ اضمحلال، مرض اور موت کے سوا کیا ہو سکتا ہے کامل صحت اور تندرستی کے واسطے تمام اعضا کا قوی ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح قومی عروج بھی

حصہ باب ۵

اخلاقی، معاشرتی اور بالخصوص معاشی حالت کی عمدگی بغیر محض دماغی ترقی پر قائم نہیں ہو سکتا۔ افراد گویا ہیں یہ جسم قوم کے بیشمار اعضا۔ اور ہر عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کیا جائے یا کار مخصوص کے بجائے اس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوت کو مضرت نہ پہنچے۔ کیسے ممکن ہے کہ تمام لوگ ادیب زبان دان، مورخ، فلسفی، مہندس، طبیبی یا عالم الٰہیات بن جائیں اور اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ نظام عالم کی درہمی برہمی نہیں تو اور کیا۔ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کر کے ناکام و نامراد رہ جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بہت سے صنعت و حرفت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر ان کو ٹیکنیکل تعلیم (صنعتی تعلیم) میسر آ سکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے اور بجائے بار کے سہارا اور بجائے عار کے سرمایۂ افتخار بن جاتے۔ ان لوگوں کی خداداد قابلیتوں کا خون اور ان کی بربادی کا گناہ ہمارے ناقص طریق تعلیم کی گردن پر نہیں تو اور کس پر ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ یورپ کا عروج و اقتدار، ادنیٰ مزدوروں، صناعوں، پیشہ وروں اور تاجروں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ طبقے ہیں جو بجا طور سے قومی ریڑھ کی ہڈی کہلاتے ہیں۔ حکومت اور سوسائٹی میں ان کا روز افزوں رسوخ و احترام ان کی اہمیت کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن ہمارے طریق تعلیم میں ان کی ضروریات کو خدا جانے کیوں اس قدر نظر انداز کیا گیا ہے۔ لبرل تعلیم (غیر صنعتی تعلیم) تو بھلی بُری میسر آ ہی جاتی ہے۔ لیکن ٹیکنیکل تعلیم بے حد نایاب ہے۔ ہم لبرل تعلیم کو غیر ضروری اور غیر مفید نہیں سمجھتے۔ لیکن اسے قومی تعلیمی کی انتہا سمجھ لینا سخت مہلک خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک کافی اہتمام نہ ہو جائے ہم کو تمامتر کوشش اور روپیہ ٹیکنیکل تعلیم کی بہم رسانی اور ترویج پر صرف کرنا لازمی ہے۔ تاکہ قومی ترقی کے تمام شعبوں میں نسبت قائم ہو جائے۔ اور کوئی ایک بھی کمزوری

اس کی باقی تمام قوتوں کو بیکار نہ کر سکے۔ جس طرح کہ مضبوط زنجیر کے تمام حلقے فرداً فرداً مضبوط ہونے لازمی ہیں، قومی قوت کے واسطے بھی ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک تمام فرقوں کا حسب ضرورت خوشحال اور اپنے کاروبار میں ہونا ضروری ہے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ نام نہاد مروجہ لبرل تعلیم سے ٹیکنکل تعلیم کی ہمارے ملک کو کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اور اس کے اہتمام میں کوشش کرنا ہر ایک خیر خواہ قوم کا فرض ہے۔

ہندوستان میں جیسی کمتر مفید تعلیم مروج ہے ظاہر ہے اور اس پر طرہ یہ کہ وہ بھی روز بروز گراں اور کمیاب ہو رہی ہے۔ فیس میں اضافہ نصاب تعلیم میں ہر سال تبدیلی ہر جماعت میں طلبا کی تعداد مقرر، معلموں میں ضروری قابلیت کی قلت، تعلیم میں عدم توجہی امتحانات میں سخت گیری بشکل ناکامیابی، اخراج، ملازمت سے انکار، عمر، دولت، محنت سب برباد، خستہ حالی و تلخ کامی ماحصل۔ خود یورپ میں تعلیم خانقاہوں سے پھیلی۔ جاپانیوں نے بھی جھونپڑوں برآمدوں اور سر راہ دُکانوں میں تعلیم حاصل کی۔ مگر ہماری تعلیم کے واسطے عالیشان عمارت، بیش بہا سامان اور امیرانہ ٹھاٹھ لابد ہیں۔ حضرت اکبر نے ہماری بیش قیمت تعلیم کا کیا نقشہ کھینچا ہے!

قومی ترقی کی رادھا پیاری　　بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری　　چندہ کی تحصیل ہے جاری

ہم کو کالجوں سے زیادہ پرائمری مدارس کی ضرورت ہے تاکہ عوام حرف شناس اور پڑھنے لکھنے میں شُد بد ہو کر اپنے سیدھے سادھے کام بطریق احسن سرانجام دے سکیں اور اعلیٰ تعلیم کے واسطے بھی میدان وسیع ہو جائے۔ زیادہ مصارف کی ضرورت نہیں۔ صرف کوشش اور اہتمام درکار ہے۔ مقامی امداد سے ایسے مدارس بآسانی چل سکتے ہیں۔ مسٹر گوکھلے

اُن جہانی کو جنھوں نے نمائشی اور دلاویز باتوں سے بچکر اپنی تمام عمر مفید تجاویز کی تکمیل میں صرف کی پرائمری تعلیم کا خیال پیدا ہوا تو اُنھوں نے پرائمری ایجوکیشن بل کا ایک نہایت قابلانہ مسودہ امپریل کونسل میں پیش کیا۔ اور گو ان کا بل رد ہوا اور ہونا تعجب نہیں لیکن اگر زندگی وفا کرتی تو اُن کی کوشش کا کوئی نہ کوئی مفید نتیجہ ضرور نکلتا۔ اور یہ نتیجہ کیا کم ہے کہ عام لوگوں کو پرائمری تعلیم کی ضرورت اور اس کی اہتمام کا طریقہ اُن کی تحریروں اور تقریروں سے ذہن نشین ہو گیا اور نیز بعض بیدار مغز ریاستوں مثل بڑودہ و میسور میں پرائمری تعلیم کا رواج خاص اہتمام سے شروع کر دیا گیا۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ اس کے نتائج بھی جن سے خوشامدی یا خود غرض لوگ منکر ہیں چند ہی روز میں ظاہر ہو جائیں گے۔

کاش ہمارے لیڈر جو محض سیاسی قیل و قال کو ورد بنائے ہوئے ہیں دھواں دھار تقریریں اور فلک رس چیز جن کے دلوں کو محو کیے ہوئے ہیں اس نکتہ پر غور کریں کہ عالیشان عمارت کے واسطے مضبوط بنیاد اور بار آور درخت کے واسطے زرخیز زمین لازمی ہے۔ سیاسی آزادی حریت کے نعرے لگانے سے نہیں ملتی بلکہ علمی ترقی، اخلاقی جرأت، ارادی قوت اور معاشی استحکام شرائط اولیٰ ہیں۔ اور بحالت پابندی و محکومی ان کو پورا کرنا ہی تو جوانمردوں کا کام ہے۔ گرما گرم تقریروں سے فوری جذبات جس قدر جی چاہے اُبھاریئے۔ اُجرت تحسین نقد وصول کیجئے۔ مگر عملی کوشش کی تکالیف و محنت برداشت کیے بغیر محض باتوں سے تعلیم نہیں ہوتی، اخلاق درست نہیں ہوتے، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت ترقی نہیں کرتی۔ جو لوگ نام و نمود کے بجائے ملکی بہبودی کے خواہاں ہیں ان میدانوں میں کمر باندھ کر اُتریں اور قوم لنگ یا کی دستگیری کریں اس وقت قدر نہ ہو مگر آیندہ نسلیں یقیناً

ان کی شکر گزار اور احسان مند ہوں گی اور حقیقی مُحبانِ وطن کی مختصر فہرست میں ان کا نام آبِ زر سے لکھا جائے گا۔ تالاب کے کنارے خواہ کتنے ہی اونچے اور مضبوط ہوں یا پانی کی سطح بلند کیے جاؤ، ایک نہ ایک دن پانی بالآخر اُبل پڑے گا اور اپنا راستہ آپ بنالے گا۔ کام کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہی۔ ہر شخص مناسب اور موزوں کام اپنے اپنے ذمہ لے کر خموشی اور تندہی سے مصروف ہو جائے۔ چنانچہ سمجھ دار فرقوں کا کچھ دنوں سے یہی طرزِ عمل نظر آتا ہی۔ خدا دوسروں کو بھی توفیق دے!

حصۂ دوم

باب ۶

باب چھ

اصل

تجزیہ (۱) اصل و دولت کا فرق (۲) پیدایش اصل کی شرط (۳) افزونی اصل کے اسباب (۴) اصل کے خواص (۵) اصل کے اقسام

اصل و دولت کا فرق

۱- اصل کی پیدایش اور کارگزاری کا مختصر حال عاملان پیدایش کے بحث میں بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن تھوڑی سی مزید تشریح یہاں بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بلحاظ ماہیت اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں لیکن بلحاظ طریق استعمال ان میں بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز کو ہم عامل پیدایش بنائیں یعنی اس کو اس طرح پر کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ اصطلاحاً اصل کہلاتی ہے۔ اور اگر اسی چیز کو ماحصل پیدایش مانیں اور اس طرح پر صاف کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونے کے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہو تو وہ دولت کہلائیگی مثلاً رہنے کا مکان دولت ہے، لیکن اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جاوے یا وہ کرایہ پر دے دیا جائے تو وہ اصل بن جائے گا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی اصل شمار ہوتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی دولت۔

لیکن نہ صرف دولت کے وسعت و مفہوم کی وجہ سے اصل کا تعین دشوار ہے۔ بلکہ یہ سوال بھی کہ مزید دولت کی پیدایش میں علاوہ زمین و محنت کون چیزیں معاون ہیں فی الحقیقت اس قدر مبہم ہے کہ اس کا کوئی قطعی جواب ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک گروہ

حصہ دوم
باب ۷

نے تو یہ تفریط کی کہ صرف آلات، پیداوار خام، اور زر نقد کو جو اُجرت میں صرف ہو اصل قرار دیا۔ کیونکہ پیدایش سے انہی تین چیزوں کا نہایت قریبی تعلق ہی۔ دوسرا گروہ افراط پر اس قدر جھکا کہ اس نے دولت اور اصل کو مترادف قرار دے دیا۔ کیونکہ انسان جس قدر چیزیں برتتا ہی وہ بر شتۂ قریب یا بالعید پیدایش دولت میں مدد ضرور دیتی ہیں۔ مثلاً خوراک، لباس، مکان اور دیگر ضروریات قیام صحت و قوت کے واسطے لازمی ہیں اور صحت و قوت محنت کے واسطے لابد۔ لہٰذا مذکورۂ بالا چیزیں بھی بالواسطہ پیدایش دولت میں معین ہونے کی وجہ سے اصل میں شامل ہیں۔ لیکن تیسرے اعتدال پسند گروہ نے افراط و تفریط دونوں کو ترک کرکے یہ فیصلہ کیا کہ اصل کے معنی کو صرف اُن چیزوں تک محدود کرنا جن کا پیدایش سے قریب ترین تعلق ہی، یا اس قدر وسعت دینا کہ تمام دولت داخل ہو جائے دونوں غلط اُصول ہیں۔ گو اصل کا مفہوم اس قدر متحقق اور متعین نہیں ہو سکتا کہ اصل اور غیر اصل دولت کی کوئی مکمل فہرست تیار ہو سکے لیکن جو چیزیں کہ عرف عام کے مطابق پیدایش دولت میں شریک مانی جائیں ان کو اصل اور باقی کو دولت شمار کرنے کا اصول ہماری عملی ضروریات کے واسطے کافی طور پر رہنمائی کر سکتا ہی۔

اصل و دولت میں ایک فرق یہ بھی قرار دیا گیا ہی کہ اگر کسی چیز کے استعمال سے کچھ آمدنی ہو تو وہ اصل ہی ورنہ دولت۔ لیکن آمدنی کے معنی میں وہی عدم تعین کی دقت پیش آتی ہی۔ اگر آمدنی صرف مادی معاوضہ تک محدود کی جاتی ہی تو اصل کا مفہوم نہایت تنگ ہو جاتا ہی۔ اگر ہر قسم کا معاوضہ شامل کرتے ہیں تو پھر اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس حالت میں بھی بہترین طریق یہی ہی کہ آمدنی سے مُراد وہ کل معاوضے لینے چاہئیں جو عرف عام کے مطابق آمدنی کہلا سکیں اور جن چیزوں

حصہ دوم باب ۶ اصل و دولت کے فرق

کے استعمال سے ایسی آمدنی حاصل ہو وہ اصل ہیں باقی دولت. اصل و دولت کے فرق کی بحث بھی اسی واقع کی مثال ہو کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے بحث کرتے ہیں ان کے اصول کبھی پورے طور پر مقرر اور متعین نہیں ہوسکتے. کم وبیش کسر ضرور باقی رہتی ہو اور اخلاقی معاشرتی اور معاشی مسائل پر جو اس قدر اختلاف رائے کی کثرت ہو اس کا باعث یہی عدم تعین ہو۔

گو کوئی قطعی معنی تحقیق نہ ہوسکے لیکن اتنا ضرور معلوم ہوگیا اور ہماری ضرورت کے واسطے اتنی معلومات کافی ہو کہ اصل و دولت میں صرف اتنا فرق ہو کہ ایک عامل پیدائش مانا جاتا ہو اور مزید دولت پیدا کرتا ہو۔ دوسرا ماحصل پیدائش ہوتا ہو اور ہماری احتیاجات پوری کرتا ہو۔ ایک ہی چیز مختلف اوقات میں حسب طریق استعمال اصل و دولت دونوں ہوسکتی ہو۔

پیدائش اصل کی شرط

۲- عاملین پیدائش کے بیان میں یہ تو واضح ہوچکا کہ اصل زمین و محنت کے اتفاق عمل کا نتیجہ ہو، گویا اُن سے پیدا ہوتا ہو۔ لیکن اگر جس قدر دولت پیدا ہو، کل صرف کر دی جائے تو کچھ نہ بچے گا اور باوجود اتفاق عمل زمین و محنت اصل پیدا نہ ہوسکے گا اس کی مثال بعینہٖ یہ ہو کہ بچہ انڈے سے اور انڈا جوڑہ کے اتفاق عمل سے پیدا ہوتا ہو پس اگر انڈا کھا لیا جائے تو باوجود جوڑہ کے اتفاق عمل کے بچہ پیدا نہ ہوسکے گا گویا جو انڈا کھا لیا جائے وہ محض دولت ہو اور جس کو سے کر بچہ نکالا جائے وہ اصل ہو۔ پس ظاہر ہو کہ پس اندازی بغیر اصل کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور یہ ایسا صریح واقعہ ہے کہ کوئی اس سے ناواقف نہیں۔ آمدنی بچا بچا کر لوگ جائداد خریدتے ہیں، کارخانے چلاتے ہیں تجارت کرتے ہیں۔ اگر کل کمائی ضروریات میں صرف کر دی جائے اور کچھ پس انداز نہ ہو تو یہ ایک چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ زمین اور محنت کا اتفاق عمل اصل کا

حصۂ دوم
باب ۶
افزونی اصل کے اسباب

منبع اور پس اندازی پیدایش اصل کی شرط لازمی ہو۔

۳. اصل کی ماہیت اور پیدائش کا حال بیان کرنے کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ افزونی اصل کے واسطے حالات مساعد کیا ہیں۔ بالفاظ دیگر اصل کیونکر کسی ملک میں بڑھتا ہو۔

(۱) پس انداز کی مقدار آمد و خرچ کے باہمی نسبت سے متعلق ہوتی ہو۔ محض آمد کی زیادتی یا خرچ کی کمی سے جداگانہ کچھ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ جس شخص کی آمد و خرچ حسب ترتیب ایک ہزار اور نوسو روپیہ ہو، وہ صرف سو روپیہ بچا سکتا ہو حالانکہ پانسو روپیہ آمدنی والا تین سو روپیہ کے خرچ سے اپنے سے دوگنے آمدنی والے سے دوگنا پس انداز کرتا ہو۔

محض بچت کے لالچ سے ضروریات جائز کو بھی نظرانداز کرکے دولت اندوزی زندگی کا مقصد قرار دینا ہرگز پسندیدہ اور قرین عقل نہیں۔ ایسی کفایت شعاری نہ صرف عقلاً و اخلاقاً مذموم ہو بلکہ کارکردگی گھٹا کر معاشی لحاظ سے بھی سخت مضر ہو اور بالآخر خود افزایش اصل میں مارج ہوتی ہو۔ تخفیف مصارف کسی حالت میں قیام و ترقی کارکردگی کی مانع نہ ہونی چاہیے ورنہ خود مطلب فوت ہونا یقینی ہو۔ لیکن تمام دولت کو محض عشرت پرستی پر لٹانا اس سے کہیں زیادہ معیوب اور قابل اعتراض ہو۔ اعتدال ہر حالت میں بہتر ہو۔

اس معاشی شعبہ کی مناسب اصلاح اور ترمیم سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی معاشرت کا معیار کچھ مقرر سا ہوتا ہو۔ اگر کوئی معیار سے بالاتر چڑھے تو وہ امتیاز و وقعت پاتا ہو لیکن اگر اس سے نیچے گرے تو سُبکی اور تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ افلاس کی مجبوری سے اس ذلت کو گوارا کیا جاتا ہو۔ یا مصلحان قوم جن کے اعلیٰ خیالات کو آج

کے اثر سے بالاتر ہیں عمدہ مثال قایم کرنے کی غرض سے باوجود ہزار استطاعت مُروجہ معیار سے نیچے اُتر آتے ہیں۔ مگر عوام میں اتنی اخلاقی جراُت کہاں کہ وہ نام نہاد ذلت برداشت کر سکیں۔ جب تک دم میں دم ہوتا ہے تباہی کی حد تک رسم و رواج کا ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے متوسط الحال شرفا کی خستہ حالی کا باعث شادی غمی کی رسوم ہوتی ہیں۔

ہر بیدار طبقہ میں اصلاح رسوم کی خاص کوشش جاری ہے۔ ہندوؤں کی شادی بیاہ میں ناچ آتش بازی اور پھلواری پر ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا۔ مگر چند روز سے یہ رسم بالکل بند ہوگئی۔ اور چونکہ متمول اور سربرآوردہ لوگوں سے ابتدا ہوئی عوام کو تقلید میں کوئی پس و پیش نہ ہوا۔ اسی طرح دکن کی بوہرہ قوم میں نہایت بیش خرچ رسوم جاری تھیں۔ لیکن بمبئی کے ملک التجار اور مشہور کروڑپتی سر آدم جی پیر بھائی مرحوم نے اپنی خاندانی تقریبات میں اُن تمام رسوم کو ترک کر کے غربا کے واسطے ایسی آسانیاں پیدا کردیں کہ جہاں ہزارہا روپیہ کفایت نہیں کرتا تھا وہاں اب صرف چند روپے سے کام نکل جاتا ہے۔ اصلاح رسوم سے مرحوم نے جو اپنی قوم کو فائدہ پہنچایا اس کا تخمینہ کروڑہا روپیہ سے بھی کرنا مشکل ہے۔

قصہ مختصر افزونی اصل کی پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے مقدار پیداوار بڑھائی جائے اور مصارف حد مناسب کے اندر رکھے جائیں۔ افزایش پیداوار کے وسائل تو بکثرت اس کتاب میں موقع بہ موقع مذکور ہیں اور تحدید مصارف کی ترکیب درستیٔ معاشرت اور اصلاح رسوم ہے۔

(ب) اضافۂ اصل کی دوسری شرط امن و حفاظت ہے۔ پس انداز کرنے والے کو یہ اطمینان ہونا ضروری ہے کہ اس کا اندوختہ اس سے بہ جبر نہیں چھینا جائے گا۔ وہ

حصہ دوم اس کا مالک رہے گا اور حسب دلخواہ اس سے کام لے سکے گا۔ بدامنی کے زمانہ میں
باب ۶ ہر ایک کا عملدر آمد یہی ہونا چاہیے کہ "ہر چہ داری بخور امروز غم فردا مخور"۔ برعکس اس کے
جن ملکوں میں امن وامان کا تسلط ہو وہاں مستقبل بعید کے واسطے بھی اہتمام پیش نظر رہتا ہی۔ اسی طرح سپاہی اور ملاح جن کا پیشہ ہی جانبازی ہی فضول خرچی کے واسطے ضرب المثل ہیں۔ اور جو لوگ غیر مخدوش کاموں میں مصروف ہیں بالعموم کچھ پس انداز کرتے رہتے ہیں۔ یہ واقعہ فطرت انسانی پر مبنی ہی اور ہر جگہ اس کی مثال موجود ہی۔ چنانچہ انگلستان میں موجودہ کثرت اصل کا باعث یہ بھی ہی کہ وہاں صدہا برس سے اندرون ملک کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ اور چونکہ بہت قدیم زمانہ سے کم وبیش آئینی حکومت چلی آتی ہی لوگوں کا اندوختہ شاہی دست برد سے بھی محفوظ رہا۔ سرمایہ چھننے کا خدشہ لوگوں کے دل سے قطعاً محو ہو گیا اور اطمینان کی بدولت اصل میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہونے لگا حتیٰ کہ آج انگلستان کا اصل دنیا پر محیط نظر آتا ہی۔

انسان بالطبع امتیاز کا شایق ہی۔ اور ہر ملک و قوم میں وسائل امتیاز مختلف پائے جاتے ہیں۔ کہیں جرأت، بہادری اور جسمانی طاقت کا دور دورہ ہی۔ مثلاً عرب، ٹرکی اور افغانستان یا روہیلکھنڈ و پنجاب میں، کہیں علم کا جھنڈا لہلہا رہا ہی۔ جیسے جرمنی فرانس، امریکہ اور انگلستان یا بنگال میں اور کہیں دولت کا سکہ رواں ہی جیسے یورپ امریکہ، بمبئی، یا من حیث القوم یہودیوں، مارواڑیوں اور بوہروں میں۔ لیکن بالعموم ترقی و استحکام امن وامان کا خاصہ ہی کہ امتیاز اول الذکر کے مقابلہ میں آخر الذکر کا اثر قوی کرتا ہی۔ یورپ و امریکہ میں تو تجارت کے اقتدار کا ذکر کیا ہی خود ہندوستان میں اس طبقہ کا رسوخ ہر طرف بکثرت پھیل رہا ہی۔ اہل قلم و اہل سیف جو

اب تک تجارت کو بنیوں کا ادنیٰ کام خیال کرتے تھے اب اس کے روز افزوں اقتدار سے چونک کر حیران و ششدر نظر آتے ہیں۔ میونسپلٹی سے لے کر امپیریل کونسل تک تمام نیابتی انجمنوں میں قومی جلسوں اور کانفرنسوں میں ملکی بہبودی کے تمام منصوبوں اور تجاویز میں، پبلک اور سرکاری حلقوں میں غرضکہ ہر طرف دولت کا رسوخ پیش پیش اور غالب نظر آتا ہے ایسے حالات بھی جو امن و امان کے آفریدہ ہیں اضافہ اصل کے بے حد معاون ہیں۔

(ج) اصل سے کام لینے اور فائدہ اُٹھانے میں جو آسانیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کا اثر بھی اضافہ اصل پر قابل لحاظ پڑ رہا ہے۔ گو دفینہ بھی اڑے وقت کام آتا ہے اور اس کی یہی صفت پس اندازی کے واسطے کافی سفارش ہے۔ لیکن اگر اندوختہ سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہو سکے تو کیا اچھا ہو۔ مصرع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ اس زمانہ میں ہر شخص کارخانوں اور تجارت کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر بذریعہ شراکت اصل اپنے اندوختہ سے بلا دقت و اندیشہ کافی نفع اُٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ریلوں، بنکوں اور کمپنیوں کے حصے خرید کر اندوختہ سے فائدہ اُٹھانے کا عام رواج ہو چلا ہے۔ غریب مزدوری پیشہ لوگ بھی چند روپے سیونگ بنک میں جمع کر کے نہ صرف اندوختہ کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں بلکہ بموجب قواعد کچھ سود کا نفع بھی پاتے ہیں۔ سیونگ بنکوں کی روز افزوں ترقی سے ثابت ہے کہ پس اندازی کی عادت غربا اور مزدوروں میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔

(د) انسانوں کے فطری خواص کو بھی افزونی اصل میں بہت بڑا دخل ہے۔ پس اندازی کی طاقت قوت متخیلہ اور قوت ارادی پر منحصر ہے۔ نہ صرف مستقبل قریب بلکہ بعید کی احتیاجات کا پورا پورا اندازہ کرنا اور ان کی بہم رسانی کے واسطے موجودہ احتیاجات میں

ترمیم کرکے پس انداز کرنا یہ دو قوتیں سب میں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ بعض لوگ جو کوتہ بیں کہلاتے ہیں مستقبل کو صاف طور پر دیکھنے سے فطرتاً معذور ہوتے ہیں۔ حاضر کے سوا ان کو کچھ نظر نہیں آتا۔ بعض لوگ دُور بین تو ہوتے ہیں لیکن ان کی قوت ارادی اس قدر قوی نہیں ہوتی کہ موجودہ احتیاجات کی جو بوجہ قرب زیادہ دلکش ہوتی ہیں اصلاح کرکے کچھ بچا سکیں۔ اس کمزوری کے اسباب اخلاقی لحاظ سے اچھے بُرے دونوں قسم کے ہوسکتے ہیں۔ مثلاً تن پروری، عیش پرستی، یا سخاوت و فیاضی، لیکن معاشی طور پر افزائش اصل میں اس سے رُکاوٹ ضرور پیدا ہوتی ہی۔ ایسے ہی دُور بین مگر کمزور قوت ارادی والوں پر غالب مرحوم کا شعر صادق آتا ہی ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

پس اندازی کی مذکورہ بالا طاقت کے محرک ذاتی اغراض اس قدر نہیں ہوسکتے جتنا کہ اولاد کی محبت یا ترقی یافتہ ممالک میں قوم پرستی۔ معاشی دنیا میں جن لوگوں نے جھنڈے گاڑے ہیں اور جن کا آج ڈنکا بج رہا ہی اُنھوں نے ملک اور قوم کی ترقی و اقتدار کی خاطر یہ سب کچھ کارگزاریاں دکھائی ہیں۔ محض اپنی زندگی کے واسطے وہ اس قدر جدوجہد ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ہر کوئی صاحب اولاد اپنے دل سے دریافت کرسکتا ہی کہ پس انداز کرنے کی بڑی غرض اولاد کے مستقبل کی بہبودی ہوتی ہی۔ حاصل کلام یہ کہ قوت متخیلہ اور قوت ارادی پس اندازی کے دست و پا اور دوسروں کی محبت و خیر طلبی اس کی زبردست محرک ہوتی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ معاشرتی اور معاشی حالات ان خواص کو قوی اور ضعیف کردیتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان کا جداگانہ اثر قابل لحاظ ہوتا ہی۔

حاصل کلام یہ ہی کہ پیدائش اصل کے واسطے زمین و محنت کا اتفاق عمل لابد اور

حصۂ دوم پس اندازی شرط لازمی ہی۔ پس اندازی کی مقدار آمد و خرچ کی باہمی نسبت، ملکی امن و امان
باب ۵ حصول منفعت کی آسانی اور فطری خواص سے کم و بیش متعلق ہی۔

اصل کے خواص ۴ (ا) یوں تو ہر چیز حتیٰ کہ کرۂ ارض کی بھی ایک حد ہی۔ لیکن اصل کی مقدار اس معنی میں محدود اور معین نہیں کہلائی جاسکتی جس معنی میں زمین کہلاتی ہی کہ اس کی مقدار بڑھ ہی نہ سکے۔ اصل میں اضافہ کی بہت گنجایش ہی۔ چنانچہ واقعہ ہی کہ اصل کی مقدار بہ نسبت سابق صدہا گنی ہو گئی ہی اور برابر بڑھ رہی ہی۔

(ب) زمین کی قوت پیدایش قدرت نے معین کر دی ہی۔ محنت بھی ایک حد تک قوانین قدرت کی پابند ہی۔ کچھ عرصہ میں تھک کر انسان کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہی لیکن اصل سب سے زیادہ آزاد ہی اور اس کی قوت پیدایش بھی دوسرے عاملوں سے زیادہ ہی۔ اصل سے سالہاسال دن رات برابر عمل پیدایش جاری رکھا جا سکتا ہی۔ حتیٰ کہ وہ فرسودہ ہو کر بیکار ہو جاوے۔ سو یہ عجب نہیں۔ خود دنیا فانی ہی۔

(ج) زمین تو قطعاً غیر منقولہ ہی جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت میں حسب موقع زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہی۔ محنت منقولہ مگر مزدور کی ذات سے لاینفک۔ نتیجہ شرح مزدوری میں اختلاف۔ لیکن اصل پانی کی مانند سیال۔ جہاں ضرورت ہوئی کھٹ سے جا پہنچا۔ شرح سود میں کوئی قابل لحاظ فرق نہیں۔ یہ جو کمپنیوں اور بنکوں کی شرح سود میں تین فیصدی سے لے کر عموماً دس بارہ فیصدی تک اختلاف پایا جاتا ہی، محض سطحی دھوکا ہی۔ اس کی اصلیت تقسیم دولت کے بیان میں واضح کی جاوے گی۔ ($\frac{9}{12}$)

اصل کے اقسام ۵۔ معاشیین نے یوں تو کئی اصول پر اصل کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں لیکن ان سب میں مل کی تقسیم خاص طور پر قابل توجہ ہی۔ مل نے دو قسمیں قرار دیں۔ اصل دائر و اصل قایم۔ جو اصل عمل پیدایش میں اوّل ہی مرتبہ اپنا کام پورا کرے۔ وہ اصل دائر کہلاتا

ہے۔ مثلاً پیداوار خام تیل، کوئلہ اور اُجرت جو مصنوعات کے بنانے میں صرف ہو۔ اور جو اصل عمل پیدایش میں عرصہ تک اپنا کام سرانجام دیتا رہے وہ اصل قایم کہلاتا ہے۔ مثلاً انجن مشین، آلات اور عمارت کارخانہ جو ایک مرتبہ مُہیا ہونے پر عرصہ تک مصنوعات کی پیدایش میں مدد دیتے رہتے ہیں۔

اصل دائر و قایم کی تفریق میں ایک خاص اہمیت مضمر ہے جس کو ہم مختصراً واضح کیے دیتے ہیں۔ فرض کرو جوتہ کی دو فیکٹریاں ہیں۔ ایک میں نسبتاً اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہے، دوسرے میں اصل قایم کی۔ اب اگر جوتہ کی تجارت سرد ہو کر مقدار منافع بہت گھٹ جائے تو فیکٹری اوّل الذکر اس سرد بازاری کی متحمل نہ ہو سکے گی اور غالباً کاروبار بند کرنے پر مجبور ہو گی۔ لیکن فیکٹری آخر الذکر ان حالات نامساعد میں بھی کام جاری رکھ سکے گی اور ایسا کرنا بالکل غیر مفید بھی نہ ہوگا۔ وجہ غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اصل دائرہ تو جلد جلد گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اور جب نقصان کا اندیشہ صریح ہو تو بھلا کون اپنا روپیہ خطرہ میں ڈالے گا۔ لیکن اصل قایم میں ایک مرتبہ روپیہ لگتا ہے اور مدتوں وہ اصل کام دیتا ہے۔ جب ایسا اصل موجود ہو تو اُس کو بیکار ڈالنے سے کیا فائدہ۔ اگر تھوڑے مصارف نقد یعنی اصل دائر پر بھی کچھ منافع ملتا رہے تو اصل قایم کا منافع نظر انداز کر کے کاروبار جاری رکھنا بہتر ہوگا۔ مثل مشہور ہے بیکار سے بیگار بھلی۔ علاوہ ازیں ایسے زمانہ میں جبکہ دوسری مقابل کی فیکٹریاں بند ہوں، کاروبار سے حیثیت اور ساکھ بڑھنے کی اُمید ہو سکتی ہے اور اسی دوران میں جبکہ میدان خالی ہو عمدہ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے اگر دونوں فیکٹریوں کی اصل دائر و قایم کی مقدار حسب ترتیب دس ہزار و چار ہزار و چار ہزار و دس ہزار ہے اور کم سے کم قابل لحاظ شرح منافع ۲ فیصدی ہو تو دونوں فیکٹریاں کم از کم اصل دائر پر شرح مذکور حسب ترتیب دو سو روپیہ اور اسی روپیہ منافع تک بحالت مجبوری

کام جاری رکھ سکتی ہیں۔ گویا بمقابلہ فیکٹری اوّل فیکٹری دوم بکمتر مقدار منافع پر کام کرنے کی قوت رکھتی ہی۔ لیکن ظاہر ہے کہ دوسری بھی عرصہ دراز تک ان ناموافق شرائط پر کام نہیں چلا سکتی۔ البتہ دو چار مہینے کی عارضی کساد بازاری جس استقلال سے وہ برداشت کر سکتی ہی اوّل الذکر فیکٹری نہیں کر سکتی۔

اصل کی مذکورۂ بالا تقسیم سے معاشی مباحث میں اور بھی جابجا کام لیا گیا ہی جس کی حسب موقع ہم آیندہ تشریح کریں گے۔

حصۂ دوم

باب

باب سات

طریق پیدائش

تجزیہ (۱) اصول تقسیم عمل کی تشریح (۲) تقسیم عمل کے فوائد (۳) تقسیم عمل کی مضرت (۴) مشین کا رواج (۵) مشین کے فوائد (۶) مشین کا اثر مزدوروں پر (۷) پیدائش بر پیمانہ صغیر و کبیر (۸) پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد (۹) کفایات داخلی و خارجی (۱۰) قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل (۱۱) تحصیل صنائع (۱۲) صنائع تضمینی و تضمیمی (۱۳) کمپنیاں (۱۴) آجر و منیجر اور تخمین و تخمن۔

اصول تقسیم عمل کی تشریح

۱۔ اصول تقسیم عمل کوئی جدید تحقیق نہیں۔ ہزارہا سال سے انسان کا اس پر عملدرآمد چلا آتا ہے۔ وحشی قوموں میں بھی اس کا برابر رواج ہے۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ متمدن اقوام میں تہذیب و ترقی کی بدولت اس اصول کا دائرۂ عمل نہایت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس اصول کا اثر اول اول پیشوں پر پڑا جبکہ کھیتی کرنا، کپڑا بننا، جوتہ سینا، اور ایسے ہی لابد کام مختلف لوگوں نے جداگانہ اپنے ذمہ لیے اور کسان، جولاہے، موچی جیسے قدیم فرقوں کی بنا پڑی۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا، تقسیم عمل کا رواج بھی پھیلتا گیا۔ پیشوں کی تفریق کے بعد ہر پیشہ کے کام میں تقسیم شروع ہوئی۔ اور اس طرح کام سے کام نکلنے لگے جیسے پیاز کی گنٹھی میں پرت کے نیچے پرت نکلتے ہیں۔ کام کی اتنی مختلف اور بیشمار قسمیں ہوگئیں گویا کہ عمل پیدائش کا عالیشان پہاڑ کٹتے کٹتے محض سنگریزوں کا انبار بن گیا۔ کپڑا سینا یا جوتہ

بنانا جیسا سادہ کام دس دس بارہ بارہ حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ کام کا ہر جزو مقررہ لوگوں کے سپرد ہوتا ہے اور سوائے جزو مخصوص کے وہ کسی دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کسی ایک چیز پر اپنی تمامتر توجہ اور محنت صرف کرنا تاکہ کمال حاصل ہو اصول تخصیص کہلاتا ہے۔ اور اس طریقے سے کمال حاصل کرنے والے اپنے کام کے ماہر کہلاتے ہیں اور ہر ایک ماہر کی رائے اور مشورہ اس کے کام کے متعلق مستند اور قابل ترجیح مانا جاتا ہے۔ اصول تخصیص کا علم تو اور قوموں کو بھی مدت سے تھا۔ چنانچہ یک در گیر و محکم گیر اور اسی مضمون کی ہدایات دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں مگر کبھی اس اصول پر اس قدر اہتمام سے عملدرآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ کچھ عرصہ سے یورپ اور امریکہ میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے ہونہار دل و دماغ سے بھی بحر العلوم و عقل کل ہونے کا خبط جلد رفع ہو جانا چاہیے۔ مصرع ہر کسے را بہر کارے ساختند۔ اپنی خداداد استعداد اور قوتوں کا صحیح اندازہ کر کے ہر شخص کو موزوں اور مناسب کام منتخب کر کے اس میں کمال حاصل کرنا چاہیے تاکہ کوشش کا کوئی خاص نتیجہ نکلے۔ یہ کیا کہ موزوں اور ناموزوں سب کاموں میں دخل دینا اور باہمہ در دسری ادھورے رہ جانا۔ وکالت۔ ڈاکٹری، انجنیری جیسے اعلیٰ مخصوص کاموں میں تو رائے زنی کی جرأت کم ہوتی ہے کیونکہ فوراً قلعی کھل جاتی ہے۔ لیکن آجکل بالعموم تعلیم یافتہ نوجوان اور خصوصاً لیڈر صاحبان سیاسیات کے علاوہ دینیات، تعلیمات اور معاشیات کے بھی اپنے آپ کو پیدائشی عالم اور ماہر سمجھتے ہیں۔ اور نہایت دلیری و بے دردی سے قوم کو اپنی نادانی کا تختہ مشق بنا کر پریشان و خستہ حال کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک شعبہ بذات خود اس قدر وسیع اور تحقیق طلب ہے کہ اگر کسی ایک میں بھی انسان کماحقہ دستگاہ حاصل کرلے تو اس کی کامیابی قابل آفریں ہے۔ اور وہ اپنے ہی مخصوص حلقہ میں کوشش کر کے قوم کو بیش بہا فوائد

حصہ دوم
باب ۷

پہنچا سکتا ہی۔ یہی طریقہ ہی جس پر تمام مہذب اور بیدار قومیں کام کر رہی ہیں۔ کاش ہمارے ملک کو بھی اصول تخصیص سے فائدہ اُٹھانے کی توفیق نصیب ہو۔

تقسیم عمل کے فوائد

(۲) عمل پیدائش کے اعلیٰ تنظیم کی خصوصیت یہ ہی کہ ہر شخص سے پورا پورا کام اور صرف وہی کام لیا جاوے جس کے واسطے وہ موزوں ہی۔ کسی کام کے کل حصے یکساں نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض نسبتاً دشوار اور بعض آسان ہوتے ہیں۔ اگر ایسا کل کام کمزور آدمی سے لیا جاوے تو یقیناً خراب ہو جائے گا۔ اور اگر قوی آدمی سے کرایا جاے تو آسان حصوں کے کرنے میں اس کا وقت ضائع ہو گا۔ اس سے بہترین طریقہ یہ ہی کہ ہر کام کے دشوار اور آسان حصے جدا جدا کر دیئے جاویں۔ اور ہر مزدور کے مناسب حال کام اس کے سُپرد کر دیا جاے۔ چنانچہ اس طریق سے جو پیشے اب تک محض مردوں سے مخصوص تھے عورتیں اور بچے بھی اب ان میں ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہی کہ کام بھی عمدہ ہوتا ہی اور محنت بھی ضائع نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں جو کام بحیثیت مجموعی نہایت دقیق اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہی اور جسے کرنے کے واسطے بہت سمجھ درکار ہوتی ہے جب چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہی تو ہر حصہ جداگانہ اس قدر سہل ہو جاتا ہی کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی بلا تکلف اس کو کر سکتا ہی۔ غرضکہ تقسیم عمل کا اول نتیجہ یہ ہی کہ کام آسان ہو کر کفایت کے ساتھ عمدہ طور پر سر انجام پا سکتا ہی۔

(ب) یہاں یہ نکتہ ظاہر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہو گا کہ تقسیم عمل آجر اور مزدور دونوں کے واسطے حسب ترتیب بلحاظ کفایت مصارف و اضافہ اُجرت مفید ہی۔ مثلاً کسی گھر میں ایک مرد، چار لڑکے، دو عورتیں اور تین لڑکیاں ہیں۔ اگر گرد و نواح میں صرف طاقت طلب کام ملتا ہی تو غالباً دس آدمیوں کے کنُبے کا گزارہ ایک مرد کی کمائی پر ہو گا۔ کیونکہ بموجب حالت مفروضہ سہل کام لڑکے، عورتوں اور لڑکیوں کے کرنے کے قابل

نایاب ہی۔ اور آجر خواہ کتنی ہی زیادہ اُجرت دے بسر اوقات فراغت سے نہ ہو سکے گی، لیکن اگر وہی دشوار کام بہت سے حصّوں میں تقسیم کر کے بعض کام عورتوں اور بچوں کے قابل آسان نکال لیے جائیں تو گھر کے اکثر لوگ کام سے لگ جائیں۔ اور اگر مرد کی شرح اُجرت بہ نسبت سابق کم کر دی جائے اور عورتوں بچوں کو مرد سے بھی کمتر اُجرت دی جائے تو کام بھی مقدار اور عمدگی میں پہلے سے کم نہ ہوگا۔ آجر کو بمشکل اُجرت صرف کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی اس کے مزدور کے گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق کہیں زیادہ ہو جائے گی مصرع چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار۔ البتہ اس نتیجہ کے واسطے یہ شرط لازمی ہی کہ کام کی مقدار اس قدر ہو کہ سب لوگ پورے طور پر مصروف رکھے جا سکیں۔ اگر کام کی مقدار قلیل ہی تو ایک آدمی کا کام چند سے لینا سراسر فضول ہے۔

(ج) تجربہ شاہد ہی کہ مشق سے کمال حاصل ہوتا ہی۔ اوّل اوّل جب ہم گھوڑے یا سائیکل پر چڑھتے ہیں تو کس قدر خوف معلوم ہوتا ہی اور گر گر پڑنا لازمی ہوتا ہی لیکن اسی مشق کی بدولت سرکسوں میں لوگ گھوڑوں اور بائیسکلوں پر وہ کرتب دکھلاتے ہیں کہ کرامات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی مشق کی بدولت درزی کیسے موزوں اور ٹھیک کپڑے تراشتا ہی اور مصوّر کیسی تصویر بناتا ہی کہ جان ڈالنی باقی رہ جاتی ہی۔ دماغی کاموں کا بھی یہی حال ہی اوّل اوّل وکیل و طبیب کو بہت غور و خوض اور ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہی لیکن کچھ تجربہ کے بعد دماغ اس قدر مشّاق ہو جاتا ہی کہ تشخیص مرض یا مشورہ قانونی میں بہت کم اہتمام کی ضرورت محسوس ہوتی ہی۔ پس جب مدت تک آدمی ایک ہی چھوٹے سے کام کو بیشمار مرتبہ دُہراتا رہے گا تو اس کو جو کمال حاصل ہوگا ظاہر ہی۔ چنانچہ ادنیٰ اور اعلیٰ کارخانوں کا عام فرق تقسیم عمل کی قلت و کثرت ہوتی ہی۔ عام دُکانوں پر عموماً

حصہ دوم باب ۷

ایک ہی درزی کپڑے تراشتا اور سیتا ہے لیکن اسکوئیتہ اینڈلارڈ یا باڈھم یا ئل جیسے اعلیٰ سلائی کے کارخانوں میں لباس کی مختلف چیزیں بلکہ ایک ہی چیز کے مختلف اجزا تک تراشنے اور سینے والے جدا جدا ہوتے ہیں۔ بالعموم ایک کپڑے کی تیاری میں کچھ نہیں تو پانچ سات کاریگروں کا ہاتھ لگتا ہے اور نتیجہ ظاہر ہے۔

(د) جب کوئی شخص متواتر ایک ہی کام دُہراتا رہتا ہے تو بصورت دیگر جو وقت کام بدلنے میں ضائع ہوتا وہ بچ رہتا ہے۔ اور کام کی مجموعی مقدار بڑھ جاتی ہے خصوصاً بڑے بڑے کاموں میں اس وقت کی کفایت کا اثر نمایاں ہوتا ہے۔

تقسیم عمل کے فوائد کا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکے گا۔ آڈم اسمتھ اپنے زمانہ کے آلپین سازی کے کارخانہ کا چشم دید حال لکھتا ہے کہ جو آلپین بلا مشق دن بھر میں ایک بھی بمشکل تیار ہو سکتی ہے تقسیم عمل کی بدولت حیرت انگیز سہولت اور سرعت سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے۔ دوسرا اس کو سیدھا کرتا ہے۔ تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے۔ چوتھا نوک نکالتا ہے۔ پانچواں ٹوپی بٹھانے کو دوسرا سرا موزوں کرتا ہے۔ تین چار مسلسل ترکیبوں سے ٹوپی تیار ہوتی ہے۔ ٹوپی جمانا آلپین نکھارنا، اور ان کو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جدا جدا کام ہیں۔ گویا آلپین سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جس کارخانہ کا آڈم اسمتھ نے حال لکھا ہے وہ نہایت ادنیٰ درجے کا تھا لیکن تقسیم عمل کے زور سے دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار آلپین بنا ڈالتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور سو سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں۔

لیکن ہم پہلے بھی جتا چکے ہیں کہ تقسیم عمل مفید ہونے کے واسطے شرط لازمی یہ ہے کہ

حصۂ دوم
باب ۷

کہ کام کی اس قدر کثرت ہو کہ سب لوگ برابر مصروف رہ سکیں جس قدر کام کی قلت ہوگی یہ طریق غیر مفید اور نا قابل عمل ثابت ہوگا۔

تقسیم عمل کی مضرت

۳۔ تقسیم عمل میں جو سب سے بڑا نقص نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مزدور کی واقفیت اور مہارت نہایت مختصر اور محدود ہو جاتی ہے۔ اور فی نفسہ یہ ایک ناپسندیدہ حالت ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔ اول تو مہارت میں جو کمال پیدا ہو رہا ہے اور جو محض بصورت تخصیص ممکن ہے۔ اس نقص کی مضرت سے مقابلۃً کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں تخصیص سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کام کے علاوہ دنیا کی تمام باتوں سے بے خبر ہو جائے بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سب باتیں کچھ کچھ اور چند باتیں پوری پوری جانے۔ خصوصاً علمی تخصیص کا یہی طریق ہے کہ بہت سے علوم سے ابتدا کر کے بڑھتے بڑھتے ایک علم پر آرہے اور اسی میں کمال حاصل کرے۔ چونکہ تمام علوم میں باہمی رشتہ اور تعلق ہے، اس لیے جو شخص ایک ہی علم سے ابتدا کر کے ایک ہی پر اکتفا کرے گا۔ وہ نہ صرف کم علم بلکہ اپنے علم میں بھی ادھورا رہ جائے گا۔ اگر کوئی شخص سوائے طب یا قانون کے کچھ نہ پڑھے اور دنیا کے حالات سے باخبر نہ ہو تو وہ نیم حکیم خطرۂ جاں و نیم وکیل خطرہ آبرو و دولت سے بھی بدتر ہوگا۔ لہٰذا تخصیص سے قلت واقفیت لازم نہیں آتی۔ رہی مزدوروں کی حالت کہ ان کا حلقہ مہارت تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں دوسروں کے بیشتر محتاج ہو جاتے ہیں تو جو کام آسان اور سیدھے سادھے ہیں اُن پر تو یہ اعتراض عائد نہیں ہو سکتا۔ اور جو کام دشوار و مہارت طلب ہیں وہ اکثر مشین سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ایسے کاموں میں بوجہ کمی مہارت مزدور کو مضرت کا جو اندیشہ ہو سکتا ہے، اس کے دفعیہ کا بھی قابل اطمینان طریقہ نکال لیا گیا ہے جس کا مفصل حال مشین کی بحث میں بیان کیا جائے گا۔

حصہ دوم
باب ۲
مشین کا رواج

۴۔ مشین اور آدمی کے کام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مشین ایک ہی کام کو ایک طریق پر دُہراتی رہتی ہے۔ لیکن انسان کے کام میں اس کی مرضی کو بھی دخل ہے اور وہ جب چاہے کام میں تغیر تبدل کر سکتا ہے۔ پس جب تقسیم عمل سے کام کے بہت سے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں تو ایسے ٹکڑے جن کو صرف دُہرانا کافی ہے مشین کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جن ٹکڑوں میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنا پڑتا ہے وہ انسان اپنے ذمہ رکھ لیتا ہے۔ مثلاً سنگر مشین یکساں بخیہ کرتی چلی جاتی ہے۔ لیکن کپڑے کو اس طرح پر گھماتے رہنا کہ تمام جوڑوں پر بخیہ ہو جائے ہاتھ کا کام ہے یا ریلوے انجن کا کام صرف دوڑنا ہے۔ لیکن رفتار کی کمی بیشی اور روکنا چلانا ڈرائیور کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تقسیم عمل اور استعمال مشین میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ مشاہدہ سے ظاہر ہوگا کہ مصنوعات اور وسائل آمد و رفت میں مشین بیحد مستعمل اور کار آمد ہے۔ اور اس کے برعکس تعمیرات میں کمتر اور زراعت میں بہت ہی کم رائج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کاموں میں اوّل تو تقسیم عمل کی گنجائش زیادہ نہیں۔ اور علاوہ ازیں ایسے کام کے ٹکڑے جن کی محض تکرار درکار ہو اور جن کو مشین کر سکے، معدودے چند نکالے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام اب تک بیشتر انسان کے ہاتھ پر منحصر ہیں۔ حالانکہ مصنوعات میں بہت سی چیزیں ہیں جن کی ساخت میں انسان شاید برائے نام ہاتھ لگاتا ہو۔ اور آمد و رفت پر تو ریل جہاز، ٹریم کار اور موٹر نے پورا پورا قبضہ کر لیا ہے۔

مشین کے فوائد

۵۔ جو کام ہزارہا آدمی مل کر نہیں کر سکتے تھے، مشین دو چار آدمیوں کے سہارے سے کر دکھاتی ہے۔ انجنوں کی طاقت کا تخمینہ گھوڑے کی طاقت کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ اور ایک گھوڑے کی طاقت چھ قوی آدمیوں کی طاقت کے برابر مانی جاتی ہے اب اندازہ کرنا چاہیے کہ دس پندرہ بلکہ بیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے انجن جو چند

چلانے والوں کی مدد سے ہر طرف کام کر رہے ہیں، کس قدر بیشمار آدمیوں کی قایم مقامی کرتے ہیں ایک ریل ہی کو دیکھو کہ کس تیز رفتاری سے کتنا وزن ایک انجن اور دو تین چلانے والے ہزارہا میل بلا تکان لیے پھرتے ہیں۔ کیا بلا انجن کے ایسا کرنا ممکن تھا؟ چنانچہ مشین نے انسان کا اقتدار اور تصرف قدرت پر اس قدر بڑھا دیا ہی کہ وہ بہت کم باتوں کو محال سمجھتا ہے۔

(ب) مشین اس قدر نازک کام کرتی ہی کہ اس کا انسان کے وہم وگمان میں بھی گزرنا مشکل ہی۔ ایک انچ کو دس ہزار مساوی حصّوں میں تقسیم کرنا مشین کا ایک ادنی کرشمہ ہی۔

(ج) مشین نہ صرف سخت سے سخت اور نازک سے نازک کام کرتی ہی بلکہ جو کام کرتی ہی جلد سے جلد کرتی ہی۔ چنانچہ اس کی بیشمار مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں تقسیم عمل کے بیان میں ایک قدیم آلپین سازی کے کارخانہ کا حال آدم اسمتہ سے نقل کر چکے ہیں جس میں بتایا گیا ہی کہ دس آدمی ۴۸ ہزار پن روز بنا لیتے تھے اب مشین کی مدد سے ایکہزار آدمی فی ہفتہ ۲۰۵ ٹن پن تیار کرتے ہیں۔ فی پونڈ چار ہزار سے زیادہ پن بنتے ہیں۔ لہذا روزانہ اوسط فی کس تیس ہزار پن ہوتا ہی۔ حالانکہ بلا تقسیم عمل ہاتھ سے دن بھر میں ایک پن بھی بمشکل تیار ہو سکے گی۔

(د) جو کام دستی محنت کے زمانہ میں خاص خاص لوگوں کا حصّہ مانا جاتا تھا اور برسوں کی کوشش سے آتا تھا اب معمولی عورتیں اور بچّے چند مہینوں کی مشق سے کرنے لگتے ہیں۔ سنگر مشین چلانا کیا دشوار ہی اور اس کی سلائی کے سامنے بڑے بڑے کاریگروں کی دستی سلائی ہیچ ہی۔ اس سہولت اور وسعت کام کے فوائد آجر اور مزدور دونوں کے حق میں تقسیم عمل کے فوائد میں واضح ہو چکے ہیں۔

(ہ) مشین کے ذریعہ سے اس قدر یکساں چیزیں تیار ہو سکتی ہیں کہ ان میں سے کسی

حصہ دوم
باب ۷

دو میں تفریق کرنا محال ہے۔ اس سے ایک تو تجارت کو بہت فروغ ہوتا ہے۔ صرف ایک نمونہ دیکھکر اسی قسم کی ہزار چیزوں کی فرمایش بلا تکلف دے سکتے ہیں، کیونکہ ہم کو اطمینان ہے کہ مشین کی بنی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ دوسرے خود مشین کے رواج میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی پُرزا خراب ہو جائے تو اس نمبر کا بعینہ ویسا نیا پُرزا کارخانے سے منگا کر مشین درست کی جا سکتی ہے۔ اس کی مرمت میں کوئی دردسر نہیں اُٹھانا پڑتا ہے۔

(۳) تقسیم عمل پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ حلقہ مہارت کو تنگ کر کے مزدور کو دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے، اس کے دو جواب دیئے جا چکے ہیں۔ سیدھے سادھے آسان کام تو اس اعتراض سے بری ہیں۔ رہے دشوار اور مہارت طلب کام وہ آج کل مشین سے زیادہ تر متعلق ہیں اور اب مختلف مشینوں کی ساخت میں اس قدر مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جو شخص گھڑی سازی کی مشین جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق سے بلا دقت بندوق اور سینے کی مشین بنانے کے کارخانے میں مشین چلا سکتا ہے اور باوجود تخصیص کام بدلنے میں دقت نہیں ہوتی۔ البتہ جو مہارت محض ہاتھ کے کام سے متعلق ہو اس پر یہ اعتراض بظاہر بجا معلوم ہوتا ہے لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کسی چیز کی تجارت کے فروغ اور تنزل کا اثر بنانے والوں پر دونوں حالتوں میں یکساں پڑتا ہے۔ خواہ وہ کُل چیز بنائے یا ایک جزو۔ پس تنگی مہارت سے مضرت کا اندیشہ زیادہ تر وہمی ہے عملاً کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔

مشین کے مذکورۂ بالا فوائد کے متعلق یہاں یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کام کی کثرت شرط لازمی ہے۔

مشین کا اثر مزدوروں پر

۶۔ آیا مشین کا رواج بحیثیت مجموعی ادنیٰ مزدوری پیشہ لوگوں کے حق میں مضر ہے یا مفید۔ اس پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے۔ جس کام کا ماحصل ہم بیان کیے دیتے ہیں۔

(۱) پہلی شکایت یہ ہے کہ مشین کام سہل بنا کر شرح اُجرت بہت گھٹا دیتی ہے۔ جواب دیا

جاتا ہے کہ مشین مصارف پیدائش میں تخفیف کر کے شرح قیمت بھی کم کر دیتی ہے۔ لہٰذا جو نقصان مزدور کو بشکل تخفیف اُجرت پہنچتا ہے، اس کی تلافی ضروریات کی ارزانی سے ہو جاتی ہے۔ یعنی آمدنی کے ساتھ خرچ بھی گھٹ جاتا ہے اور بالجملہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا جواب الجواب ہے کہ جو قیمتی سامان اور تعیشات اکثر مشین سے تیار ہوتے ہیں اور جن کی قیمت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے، وہ مزدوروں کی ضروریات سے بالاتر ہیں۔ اور بالعموم مشین کی بنی چیزیں اس کی ضروریات کا اس قدر جزو قلیل ہوتی ہیں کہ ان کی قیمت کی بچت کمی اُجرت کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر تخفیف اُجرت کے ساتھ ساتھ مزدور کی تمام ضروریات کی قیمت بھی نسبتاً گھٹ جائے تو بیشک نقصان نہ ہوگا۔ لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ مشین کا عمل وسائل آمد و رفت اور مصنوعات میں بیشتر پایا جاتا ہے اور زراعت و عمارت جن سے مزدوروں کی ضروریات کا خاص تعلق ہے، مشین کے حلقہ عمل سے باہر ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مشین سے خوشحال لوگوں کو بشکل ارزانی مصنوعات فائدہ پہنچتا ہے اور مزدوروں کی اُجرت کی تخفیف سے نقصان۔ یہاں ہم یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مشین نے عورتوں اور بچوں کے واسطے بھی طرح طرح کے نئے کام پیدا کر دیئے ہیں اور اگر شرح اُجرت گھٹ بھی جائے تو گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق زیادہ ہوگی۔ کم نہیں۔ اور مزدوری پیشہ لوگ خوشحال رہیں گے۔

(ب) دوسری شکایت یہ ہے کہ مشین بہت سا کام تھوڑے وقت میں کر کے بہت کچھ مزدوروں کو بیکار کر دیتی ہے۔ جواب دیا گیا ہے کہ مشین مصنوعات کی قیمت گھٹا کر ان کی تجارت اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ پہلے سے زیادہ مزدور کام سے لگ جاتے ہیں۔ آج کروڑہا لوگ کتابیں، رسالے اور اخبار چھاپنے میں مصروف ہیں۔ چھاپہ کی ایجاد سے پہلے کتنے خوشنویس کتابیں لکھتے ہوں گے۔ پس ثابت ہوا کہ مشین بجائے کام ضبط کرنے کے

مزدوروں کے واسطے کام بڑھاتی ہے۔ اس جواب پر بھی یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ مشین کے رواج کا اثر تو فوراً مزدوروں پر پڑتا ہے اور ہزارہا بیکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن قیمت کی تخفیف سے پیداوار میں اضافہ ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ گویا باپ دادا کی بیکاری کی مصیبت کا پھل بیٹوں پوتوں کو ملتا ہے۔ یہ شکایت بجا بھی سہی۔ لیکن اکثر جب ضرورت عام مستقبل بہبودی پر موجودہ ذاتی منفعت قربان کرنی پڑتی ہے۔ جو سپاہی وطن کی حفاظت اور ملکی فتوحات میں مارے جاتے ہیں ان کی آیندہ نسلیں آزادی اور حکمرانی کا لطف اُٹھاتی ہیں۔ مشینوں کی فوری مضرت اور مستقبل فوائد کو اس روشنی میں دیکھنا بیجا نہ ہوگا۔

دوسری شکایت کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ مشین سے اگر کچھ مزدور بے کار ہو جاتے ہیں تو بوجہ تخفیف مصارف کچھ اصل بھی ضرورت سے زائد بچ رہتا ہے۔ اور چونکہ محنت اور اصل میں کشش مقناطیسی ہے، بیکار مزدوروں کے واسطے نئے نئے کارخانے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اصل تو نہایت سریع الانتقال گویا پانی کی مانند سیال ہے۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ مگر محنت جو مزدور کی ذات سے لاینفک ہے، اصل کے ہمراہ ہر جگہ نہیں جا سکتی۔ نہ معلوم زاید اصل کہاں کام سے لگایا جائے۔ مثلاً اگر ولایت کا اصل ہندوستان میں کام کرے تو اس سے ولایت کے بیکار مزدور کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں کم و بیش تشویش پیدا کر رہا ہے۔ ہر جگہ بیکار مزدوروں کے چھوٹے بڑے گروہ موجود ہیں۔ ان کو کام سے لگانے کی بہت تدبیریں نکالی جاتی ہیں۔ بہترین دماغ اس مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر مستقل طور پر بیکاری کے نیست و نابود کر دینے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ باکاری و بیکاری بھی نظام عالم کے لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں۔

پیدائش بر پیمانہ صغیر و کبیر

۷۔ اگر کسی شہر میں سو موچی جداگانہ کام کر کے پانسو جوڑہ جوتہ ماہوار بنائیں اور کسی ایک فیکٹری میں بھی پانسو جوڑہ ماہوار تیار ہوں۔ تو گو مقدار پیداوار برابر ہے لیکن طریق پیدائش

حصہ دوم
باب ۷

میں بہت نتیجہ خیز فرق موجود ہے۔ اسی وجہ سے اوّل کو پیدائش بر پیمانہ صغیر دوام کو پیدائش بر پیمانہ کبیر کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بحالت اول محنت اور اصل بہت سے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں منتشر ہوتے ہیں اور بحالت دوم محنت و اصل کی معقول مقدار یکجا فراہم ہو کر عمل پیدائش میں مصروف ہوتی ہے۔ جس زمانہ میں صرف چند آلات اور اوزار سے کام لیا جاتا تھا۔ لوگ جُدا جُدا یا دو چار مل کر کام کرتے تھے۔ مگر جب سے ایجاد کی بدولت بڑے بڑے طاقتور انجن اور قیمتی مشینیں رائج ہوئیں ہزارہا لوگ مل جُل کر یکجا کام کرنے لگے چنانچہ آج کل کی ملیں، فیکٹریاں، کمپنیاں اور کارخانہ جات پیدائش بر پیمانہ کبیر کی عمدہ مثالیں ہیں۔

پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد

۸ (ا) بہت سے کام اس قدر عظیم الشان اور اہتمام طلب ہیں کہ سوائے پیدائش بر پیمانہ کبیر کے اور کسی طرح سرانجام نہیں پا سکتے۔ مثلاً انجن، مشین، آہنی پُل ریل اور جہاز سازی کے کارخانے، ریلوے اور ٹریم کمپنیاں، نہریں کاٹنا اور کان کنی۔

(ب) تقسیم عمل اور استعمال مشین کے متعدد فوائد کم وبیش صرف پیدائش بر پیمانہ کبیر میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کام کی کثرت حصول فوائد کی لازمی شرط ہے۔

(ج) کفایت محنت۔ اگر دس چھوٹے چھوٹے کارخانے ملا کر ایک بڑا کارخانہ بنا دیا جائے تو دس کلرکوں کی بجائے غالباً دو ہی ہوشیار کلرک تمام حساب وکتاب پہلے سے بہتر حالت میں رکھ سکیں گے۔ اور صرف ایک قابل منیجر بہ نسبت سابق کہیں عمدہ انتظام کرے گا۔ اس فائدہ کی بہترین مثال ڈاک خانہ ہے کہ صرف چند ڈاکیئے شہر بشہر کے خطوط تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور بوجہ کفایت محنت صرف ایک یا دو پیسہ میں دُور سے دُور خط جا سکتا ہے۔ اگر دکانوں یا کارخانوں کی مانند کئی کئی ڈاک خانے لوگ ایک ہی شہر میں بطور خود جداگانہ قائم کریں، تو مصارف بہت زیادہ اور کام کی حالت غالباً ابتر ہو گی۔

علاوہ ازیں مزدور اور کاریگر بھی بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنا بمقابلہ چھوٹے کارخانوں کے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لہٰذا پیدائش بر پیمانہ کبیر میں اچھی سے اچھی محنت میسّر آسکتی ہے۔

(د) کفایت مشین۔ دو دو ہزار گھوڑوں کی طاقت والے پانچ انجنوں سے دس ہزار گھوڑے کی طاقت والا ایک انجن زیادہ اور بہتر کام کرسکتا ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئلہ بھی کم خرچ ہوتا ہے۔ جگہ بھی کم گھرتی ہے۔ چلانے والوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ اور دیگر ہر قسم کے مصارف انجن میں کفایت رہتی ہے۔ علاوہ ازیں بوجہ مستقل کثرت کار بڑے کارخانے نہایت اعلیٰ اور بیش بہا مشین لگا کر پورا پورا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس چھوٹے کارخانے معمولی مشین پر قناعت کرتے ہیں۔

(ر) کفایت زمین۔ صنعت و تجارت کے گنجان مرکزوں میں جہاں زمین بہت قیمتی اور کرایہ بہت گراں ہوتا ہے۔ جگہ کی کفایت ایک بڑی کفایت مانی جاتی ہے۔ دس گنا بڑا کارخانہ بنانے کے واسطے دس گُنی زمین اور عمارت درکار نہیں ہوتی۔ کیونکہ انجن گھر مشین گھر، دفاتر اور گوداموں میں اتنی جگہ نہیں گھرتی جتنی کہ دس گُنی چھوٹی ایسی دس عمارتوں میں۔

(س) کفایت اصل۔ سو گنا زیادہ کاروبار چلانے کے لئے زیادہ سے زیادہ بیس پچیس گنا اصل کافی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر سال بھر میں چھوٹے کارخانے دو مرتبہ مال تیار کرتے ہیں تو بڑے کارخانے اس کا ہر مرتبہ دوگنا مال سال میں دس مرتبہ تیار کر ڈالتے ہیں۔ اور خریدار بھی خوشی خوشی نیا اور تازہ مال بڑے کارخانے سے بکثرت خریدتے ہیں۔ جب کسی چیز کا ایک سانچہ تیار ہو جاتا ہے یا کسی کتاب کی کاپی پریس میں کمپوز ہو جاتی ہے، تو اُن سے ہزارہا بلکہ لاکھوں ویسی ہی چیزیں اور کتابیں

تیار ہو سکتی ہیں۔ اسی کام کے لیے بہت سے جُداگانہ سانچے یا کاپیاں کمپوز کرانا مزید محنت واصل کو ضائع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کتاب کی کم کاپیاں چھپوائی جائیں تو شرح مصارف زیادہ اور جتنی زیادہ کاپیاں چھپیں شرح مصارف کمتر ہو گی۔ اسی طرح برقی طاقت اور روشنی جتنی زیادہ مقدار میں تیار ہو گی ارزاں پڑے گی۔ کفایت اصل اضافہ پیداوار میں خاص طور پر تخفیف مصارف کا باعث ہوتی ہے۔

(ص) کفایت مصارف۔ اکثر مذکورہ بالا فوائد سے مصارف میں تخفیف ہوتی ہے علاوہ ازیں چونکہ بڑے کارخانے پیداوارِ خام وغیرہ زیادہ مقدار میں خریدتے ہیں ان کو عمدہ سے عمدہ چیز تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے ملتی ہے۔ اور ریل کے کرایہ اور بار برداری کے مصارف میں بھی معقول کفایت ہو جاتی ہے۔ یہ فوائد چھوٹے کارخانوں کو کمتر میسّر آتے ہیں۔

(ط) ازدیاد منافع۔ ہر کارخانہ دار کی کوشش اصل پر زیادہ سے زیادہ شرح منافع فی صدی سالانہ حاصل کرنا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں چونکہ زیادہ مقدار میں مال جلد جلد تیار ہوتا ہے خریداری بڑھانے کی غرض سے فی چیز شرح منافع کم رکھنے پر بھی سال بھر میں مجموعی منافع کی شرح نہایت اچھی پڑتی ہے۔ اور چونکہ ہر قسم کا تازہ مال ایسے کارخانوں سے مل سکتا ہے، لوگ دُور دُور سے مال منگاتے ہیں اور یہ تمام اسباب مل کر دائرہ حلقہ کی مانند گھوم گھوم کر کارخانہ دار اور خریدار دونوں کو بشکل ازدیاد منافع و تخفیف قیمت فائدہ پہنچاتے ہیں۔

مثلاً اگر ایک کارخانے میں پچاس ہزار کے اصل سے دو دو ہزار چیزیں سال میں چھ مرتبہ کل بارہ ہزار ایک روپیہ فی چیز کے صرف سے تیار ہو کر ایک روپیہ چار آنہ

حصہ دوم باب ۷

فی چیز کے حساب سے بکتی ہیں، تو شرح منافع ۷ فیصدی سالانہ ہوگا۔ لیکن اگر دوسرا کارخانہ صرف دس ہزار کے اصل سے وہی چیز بنائے تو بوجوہات مذکورہ بالا صرف ایک روپیہ سے یقیناً زائد یعنی تخمیناً کم از کم ایک روپیہ دو آنہ پڑے گا۔ اور چیزوں کی تعداد کا سالانہ اوسط بھی نسبتاً کم یعنی زیادہ سے زیادہ دو ہزار رہے گا۔ اس حالت میں چھ فیصدی منافع حاصل کرنے کی غرض سے نرخ ایک روپیہ چار آنہ سے بڑھا کر عہ بلکہ اس سے بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ یا اگر بڑے کارخانہ کے مقابلہ میں ایک روپیہ چار آنہ کے نرخ سے چیزیں فروخت کرنی پڑیں تو چھوٹے کارخانہ کو زیادہ سے زیادہ پانچ روپیہ فی صدی منافع مل سکے گا۔ یعنی بڑے کارخانہ سے ایک روپیہ فی صدی کم۔ حالانکہ نرخ وہی ایک ہے۔ اس فرق کا باعث کفایت مصارف اور کثرت فروخت نہیں تو اور کیا ہے!

(ع) جدت گری۔ اس زمانہ میں جدت بہت بڑی طاقت ہے۔ محض تجربوں پر بڑے کارخانے جتنی رقم صرف کر دیتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کے سرمایہ سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان کے تجربے کامیاب ہو کر دنیا کے رواج اور فیشن میں داخل ہو جاتے ہیں تو معقول منافع و نیز مصارف تجارب بیشمار خریداروں سے بسہولت وصول ہو جاتے ہیں چنانچہ نت نئی چیزیں بنانا گویا نئی ضروریات پیدا کرنا اور لوگوں کو نئے نئے شوق دلانا آج کل اعلیٰ کارخانوں کا سب سے مہتم بالشان کام اور امتیازی نشان بنا ہوا ہے۔

(ف) اشتہار۔ اس زمانہ میں تجارتی ترقی کا ایک بڑا راز اشتہار بھی ہے۔ چنانچہ سنگر اور لپٹن جیسے عالمگیر کاروبار والے کارخانے لاکھوں روپیہ ہر سال صرف اشتہار میں صرف کر دیتے ہیں۔ کوئی ریلوے اسٹیشن، ہوٹل، نمائش گاہ اور اخبار ایسا نہیں کہ

حصہ دوم باب ۷

ان کے اشتہار سے خالی ہو۔ علاوہ ازیں ان کے سفری ایجنٹ دنیا بھر میں ذاتی کوشش سے خریدار بڑھاتے پھرتے ہیں۔ اور کل مصارف اشتہار علاوہ منافع بآسانی خریداروں کی بڑی جماعت سے وصول ہو جاتے ہیں اور کاروبار کو دن دونا رات چوگنا عروج ہوتا چلا جاتا ہے۔

کفایات داخلی و خارجی

۹- اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ بڑے کارخانوں کو چھوٹے کارخانوں سے پیدائش میں بہت زیادہ آسانیاں حاصل ہیں جن کی وجہ سے وہ مال عمدہ اور سستا تیار کر کے حسب دلخواہ منافع اُٹھاتے ہیں۔ ایسی کل آسانیاں **کفایات داخلی** کہلاتی ہیں۔ لیکن کچھ آسانیاں ایسی بھی ہیں جو ترقی عام کا نتیجہ ہیں اور چھوٹے بڑے کارخانوں کو یکساں میسّر ہیں۔ مثلاً ریل و جہاز کی آسانیاں، پیدوار خام اور مشینوں کی ارزانی، پیدائش کی نئی نئی آسان ترکیبیں جو علمی تحقیقات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کو **کفایات خارجی** کہتے ہیں۔ پریس اور تعلیم کی مدد سے کفایات خارجی، کفایات داخلی پر غالب ہوتی جاتی ہیں۔

قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل

۱۰- تقسیم عمل اور استعمال مشین کی تمام بحث سے بخوبی واضح ہے کہ مصنوعات کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے مصارف کی نسبت گھٹتی جاتی ہے۔ یعنی چیزیں سستی تیار ہوتی ہیں، یا سابق مصارف کی وہی مقدار بیشتر چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس حالت کو اصطلاحاً **قانون تکثیر حاصل** کہتے ہیں۔ پیدائش جس قدر بر پیمانہ کبیر ہو گی اس قانون کا اثر قوی ہو گا۔ چنانچہ ریل، جہاز، کپڑے کی ملیں، جوتہ کی فیکٹریاں اور دیگر تعیشات کے کارخانے سب اس قانون کے خاص طور پر تابع ہوتے ہیں۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ زمین کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے۔ پس پیداوار خام میں قانون تقلیل حاصل کا اثر اور صنعت میں قانون تکثیر حاصل کا اثر مضمر ہوتا ہے

حصہ دوم باب ۷

اگر دونوں مساوی ہوں تو مجموعی اثر مصنوعات میں تبکل قانون استقرار حاصل نمودار ہوتا ہے۔ یعنی مصارف کی نسبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ بیشی پیداوار سے بڑھتی گھٹتی نہیں۔ اور اگر کوئی اثر غالب رہا تو مصنوعات بقدر غلبہ اسی کے قانون کی اطاعت کرینگی۔ عمل پیدائش کے یہ تینوں قانون یعنی تقلیل حاصل تکثیر حاصل و استقرار حاصل اکثر مسائل خصوصاً ٹیکس کی بحث میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جس کی موقع بموقع ہم تشریح کریں گے (۳/۳۰)

تحصیر صنائع

۱۱۔ کچھ صنعتیں بعض مقامات سے اس قدر مخصوص پائی جاتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ ان کو رواج دینے کی کوشش اکثر لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ تحصیر صنائع کے اسباب کئی ہیں۔ آب و ہوا کی موافقت، پیداوار خام کی ارزانی، خریداری کی کثرت سرکاری سرپرستی اور کبھی محض اتفاق بھی۔ کشمیری شال دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اگر کشمیری بھیڑیں دوسری جگہ پالی جائیں، یا اون کشمیر سے لیکر دوسری جگہ شالیں بنوائی جائیں، تو تجربہ سے ثابت ہوا کہ کشمیر کی سی نفیس شال تیار نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کشمیر کی آب و ہوا اُن کے ریشے کی نرمی، لمبائی اور مضبوطی کے واسطے بیحد موزوں ہے علی ہذا لنکاشائر اور مانچسٹر جو انگلستان بھر میں کپڑے کی صنعت کے مرکز ہیں وہاں کی آب و ہوا میں ایک خاص نمی پائی جاتی ہے جو تاگے کو نرم اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ ترچناپلی کی آب و ہوا عمدہ تمباکو کی کاشت اور سگرٹ کی ساخت دونوں کے واسطے موزوں ہے۔ بریلی کے گرد و نواح میں جنگل ہے جہاں فرنیچر کے قابل لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے لوہے کے کارخانے بالعموم لوہے یا کوئلہ کی کانو کے قرب وجوار میں قایم کئے جاتے ہیں۔ بنارس میں ہر سال لاکھوں ہندو جاتری جمع ہوتے ہیں ان کی وجہ سے پیتل و تانبے کے برتن بکثرت فروخت ہوتے ہیں۔ دہلی

حصہ دوم
باب ۷

اور لکھنؤ جو مدّتوں بادشاہوں، نوابوں اور امراء کا مسکن رہ چکے ہیں، آج تک وہاں سونے چاندی کے زیورات نہایت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ آگرہ بھی کسی زمانہ میں شاہان مغلیہ کا دارالسلطنت تھا۔ جے پور میں اب تک مہاراجہ رہتا ہے۔ گردونواح میں پتھر کی کانیں بھی موجود ہیں۔ یہاں کے عالیشان محلات مشہور عالم ہیں اور سنگِ مرمر کا کام لاجواب مانا جاتا ہے۔ قصّہ مختصر تحصیرِ صنائع کا رواج ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور اس کے کچھ نہ کچھ اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں۔ تحصیر صنائع بھی گویا ایک قسم کی تخصیص اور مقامی تقسیم عمل کی صورت ہے اور اس سے وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔

تحصیر صنائع بھی تقسیم عمل کی مانند معاون کمال و مہارت ہے۔ آب وہوا میں ایک خاص کاروباری اثر پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک کو مصروف و کامیاب دیکھکر دوسرے کے دل میں کام کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ ضروری معلومات آلات اور پیداوارِ خام بآسانی میسّر آتے ہیں۔ بڑے بڑے ماہر کاریگر اور عمدہ فردور سب آکر ایسی جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور حسب دلخواہ محنت مہیّا ہوجاتی ہے۔ مقابلہ کے جوش میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ مقامی خوشحالی اور صنعت کی ترقی ہوتی ہے۔

صنائع تضمینی و تفہیمی

۱۲۔ مقامی صنعت کے تعلق سے اور بھی چند ایسی صنعتیں پیدا ہوجاتی ہیں جو اس خاص صنعت کو مختلف طور پر مدد دیتی ہیں۔ ایسی صنعتوں کو اصطلاحاً صنائع تضمینی کہتے ہیں۔ مثلاً کانپور میں جوتہ صنعت خاص ہے۔ چمڑہ دھونے اور رنگنے کے مصالحے تیار کرنا جوتوں کے فرمے اور تسمے بنانا، جوتہ رکھنے کے کاغذی ڈبّے اور جوتہ باہر بھیجنے کے واسطے لکڑی کی پیٹیاں تیار کرنا سب صنائع تضمینی کہلائیں گے۔ اسی طرح جہاں مٹی کا تیل نکالنا صنعت خاص ہے۔ کنستر اور لکڑی کی پیٹیاں جن میں کنستر بند

حصہ دوم
باب ۷

ہو کر آتے ہیں، صنائع تضمینی میں داخل ہیں، کاغذ، روشنائی، جلد سازی، پریس کی صنعت خاص سے بطور صنائع تضمینی سے متعلق ہیں۔

اگر خاص مقامی صنعت طاقت طلب ہو جس میں سوائے مردوں کے عورتیں اور بچے شریک نہ ہو سکیں۔ مثلاً کان کنی۔ تو اس حالت میں شرح اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے اور مزدوروں کی خاندانی آمدنی کم۔ وجہ تقسیم عمل میں سمجھائی جا چکی ہے۔ پس اس ناگوار حالت کو رفع کرنے کی یہ سبیل نکالی گئی ہے کہ خاص اہتمام سے کچھ ایسی صنعتیں قائم کی جاتی ہیں کہ جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں شریک ہو کر خاندانی آمدنی بڑھا سکیں چنانچہ ولایت میں لوہے کے کارخانوں اور کان کنی کے قرب وجوار میں آسان صنعتیں مثلاً اون صاف کرنا اور رنگنا، موزے جراب بُننا، کشیدہ کاڑھنا اکثر مروج پائی جاتی ہیں۔ ان کو اصطلاحاً صنائع تضمیمی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں صنعت تضمینی و تضمیمی ایک ہی ہوتی ہے۔

کمپنیاں

۱۳۔ جب تجربہ سے پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بیش بہا فوائد تحقیق ہو گئے تو بڑے بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کی بنا پڑی جن کو ہم بغرض سہولت بیان کمپنی کہیں گے کمپنی سے مراد محنت اور اصل کی مقدار کثیر یکجا فراہم کر کے عمل پیدائش جاری کرنا ہے بعض دولت مند محض اپنے ذاتی سرمایہ سے کمپنی قائم کرتے ہیں۔ لیکن آج کل اکثر کمپنیاں مشترکہ سرمایہ سے چلتی ہیں۔ ہر طبقہ کے لوگ حسب حیثیت و مرضی بشکل خریداری حصص جن کی کچھ قیمت مثلاً سو روپیہ فی حصہ مقرر ہوتی ہے، کمپنی کے سرمایہ میں اپنا روپیہ شامل کر کے کاروبار کے نفع نقصان میں بحیثیت حصہ دار شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک قانون کی رو سے اب کمپنیاں محدود (لمیٹڈ) ہو سکتی ہیں اس سے نقصان کا اثر حصہ کی مقدار تک محدود تھا۔ حصہ دار کی ذات اور دوسری ملک و جائداد پر نہیں پڑ سکتا۔ حصہ داروں کی

حصہ دوم
باب ۲

ایک مختصر انتظامی کمیٹی کی نگرانی میں اکثر تنخواہ دار منیجر کے اہتمام سے کمپنی کاروبار کرتی ہے۔ گورنمنٹ نے ایسے قانون نافذ کر دیئے ہیں کہ حصوں اور منافع کے روپیہ میں کوئی تغلب نہ کر سکے۔ سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً کارخانوں کا معائنہ کرتے ہیں۔ اور سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر سال حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کر مفصل رپورٹ شائع کرنا قانوناً لازمی ہے۔

آجر و منیجر اور تخمین و مخمن

۱۴۔ جو شخص ذاتی یا مستعار سرمایہ سے کمپنی قائم کرے وہ آجر کہلاتا ہے۔ کمپنی کے مہتمم کو منیجر کہتے ہیں۔ اور وہ اکثر تنخواہ دار ہوتا ہے۔ منیجر کے فرائض بہت ذمہ داری کے ہوتے ہیں۔ اس کی حیثیت بعینہ کپتانِ جہاز کی سی ہے۔ نہ صرف تمام مزدوروں کے کام کی نگرانی کرنا اس کا فرض ہے بلکہ وہ تمام دنیا پر نظر دوڑاتا ہے کہ بہترین پیداوار خام سب سے ارزاں کہاں ملتی ہے۔ کہاں کہاں مصنوعات کی خرید زیادہ ہے۔ دوسرے کارخانوں کے مقابلہ میں خریدار اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کیا کیا وسائل مفید اور کارگر ثابت ہوں گے۔ بالفاظ مختصر کاروبار کے فروغ کی عمدہ سبیلیں نکالنا اور ان پر عملدرآمد کرانا منیجر کا فرض ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے واسطے بیحد توجہ، تندہی، دُور اندیشی وسعت معلومات اور زمانہ شناسی درکار ہے۔

کچھ لوگ کمپنی قائم کرنے کے بجائے دوسروں کی کمپنیوں سے ٹھیکہ پر کام کراتے ہیں اور قیمتِ خرید و فروخت کے فرق سے منافع اُٹھاتے ہیں یہ لوگ اگر دُور بین ہوں اور مستقبل کا صحیح اندازہ کر سکیں تو ایسے کاروبار سے بہت منافع اُٹھا لیتے ہیں۔ چونکہ یہ کاروبار محض مستقبل کے تخمینہ سے متعلق ہوتا ہے اس کو تخمین اور کرنے والے مخمّن کہتے ہیں۔ بعض مخمن تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ یا تو کُل روپیہ قرض لے کر یا محض بہت تھوڑے ذاتی سرمایہ سے محض تخمینہ کے بھروسہ پر لاکھوں روپیہ کا کاروبار چلاتے ہیں

ایسے لوگ عموماً بہت ذہین سمجھدار باخبر اور وقت شناس ہوتے ہیں۔ تخمینہ میں شاذ و نادر غلطی کرتے ہیں۔ مگر جب کرتے ہیں تو بری طرح قرض خواہ یا فریق ثانی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ چونکہ اہتمام کا دردِ سر کم اٹھانا پڑتا ہے، تخمین کا یورپ میں بہت رواج ہو چلا ہے۔

حصّۂ سوم

تقسیم دولت

باب آٹھ

دولت کے حصّے دار

زمین محنت اور اصل یہی تینوں مل جل کر دولت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان عاملین پیدائش کو یکجا کرنا اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں اُن سے کام لینا اور ان کے اتفاق عمل سے پیداوار دولت حاصل کرنا، گو ایک قسم کی محنت سہی لیکن فی نفسہٖ اس قدر اہم اور مخصوص شے ہے کہ بغرض امتیاز اس کو تنظیم کہتے ہیں۔ پیدائش دولت کے واسطے ملک میں قیام امن و امان بھی لابُد ہے۔ اور یہ دشوار کام ہر گورنمنٹ نے اپنے ذمّہ لے لیا ہے۔ پس بحیثیت مجموعی دولت کی پیدائش میں زمین، محنت، اصل، تنظیم اور گورنمنٹ پانچ عامل شریک ہوتے ہیں اور پیداوار میں ان کے جداگانہ حصّے علی الترتیب، لگان، اجرت، سود، منافع اور ٹیکس کہلاتے ہیں۔ اب اگر ہر شخص جدا جدا ان تمام عاملوں کا مالک ہوتا تو اپنی کل پیداوار کا بھی بلا شرکت غیرے حق دار بنتا۔ ایسی صورت میں پیداوار کو مذکورۂ بالا عاملوں کے حصّوں میں جُداگانہ ناموں سے تقسیم کرنا بھی فضول ہوتا۔ لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ زمیندار بہت کم اپنی زمین سے خود کام لیتے ہیں۔ بلکہ اکثر اپنے کھیت یا مکان یا دوکان

حصہ سوم
باب ۳

لگان اور کرایہ پر دوسروں کو اُٹھا دیتے ہیں۔ علی ہذا مزدور اکثر اُجرت پر دوسروں کے کھیت اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اصل میں ان کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ اصل داروں کا ایک علٰحدہ گروہ ہے جو آلات اور سامان ضروری مہیّا کر دیتے ہیں اور محنت میں کوئی حصّہ نہیں لیتے۔ یہ لوگ کارخانوں اور کمپنیوں کے حصّہ دار بھی کہلاتے ہیں۔ ایک مختصر مگر بااثر جماعت آجروں کی پیدا ہو چلی ہے جن کا خاص کام تنظیم عاملین ہے۔ جو اصل بھی اکثر دوسروں سے لیکر لگاتے ہیں اور سوائے نگرانی اور اہتمام کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتے رہا امن و امان، سو اس کے قیام کے واسطے گورنمنٹ نے فوج، پولیس اور عدالت جیسے بیش خرچ متعدد محکمے قائم کر رکھے ہیں۔ پس جبکہ تمام عاملین پیدائش ہر شخص کی جداگانہ ملک نہیں بن سکتے اور ان میں سے ہر یک مختلف گروہ کے ہاتھ میں ہے تو پیداوار دولت کو بھی لازماً جدا جدا حصوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ تاکہ ہر مالک اپنا حصّہ لے سکے۔ چنانچہ زمیندار لگان وصول کرتا ہے، مزدور اُجرت پاتا ہے، اصل دار سود لیتا ہے، آجر منافع اُٹھاتا ہے اور گورنمنٹ ٹیکس لگاتی ہے۔ کس اصول کے مطابق یہ مختلف حصّے تقسیم ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں؟ یہ ایک نہایت اہم، پیچیدہ اور معرکتہ الآرا مسئلہ ہے۔ اس پر نہایت قابلیت سے بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے۔ ہم بھی اس حصّہ میں اسی بحث کا ایک سادہ خاکہ پیش کرنے کی کوشش کرینگے۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا بے محل نہوگا کہ لگان، اُجرت، سود اور منافع اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے سے بالکل جُدا اور متمیز ہیں۔ لیکن عرف عام میں یہ اکثر مخلوط بھی کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اُجرت سے مراد پیداوار کا صرف وہ حصّہ ہے جو محنت کا ماحصل ہو۔ لیکن اُجرت عرفی میں اکثر مزدور کے اصل کا سود بھی شامل ہوتا ہے۔ لوہار، بڑھئی باورچی کو جو اُجرت دیجاتی ہے وہ نہ صرف اس کی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے بلکہ فیشکل

آلات جو اصل وہ کام میں لگاتا ہے اس کا سود بھی جزءً اس میں داخل ہوتا ہے۔ علیٰ ہٰذا لگان یعنی زمین کے ماحصل زائد میں کاشتکار کے ہل بیل چرس زمیندار کے کنواں وغیرہ جیسی چیزوں کا سود بھی اصل میں شمار کرلیا جاتا ہے۔ ساہوکار کے سود میں لین دین چلانے کی محنت کی اُجرت اور دیگر مصارف کا معاوضہ بھی شریک ہوتا ہے۔ منافع میں بھی اُجرت تنظیم کے علاوہ آجر کے ذاتی اصل کا سود اور مطالبات خطر داخل ہوتے ہیں۔ اختصار بیان اور سہولت حساب کی غرض سے اگر زبان عرفی میں یہ جُداگانہ حصّے حسب ضرورت مخلوط کردیئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن ان کے حقیقی مفہوم اور اختلاط کی ماہیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

باب نو

لگان

تجزیہ (۱) لگان کی ماہیت (۲) قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے (۳) پیدایش لگان کے شرائط (۴) اقسام لگان (۵) لگان مصارف پیدایش کا جزو نہیں ہوتا (۶) لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدایش کا جزو بن سکتا ہے (۷) قیمت پیداوار لگان کا تعلق (۸) زرعی ترقیات کا لگان پر اثر (۹) ملک ارضی اور کاشت (۱۰) زمینداری لگان (۱۱) سرکاری مالگذاری (۱۲) زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز

لگان کی ماہیت

۱۔ لگان کا مسئلہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کے لحاظ سے جس قدر اہم اور قابل توجہ ہے اسی قدر پیچیدہ اور بحث طلب ہے اس کے اسباب گوناگوں اور پیچ در پیچ اثرات ناقابل تفریق اور تخمینی اصول دقیق و تشریح طلب، فروعات کثیر و گنجان۔ اس میں ترک تفصیل سے مسئلہ سمجھنا آسان تو ہے لیکن تنگی نظر سے مغالطہ میں پڑنا بھی اغلب ہے ہم صحت معلومات کو سہل فہمی پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ماہیت سمجھنے کے واسطے جس قدر تفصیل لابد معلوم ہوئی بلا تامل اختیار کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کی غیر ضروری پیچیدگیاں ترک بھی کردی گئیں تاکہ یہ مسئلہ شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا، کا مصداق نہ بن جائے۔ مگر باوجودیکہ صفائی اور سلاست کی بجد کوشش کی گئی اس مسئلہ کا مطالعہ پھر بھی خاص توجہ کا محتاج ہوگا۔

عرف عام میں لگان سے پیداوار زمین کا وہ حصّہ مراد ہے جو کاشتکار زمیندار یا سرکار کو بموجب رواج یا معاہدہ دیتا ہے۔ لیکن معاشی لگان ایک بالکل مختلف چیز ہے جو قوانین قدرت کے عملدرآمد سے پیدا ہوتا ہے۔ اوّل ایک مثال دیکر ہم اس کی ماہیت بیان کریں گے۔

فرض کرو کہ دس ہزار من گیہوں کسی منڈی میں برائے فروخت آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار بہت سے مختلف الحالات کھیتوں کی پیداوار کا مجموعہ ہے۔ اب تقریباً کھیت کے مصارف پیدائش کی نسبت مختلف اور جُدا گانہ ہونگے، مثلاً دو اور تین روپیہ کے درمیان اس کے بیشمار مدارج ہو سکتے ہیں۔ قلیل فرقوں کو نظرانداز کرکے ان کھیتوں کے چند بڑے بڑے طبقے بنائے جا سکتے ہیں، جن کی نسبتِ مصارف میں نمایاں فرق پایا جائے۔ مثلاً تین درجہ مقرر کیے جائیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ جن کے مصارف کی نسبت علی الترتیب دو روپیہ ڈھائی روپیہ اور تین روپیہ من ہو۔ لیکن باوجود فرق مصارف منڈی میں گیہوں کا نرخ یکساں ہوگا۔ اور اگر مانگ اس قدر زیادہ ہو کہ ادنیٰ کھیتوں کے گیہوں خریدے بغیر نہ رہا جا سکے تو نرخ تین روپیہ من سے کسی حالت میں کم نہ ہوگا ادنیٰ کھیت کا کاشتکار اگر ماحصل زائد بھی نہ پا سکے تو ایسی حالت میں کم از کم مصارف پیدائش تو ضرور پیداوار کی قیمت سے وصول کر سکے گا۔ اعلیٰ اور متوسط کھیتوں کے کاشتکار تین روپیہ من کے نرخ سے علی الترتیب ایک روپیہ اور آٹھ آنے من نفع اُٹھائیں گے اور یہی ماحصل زائد جو فرق مصارف کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے معاشی اصطلاح میں لگان کہلاتا ہے۔

یہاں نرخ کے متعلق دو نکتے واضح کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ بحث بالا سے تعین نرخ کا یہ اصول تحقیق ہو گیا کہ جس قدر مقدار مطلوب ہوتی ہے۔ اس کا نرخ بیشتر ین

مصارف پیدائش کی نسبت سے کم نہیں ہو سکتا۔ ہمیشہ برابر یا کچھ زیادہ ہوگا۔ مساوات نرخ کا مفروضہ جو بظاہر خلاف واقعات معلوم ہوتا ہے تشریح طلب ہے۔ ایک ہی جنس کے چند حصّوں کا نرخ بلحاظ خوبی مختلف ہوتا ہے۔ اور درحقیقت کل مقدار ایک نرخ سے فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر متوسط خوبی کی پیداوار کا نرخ معیار قرار دیکر اعلیٰ خوبی والی کے نرخ کا اضافہ تخفیف مصارف شمار کریں اور ادنیٰ خوبی والی کے نرخ کی کمی از دیاد مصارف سمجھیں تو باوجود فرق خوبی واختلاف نرخ مساوات نرخ کا نتیجہ حاصل ہوگا۔ اور لگان کی بحث میں اس مفروضہ سے یہی مُراد ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ بوجہ افزونی آبادی ومعاشی ترقیات پیداوار زمین کی طلب جسقدر زیادہ ہوگی ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلتی جائے گی۔ جیسا کہ آجکل خود ہندوستان میں ہورہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ ومتوسط زمینوں کے لگان میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے طلب میں کمی آجائے تو ادنیٰ کھیتوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوکر باقی کھیتوں کے لگان میں بھی تخفیف ہوجائے گی۔ پس ثابت ہوا کہ مصارف پیدائش کا فرق جس کے اسباب ہم ابھی واضح کریں گے اور جو طلب کی کمی بیشی سے گھٹتا بڑھتا ہے لگان کا باعث ہے۔ لگان خود پانے والے کی کوشش سے پیدا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ اکثر غیر اختیاری اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ صرف لے لینا پانے والے کا کام ہے۔ لگان کی پیدائش میں اس کو زیادہ دخل نہیں۔

اب ہم مصارف پیدائش کی تفصیل کرتے ہیں جس سے ان کے فرق کی وجہ خود ظاہر ہوجائے گی معمولاً خرچ کی جو مدیں مصارف میں شمار کی جاتی ہیں، درحقیقت اُن سے کہیں زیادہ مدیں مصارف میں شامل ہیں۔ گو روزمرہ کے حسابات میں بغرض سہولت وہ نظرانداز کردی جائیں۔ لیکن علمی بحث میں بحیثیت جزو مصارف ان سب کا پورا لحاظ لازمی ہے۔ چنانچہ تخم اور کھاد کی قیمت، جُتائی، نلائی، آبپاشی، رکھوالی، کٹائی، اور پیداوار کو قابل

فروخت بنانے کے کل کاموں کی لاگت، کھیتی کے مویشیوں کا خرچ، ہل بیل، اور دیگر سامان زراعت میں کاشتکار کا جو اصل لگا ہے اور کنویں، پختہ بر ہے جیسے مستقل ترقیات اراضی جن میں زمیندار کا اصل صرف ہوا ہی، ان سب کا سود۔ یہ اصل قائم دوران استعمال میں جس رفتار سے فرسودہ اور زائل ہو رہا ہے اسی کے مطابق مطالبات فرسودگی کی ایسی شرح سالانہ کہ بیکار ہونے تک کل اصل کی قیمت وصول ہو سکے خود کاشتکار اور اُس کے خاندان کی محنت کی اُجرت، نیز پیداوار کو منڈی تک لانے اور فروخت کرنے کا خرچ یہ سب کچھ مصارف پیدائش میں شامل ہی۔ اتنے لحاظوں سے چند کھیتوں کا بھی مساوی الحالت ہونا محال ہی۔ اول تو قدرتاً زمینوں کی زرخیزی میں فرق۔ اس کے علاوہ کھیت تمام ملک میں منتشر کوئی منڈی کے بالکل قریب، کوئی بیسیوں کوس دور بعض ریل اور پختہ سڑکوں کے ارد گرد بعض دور از راہ قطعات میں واقع۔ آبپاشی کہیں نہایت بیش خرچ اور کہیں بجید ارزاں۔ زرعی ضروریات کی قیمت جگہ جگہ مختلف۔ یہی حال زرعی مزدوروں کی اُجرت کا ہی۔ اور سب پر طرّہ یہ کہ سب کاشتکار بھی یکساں ہوشیار اور محنتی نہیں۔ ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ بمشکل چند کھیتوں کے مصارف پیدائش کا اوسط برابر ہوگا ورنہ عموماً ہر کھیت کا اوسط جداگانہ اور مختلف ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ مثال بالا سے ظاہر ہے، انہی مصارف کے باہمی فرق سے لگان پیدا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ لگان زمین کے قدرتی اور مستقل خواص سے پیدا ہوتا ہی۔ اس قول کی ایک شرح تو خواص زمین کی وہ تفصیل ہی جو اس سے قبل پیدائش دولت کے حصّے میں بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن علاوہ ازیں اس قول سے ایک اور نکتہ جتانا بھی مقصود ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔ فرق مصارف کے جو اسباب بیان کیئے گئے ان میں سے اکثر مثلاً زرخیزی، شرح اُجرت، نرخ ضروریات، موقع اراضی محنت اور اصل کے

حصہ سوم
باب ۹

زور سے بہت کچھ درست اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ ممکن ہی کہ مزید پیداوار جو ان کی درستی اور بہتری سے حاصل ہو وہ اس محنت اور اصل کی معمولی اُجرت اور سود کے برابر ہو یا کم رہے یا کچھ بڑھ جائے۔ لیکن کمی و بیشی مصارف کے چند اسباب ایسے بھی ہیں جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں۔ اور اصل کا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔ عاملین قدرت گرمی، بارش، روشنی اور ہوا زراعت میں زمین، محنت اور اصل کے دوش بدوش کام کرتے ہیں۔ اور پیداوار کی خوبی اور مقدار پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ ان کو مجموعاً قدرتی زرخیزی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ عاملین مفت عطا کیئے ہیں۔ ان کی پیدایش اور ترقی میں محنت اور اصل کا کچھ بس نہیں چلتا ہے۔ ان کی موافقت سے مصارف کی نسبت بہت کچھ گھٹ سکتی ہے۔ ایسی تخفیف مصارف سے جو ماحصل زائد پیدا ہو وہ ہر حالت میں خالص لگان ہوگا حتیٰ کہ بعض علما تو معاشی لگان کی مقدار صرف اسی تک محدود کرتے ہیں۔ جو ماحصل زائد دیگر حالات کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ گو بظاہر لگان معلوم ہو لیکن کل یا اس کا کوئی جزو در پردہ اس محنت اور اصل کی اُجرت اور سود ہو سکتا ہے جو حالات کو موافق بنانے کی غرض سے صرف کیا گیا ہو۔ گویا آخری قسم کے ماحصل زائد کی ماہیت کم و بیش غیر متحقق ہوتی ہے اور اس کا لگان ہونا نہ ہونا برابر ممکن ہی۔

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہی کہ اگر کسی زمین کی قیمت میں لگان کا معاوضہ بھی شامل ہو تو ایسی زمین کے خریدار کے حق میں لگان بھی اصل کا سود بن جائیگا جو اس کے معاوضہ میں قیمتاً دیا گیا اس کے برعکس جو ماحصل زائد دوسروں کی محنت اور اصل سے پیدا ہو مثلاً جدید ریلوے لائن کھلنا، نہر جاری ہونا، یا قرب و جوار میں منڈی قائم ہونا۔ تو وہ بلا شک لگان شمار ہوگا۔ گویا کبھی خود لگان سود بنجاتا ہی اور کبھی وہ ماحصل زائد بھی جو اصل و محنت کا آفریدہ ہو لگان ہو سکتا ہے۔

یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصارف پیدایش کا نہ تو کوئی اس قدر مفصل حساب رکھتا ہے اور نہ رکھ سکتا ہے۔ خاص خاص مصارف مثلاً اُجرتِ مزدوران، خرچ آبپاشی و قیمت تخم وکھاد وغیرہ کا کاشتکار صرف تخمینہ کر لیتا ہے۔ صحیح مقدار ان کی بھی نہیں جانتا اسی وجہ سے کھیت کے معاشی لگان کی ٹھیک مقدار معلوم کرنا نہایت دشوار اور اہتمام طلب ہے۔ مگر تمام حالات متعلقہ بغور مطالعہ کر کے صرف لگان کے پیدا ہونے نہونے اور اس کے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مصارف پیدایش سے خالص لگان کا جُدا کرنا محال ہے۔ البتہ اس کی پیدایش اور کمی بیشی کے عام اصول بخوبی تحقیق ہو چکے ہیں اور علمی اغراض کے واسطے ان کو جاننا کافی ہے۔

قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے

۲۔ قانون تقلیل حاصل کو جو پیداوارِ زمین پر خاص طور سے مسلط پایا جاتا ہے اور جس کی تشریح خواص زمین کے بیان میں کی جا چکی ہے، مسئلہ لگان کا سنگ بنیاد سمجھنا مبالغہ نہوگا۔ اگر یہ قانون ہر کھیت کی کاشت کی حد معین نہ کرتا تو اعلیٰ درجہ کے متوسط اور ادنیٰ درجہ کے کھیت کبھی نہ بوئے جاتے اور موجودہ طریق سے لگان حاصل نہوتا۔ لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ پیدایش لگان کے واسطے ادنیٰ زمینوں کی کاشت لازمی ہے درست نہوگا۔ بلکہ بفرض محال اگر تمام کھیتوں کی زرخیزی دیگر حالات اور مصارف پیدایش کی نسبت سب یکساں ہوں، تو بھی اس قانون کے عمل سے لگان پیدا ہونا ممکن ہے۔ مثلاً محنت اور راس کے پہلے جرعہ کی پیداوار کے مصارف دو روپیہ فی من دوسرے کی $2\frac{1}{2}$ روپیہ من اور تیسرے کی تین روپیہ من ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب تک تیسرے جرعہ کی پیداوار کی قیمت سے کم از کم مصارف پیدایش پورے نہوں، کاشتکار تیسرا جرعہ نہیں لگا سکتا۔ پس اگر بوجہ اضافہ طلب تیسرے کی پیداوار بھی ناگزیر ہو جائے تو نرخ تین روپیہ من سے کم نہوگا۔ اور ایسی حالت میں بھی یکساں کھیتوں کے کاشتکاروں کو جرعۂ اوّل و دوم کی پیداوار پر ایک روپیہ اور آٹھ آنے من

حصہ سوم لگان حاصل ہو سکے گا اور یہ محض اسی قانون کا نتیجہ ہوگا۔

باب پس صاف ظاہر ہے کہ لگان مصارف پیدائش کے فرق سے پیدا ہوتا ہے یہ فرق قانون تقلیل حاصل پر مبنی ہے۔ خواہ مختلف زرخیزی اور مختلف حالات کے کھیتوں سے متعلق ہو یا یکساں حیثیت کے کھیتوں سے۔ اضافہ طلب سے اس فرق کا اثر قوت پکڑتا ہے۔ اگر یکساں اور محدود زمین کاشت کے لیے میسر آسکے تاکہ جس سے قانون تقلیل حاصل کے عمل کی نوبت ہی نہ آئے، یا پیداوار زمین قانون استقرار حاصل کی پابند ہو۔ اور ہر جرعہ کے مصارف یکساں ہوں۔ یا طلب اس قدر کم زور ہو کہ ادنی کھیتوں کی کاشت یا بیش خرچ جرعوں کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے تو ان تینوں صورتوں میں سے کسی میں بھی لگان پیدا ہونا ممکن نہیں۔

پیدائش لگان کے شرائط

۳۔ پیدائش لگان کی بحث میں ہم نے چند خاص حالتیں فرض کی ہیں جن کو شرائط لازمی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ سب سے اوّل تو کل پیداوار زیر بحث کا ایک ہی منڈی میں فروخت ہونا، دوسرے خرید و فروخت میں کامل آزادی اور مقابلہ۔ تیسرے طلب اور رسد کی قوت میں برابری۔ اوّل کی دو شرطوں کا اہم ترین نتیجہ مساوات نرخ ہے اور شرط آخر سے نرخ کا بیشترین مصارف کے برابر ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ اگر پیداوار چند منڈیوں میں فروخت ہو یا بوجہ پس ماندگی نرخ بجائے مقابلہ کے رسم و رواج اور دیگر اثرات کا تابع ہو، یا طلب رسد سے کم ہو، تو لگان پیدا ہونے کا موقع بہت کم رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں نہ نرخ کا یکساں ہونا یقینی، نہ بیشترین مصارف کے برابر ہونا ممکن۔ گویا شرائط قائم نہ رہنے سے اسباب کا اثر ضعیف ہو کر لگان کا پیدا ہونا نہ ہونا محض اتفاق پر منحصر رہ جاتا ہے۔

لگان کی اقسام

۴۔ اگر پیداوار کی طلب رسد پر غالب ہو جائے تو نرخ بیشترین مصارف پیدائش سے بھی بڑھ سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہزار من غلہ کی طلب ہو اور صرف آٹھ سو من منڈی میں موجود ہو تو

باوجودیکہ بیشترین مصارف تین روپیہ من ہوں، نرخ کا ۳ ½ اور ۲ من تک چڑھنا دشوار نہوگا۔ ایسی حالت میں ادنیٰ کھیتوں یا انتہائی جرعوں کی پیداوار سے جو ماحصل زائد ملیگا اور اسی نسبت سے باقی کھیتوں یا جرعوں کے لگان میں جو کچھ اضافہ ہوگا یہ کل معمولی معاشی لگان سے جُداگانہ چیز ہے۔ اور چونکہ تعین رسد اور کثرت طلب سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کو لگان قلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایسا لگان جو اکثر فوری اسباب سے پیدا ہوتا ہے زیادہ دیر پا نہیں ہوسکتا۔ اضافۂ رسد بتدریج کچھ عرصہ میں اس کو زائل کردیتا ہے۔ بہت کم زرعی پیداوار اس قدر مخصوص ہیں مثلاً مشرقی بنگال کا سن کہ جس سے عرصہ دراز تک لگان قلت ملنا ممکن ہو۔ یہاں یہ بھی واضح کرنا مفید ہوگا کہ معاشی لگان اور لگان قلت میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ جو ماحصل زائد بیشترین مصارف کے مساوی قیمت سے پیدا ہوتا ہے وہ اوّل قسم کا لگان ہے اور جو قیمت کے مزید اضافہ سے جدید ماحصل زائد ملتا ہے وہ امتیازاً قسم دوم شمار کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر معاشی لگان کی پیدایش میں چند ایسے کھیتوں کی کاشت یا جرعوں کا استعمال فرض کیا جاتا ہے کہ ان کی پیداوار کی قیمت مصارف پیدایش کے برابر ہوتی ہے۔ اور جب یہ قیمت مصارف سے بڑھ جائے تو جدید اضافہ لگانِ قلت متصور ہوگا۔ لیکن درحقیقت دونوں لگان تعین رسد اور کثرت طلب یا بالفاظ دیگر قلت پیداوار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین کی پیداوار بھی ہوا اور روشنی کی مانند لامحدود ہوتی تو لگان ہرگز وجود میں نہ آتا۔ زرعی زمین کی طرح سکنی زمین سے بھی لگان حاصل ہوتا ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ موقع جو منجملہ اور بہت سے اسباب کے پہلی قسم کے لگان کا ایک سبب ہوسکتا ہے دوسری قسم کے لگان کا خاص باعث ہوتا ہے۔ باموقع عمارت سے بمقابلہ بیموقع مساوی الحیثیت عمارت کے جو زیادہ کرایہ حاصل ہوتا ہے وہی سکنی زمین کا لگان ہے۔ اسی طرح کان کی زمین کا جو محصول لیا جاتا ہے اس کا بڑا حصّہ تو معدنیات کی قیمت ہوتا ہے

حصّہ سوم باب ۹

باقی لگان بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ فرق مصارف کا نتیجہ ہو۔ بعض علما نے تو لگان کے معنوں کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اگر کسی خاص پیدائشی قابلیت کی وجہ سے کوئی شخص اپنے ہم پیشوں سے زیادہ اُجرت کمائے یا کسی خاص اتفاقی آسانی سے کسی کارخانہ کو دوسروں سے زیادہ منافع ملتا رہے تو اس مقدار زائد کو اصطلاحاً شخصی لگان یا لگان اجارہ کہتے ہیں۔ پانیوالے کی کوشش بغیر وہ محض کسی غیر اختیاری فرق کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں کچھ محنت اور اصل لگتا تو وہ بجائے لگان کے اُجرت اور سود میں شمار ہوتا۔ اقسام کی بحث سے لگان کی سب سے زیادہ قابل توجہ خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مُفت عطیہ ہے جو اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف و محنت حاصل ہوتا ہے۔

لگان مصارف پیدایش کا جزو نہیں ہوتا

۵۔ منڈی میں جو پیداوار آتی ہے اس کے مختلف حصّوں کے صرف پیدایش میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن کل مقدار مطلوبہ کا نرخ بیشترین مصارف کے کم از کم برابر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کمتر مصارف والوں کو ماحصل زائد ملتا ہے جس کو لگان کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لگان کسی حصّہ کے مصارف میں بھی داخل نہیں اور اسی وجہ سے اس کا نرخ پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ خود نرخ کا آفریدہ ہوتا ہے۔ نرخ کی کمی بیشی سے یہ بھی گھٹتا بڑھتا ہے۔ اپنی طرف سے نرخ میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ بالفاظ مختصر لگان اضافہ نرخ کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث۔ چنانچہ اگر زمیندار یا ہر کار لگان (بشرطیکہ معاشی لگان کی برابر یا اس سے کم ہو) لینا چھوڑ بھی دے تو کل لگان کاشتکار کی جیب میں جانے لگے گا اور نرخ پیداوار میں ترک مطالبہ لگان سے کوئی تخفیف نہ ہوگی لگان کو جزو مصارف نہ کہنے سے اسی واقعہ کا اظہار مقصود ہے۔

لگان کیونکر

۶۔ جبکہ تمام کھیتوں میں ایک ہی چیز کاشت کیجائے تو لگان نہ مصارف پیدایش

حصّہ سوم باب ۹ بالواسطہ مصارف پیدائش کا جزو بن سکتا ہے

کا جزو ہوتا ہے نہ اضافہ قیمت کا باعث۔ لیکن جبکہ مختلف چیزیں کاشت ہوتی ہوں تو ایک پیداوار کا لگان دوسری پیداوار کے صرف میں بالواسطہ شامل ہو سکتا ہے۔ کسان تو وہی فصل بوئے گا جس سے بیشترین لگان ملنے کی امید ہو۔ اور جب تک کم از کم اسی قدر لگان کی اُمید دوسری فصل سے نہو، وہ فصل اوّل کے بجائے فصل دوم نہ بوئے گا۔ مثلاً کسی کھیت میں آلو کی کاشت سے پچاس روپیہ لگان حاصل ہو آلو بوتے وقت کسان کو یقین ہو گا کہ اس سے زیادہ لگان بلکہ اس قدر بھی کسی دوسری فصل سے نہیں مل سکتا۔ اور اگر واقعہ بھی یہی ہو تو یہ کاشتکار بجائے آلو کے گیہوں اُسی وقت بوئے گا جبکہ جدید فصل سے بھی کم از کم پچاس روپیہ لگان مل سکے بلکہ کسی قدر زیادہ۔ فرض کرو کہ گیہوں کی طلب بڑھے، ادنیٰ کھیتوں کی پیداوار بھی مل کر رسد ناکافی رہے اور آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف پیدائش ادنیٰ کھیتوں کے مصارف سے کم نہوں تو اس صورت میں آلو کا کُل لگان گیہوں کے مصارف پیدائش کا جزو بنے گا اور اضافہ نرخ کا باعث ہو گا۔ آلو کا لگان گیہوں کا نرخ بعینہ اس طرح چڑھائیگا جیسے نہر کی جھال پانی کی سطح بلند کرتی ہے۔ مثلاً ادنیٰ کھیتوں کے مانند آلو کے کھیت میں بھی گیہوں کے مصارف تین روپیہ من ہوں اور مقدار پیداوار سو من۔ اب اگر یہ مقدار بوجہ قلت رسد ناگزیر ہو تو کاشتکار آلو کا پچاس روپیہ لگان گیہوں کے مصارف میں شمار کر کے تین روپیہ آٹھ آنہ من کے نرخ سے گیہوں فروخت کریگا۔ صاف ظاہر ہے کہ آٹھ آنہ قیمت محض آلو کے لگان کی بدولت نرخ میں اضافہ ہو گا۔ نیز اگر آلو کے کھیت میں مصارف ادنیٰ کھیتوں سے زیادہ یا کم ہوں مثلاً ۳ روپیہ ۴ ر من یا دو روپیہ بارہ آنہ من تو نرخ علی الترتیب تین روپیہ بارہ آنہ من اور تین روپیہ چار آنہ من قرار پائے گا لیکن آلو کا لگان ہر حالت میں داخل مصارف رہ کر اضافہ قیمت کا باعث ہو گا۔ اس صورت میں ادنیٰ کھیتوں کو بھی ماحصل زائد ملیگا جس کو لگان قلت کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔

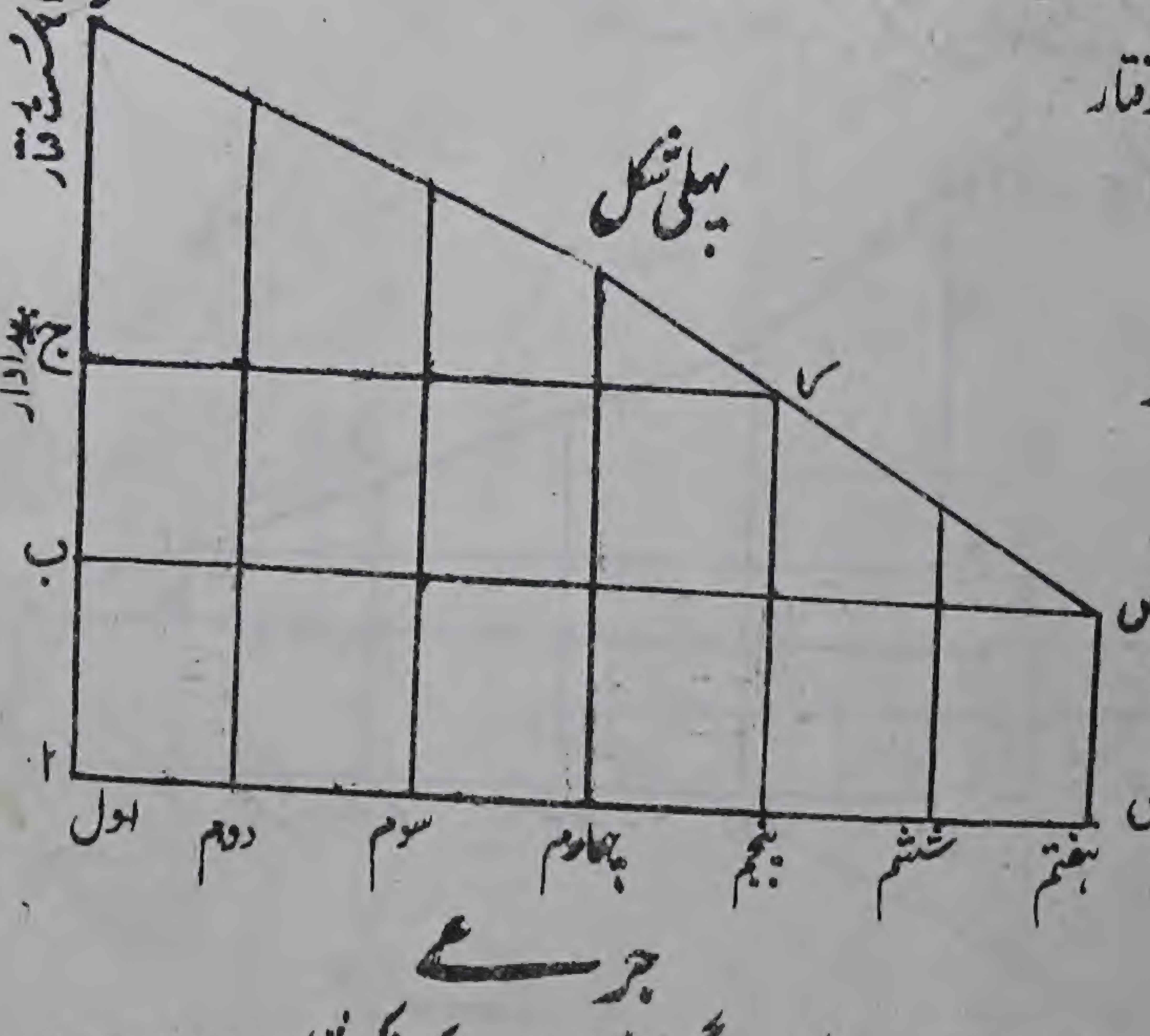
حصہ سوم
باب ۹

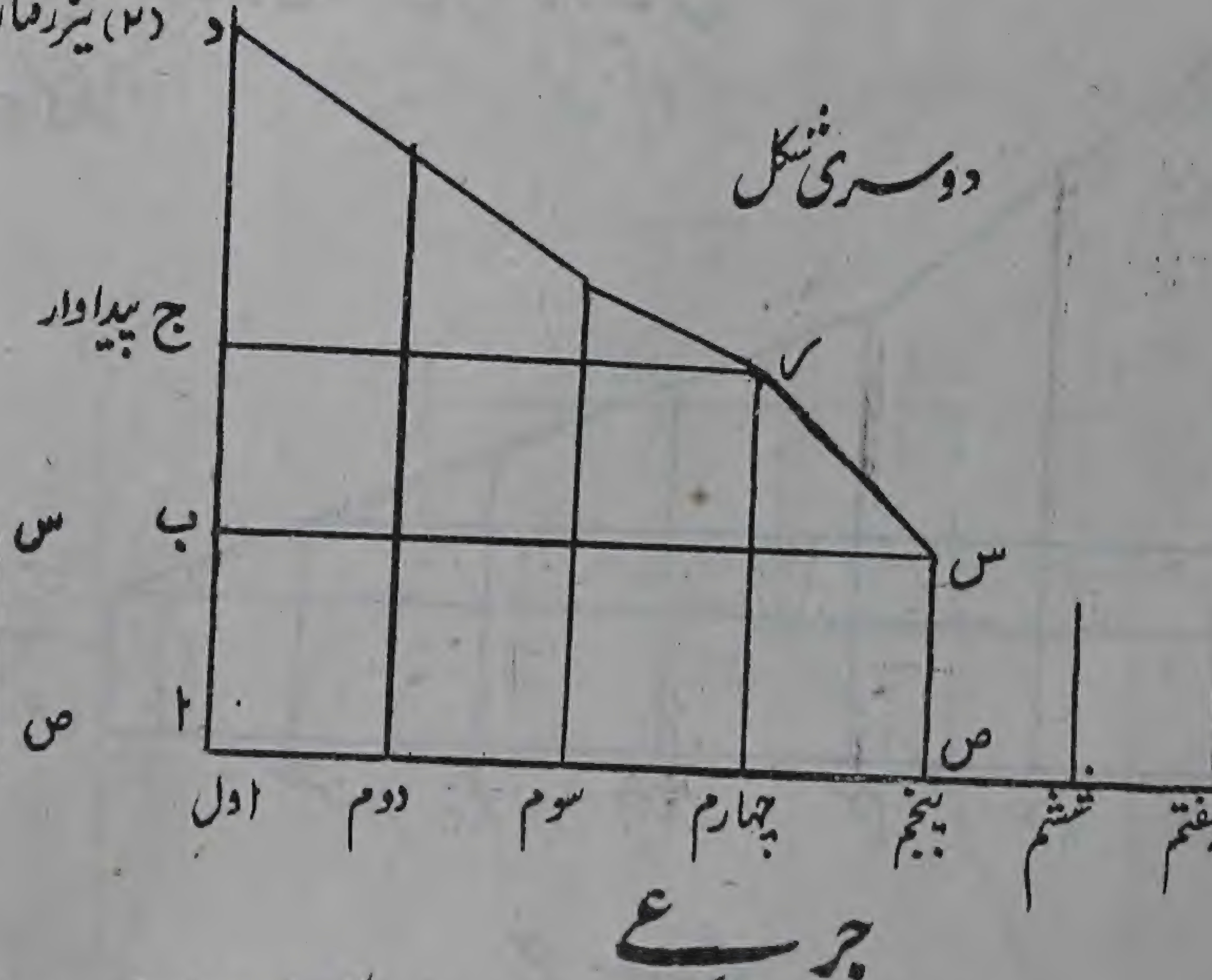
یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہو گا کہ اگر آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف ادنی کھیتوں کے مصارف سے اس قدر کم ہوں کہ آلو کا لگان شامل ہوکر آخر الذکر مصارف کی برابر رہیں تو گویا کسان کے نزدیک آلو یا گیہوں بونا دونوں یکساں ہے - ہر حالت میں ایک ہی لگان ملیگا - اور اگر اس سے کم ہوں تو گویا کاشتکار کو گیہوں کی کاشت سے بمقابلہ آلو کے زیادہ لگان حاصل ہو گا - اور ان دو صورتوں میں سے کسی میں بھی آلو کا لگان جزو مصارف نہو گا - گویا آلو کا لگان گیہوں کے مصارف میں اسی وقت شامل ہو کر اضافہ نرخ کا باعث ہو سکتا ہے - جبکہ یہ مجموعی مصارف گیہوں کے ادنی زمینوں کے مصارف سے زیادہ ہوں اور قلت رسد کی وجہ سے آلو کے کھیت میں پیدا ہوئے گیہوں بھی طلب پوری کرنے کے واسطے ناگزیر ہوں -

قیمت پیداوار اور لگان کا تعلق

۷ - جب کسی زرعی پیداوار کی قیمت بڑھتی ہے تو نہ صرف ادنی کھیتوں پر کاشت پھیلنے لگتی ہے بلکہ اعلی کھیتوں کی کاشت بھی زیادہ دقیق ہوتی جاتی ہے - اور پیداوار کی بشیتر مقدار قانون تقلیل حاصل کے تحت میں پیدا ہوتی ہے لیکن ہر کھیت میں اس قانون کے عمل کی رفتار یکساں نہیں - جہاں سست ہوتی ہے نسبت مصارف میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے - جہاں تیز ہو گی چند ہی جرعوں کے مصارف کی نسبت میں بسرعت نمایاں فرق پیدا ہو جائے گا - اب ہم یکساں اور مختلف زرخیزی والی زمینوں کے لگان پر عمل قانون تقلیل حاصل کی سست اور تیز رفتار کے لحاظ سے اضافہ قیمت کا اثر بذریعہ اشکال واضح کریں گے - کیونکہ محض الفاظ سے یہ مسئلہ ایسی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا - اس کے سمجھنے میں اشکال بعید مفید ثابت ہوئی ہیں -

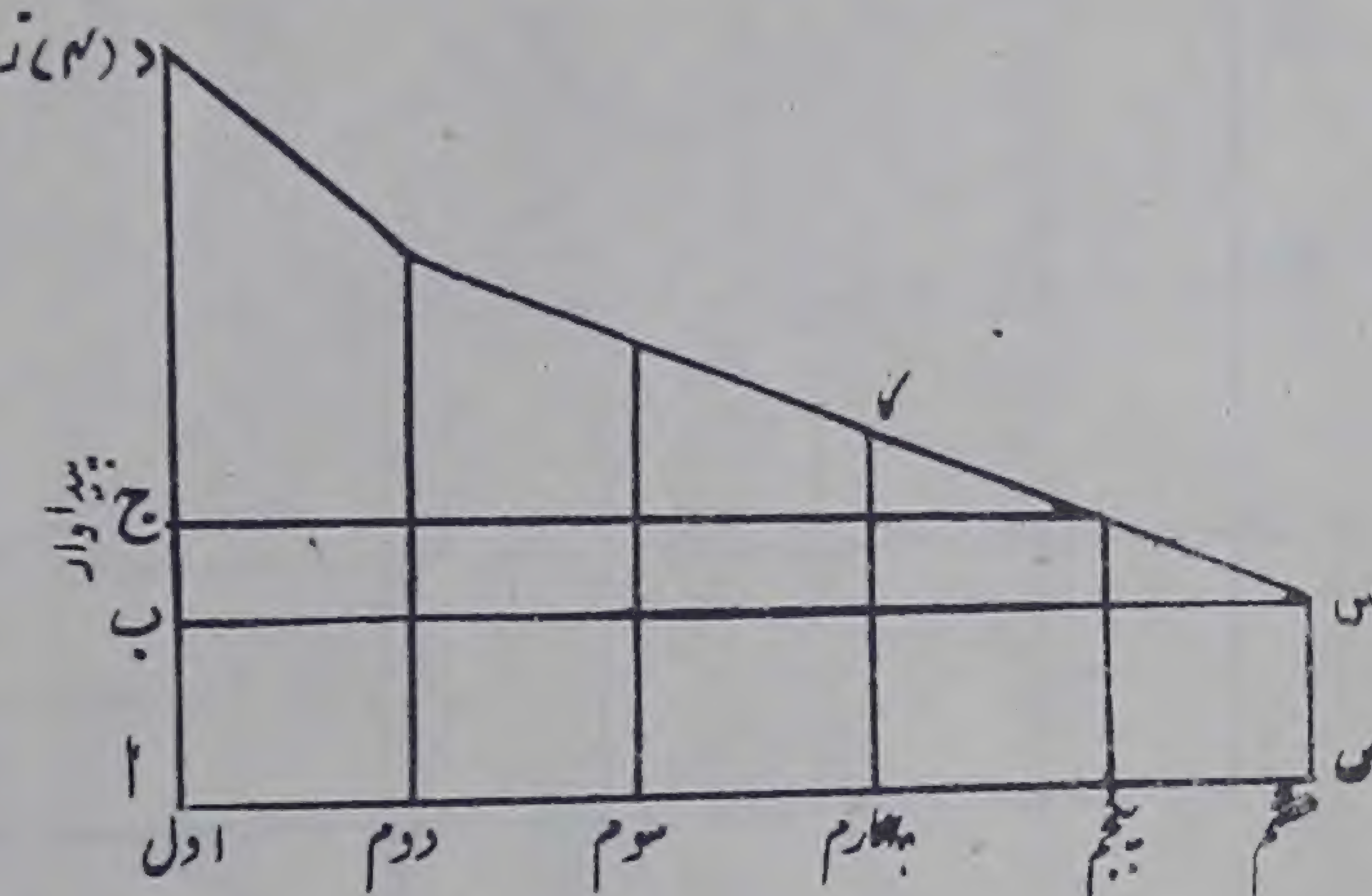
حالت اول۔ زرخیزی یکساں۔ عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف



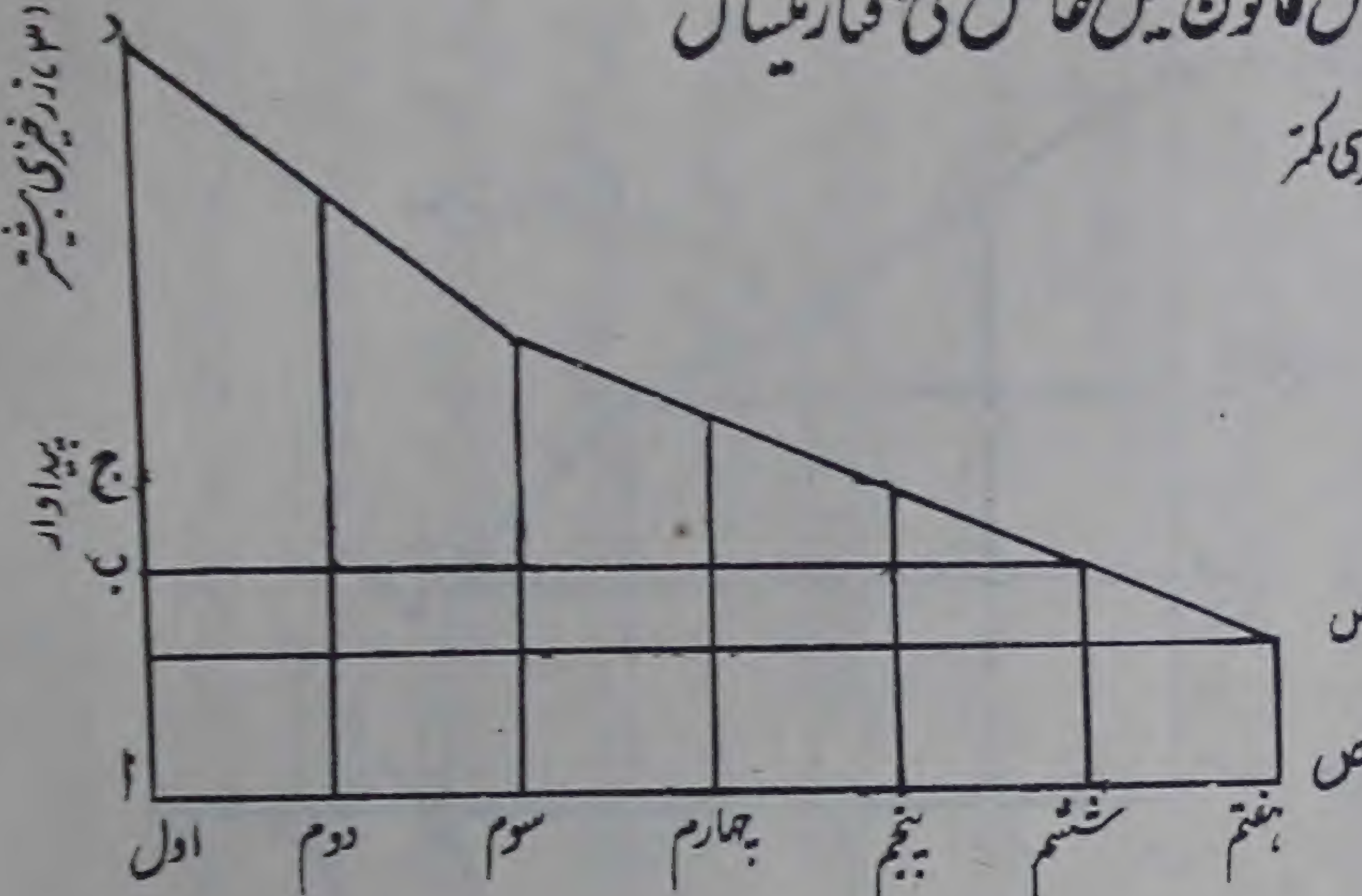


شکل اول میں ہر جدید جرعہ کی پیداوار بتدریج گھٹتی ہے یعنی مصارف نسبتاً آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور دقیق کاشت بڑھانے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس کے برعکس شکل دوم میں جدید جرعوں کی پیداوار بسرعت گھٹتی ہے۔ اور نسبت مصارف جلد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کاشت دقیق پانچویں جرعہ پر ختم کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ پیداوار کا نرخ اس قدر بڑھے کہ بجائے مقدار ا ج کے ا ب ہر جرعہ کے مصارف پورے کردے تو لگان میں بمقدار ب ج ر س اضافہ ہو کر مجموعی مقدار بجائے ج د ر کے ب د س ہو جاوے گی مقابلہ سے ظاہر ہے کہ شکل اول میں اضافہ لگان ب ج ر س کی مقدار نسبتاً شکل دوم کی مقدار سے بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ اضافہ نرخ سے قانون تقلیل حاصل کے عمل کی تیز اور سست رفتار کے مطابق علی الترتیب لگان میں اضافہ کم و بیش ہوگا۔

حالت دوم۔ زرخیزی مختلف۔ عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں



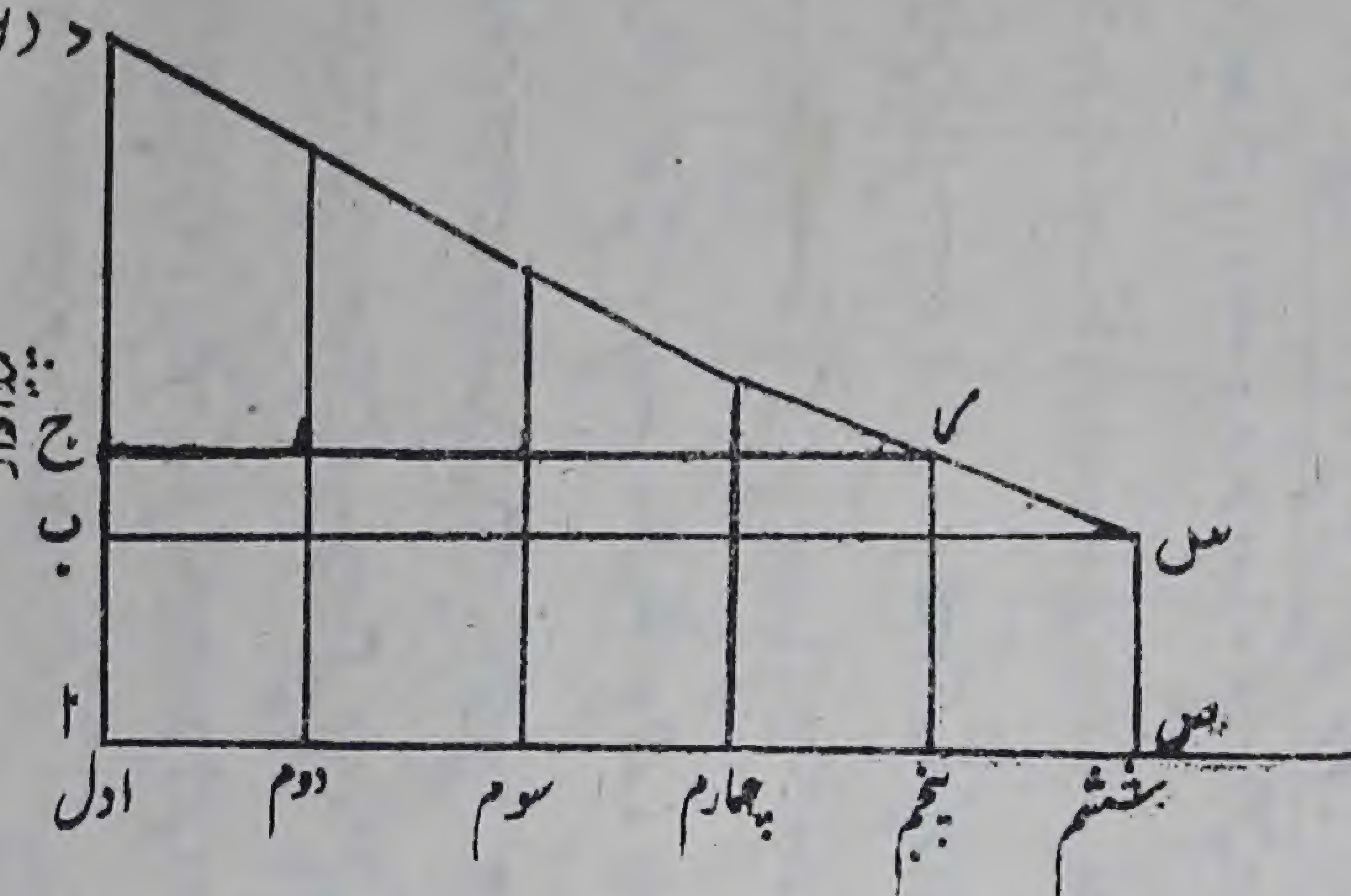
جرع



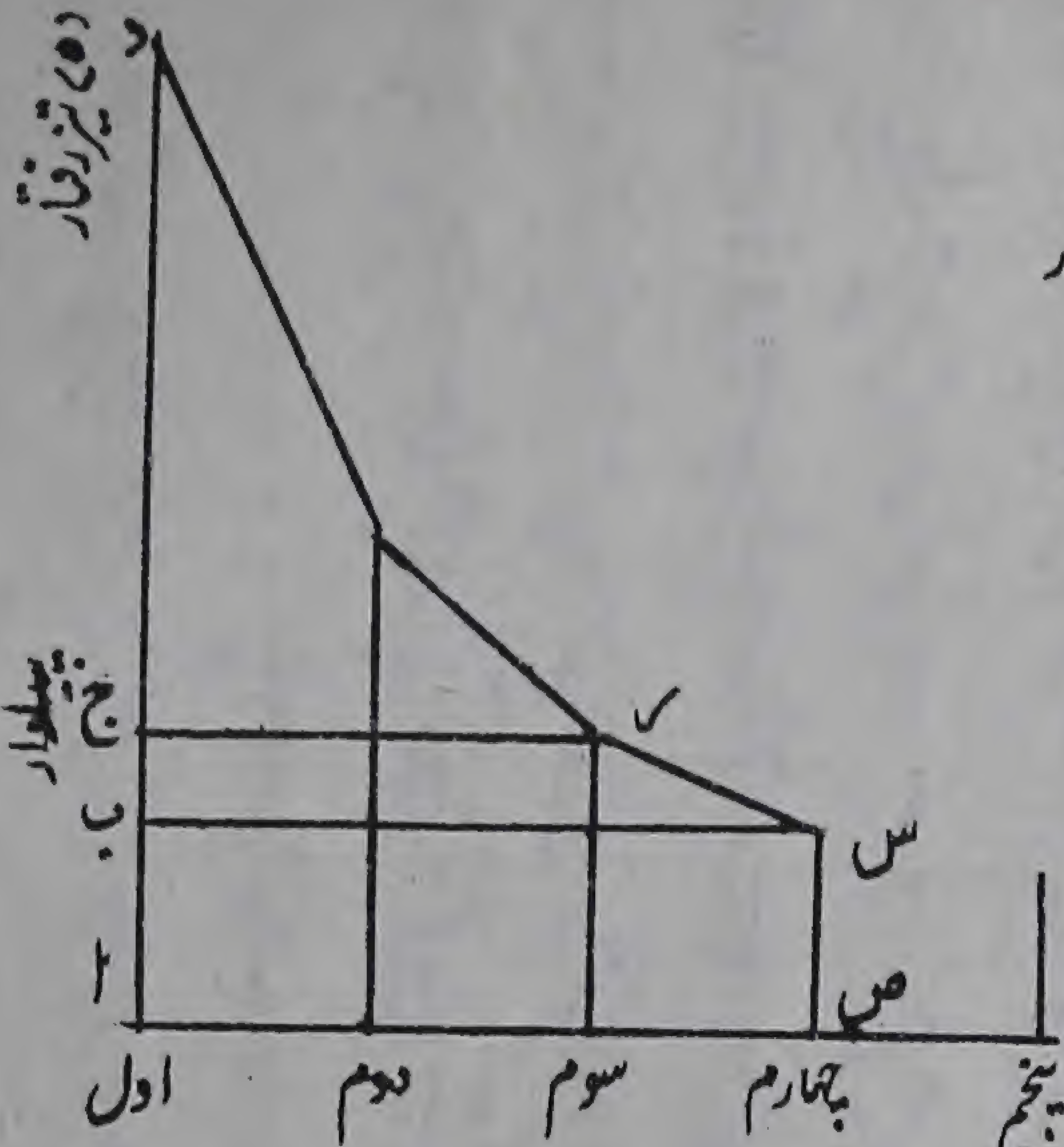
جرع

شکل ۳ کی زمین شکل ۴ کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے لیکن قانون تقلیل حاصل دونوں پر ایک ہی رفتار سے عمل کرتا ہے۔ اضافہ نرخ سے جو جدید لگان ب ج ر س حاصل ہوا اس کی نسبت سابق لگان ج د ر سے شکل چہارم میں بمقابلہ شکل سوم کے زیادہ موافق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر قانون کے عمل کی رفتار یکساں ہو تو کمتر زرخیز زمین میں بمقابلہ زیادہ زمین کے لگان نسبتاً زیادہ بڑھیگا۔

حالت سوم - زرخیزی مختلف - عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف



چرے



چرے

شکل پنجم کی زمین شکل ششم کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے لیکن ساتھ ہی اس کے زمین اول میں قانون تقلیل حاصل کا عمل نہایت تیز ہی اور زمین دوم میں سُست نتیجہ یہ ہے کہ نرخ بڑھنے سے رفتار عمل قانون کی فرق کی بدولت کمتر زرخیز زمین کے لگان میں بمقابلہ بیشتر زرخیز زمین کے زیادہ اضافہ ہوگا۔

حصہ سوم
باب ۹

حالت چہارم - زرخیزی یکساں - عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں -

ظاہر ہے کہ اضافہ نرخ سے ایسی یکساں زمینوں کے لگان میں مقابلتاً کوئی فرق پیدا نہ ہوگا - ایک ہی نسبت سے لگان میں اضافہ ہوگا -

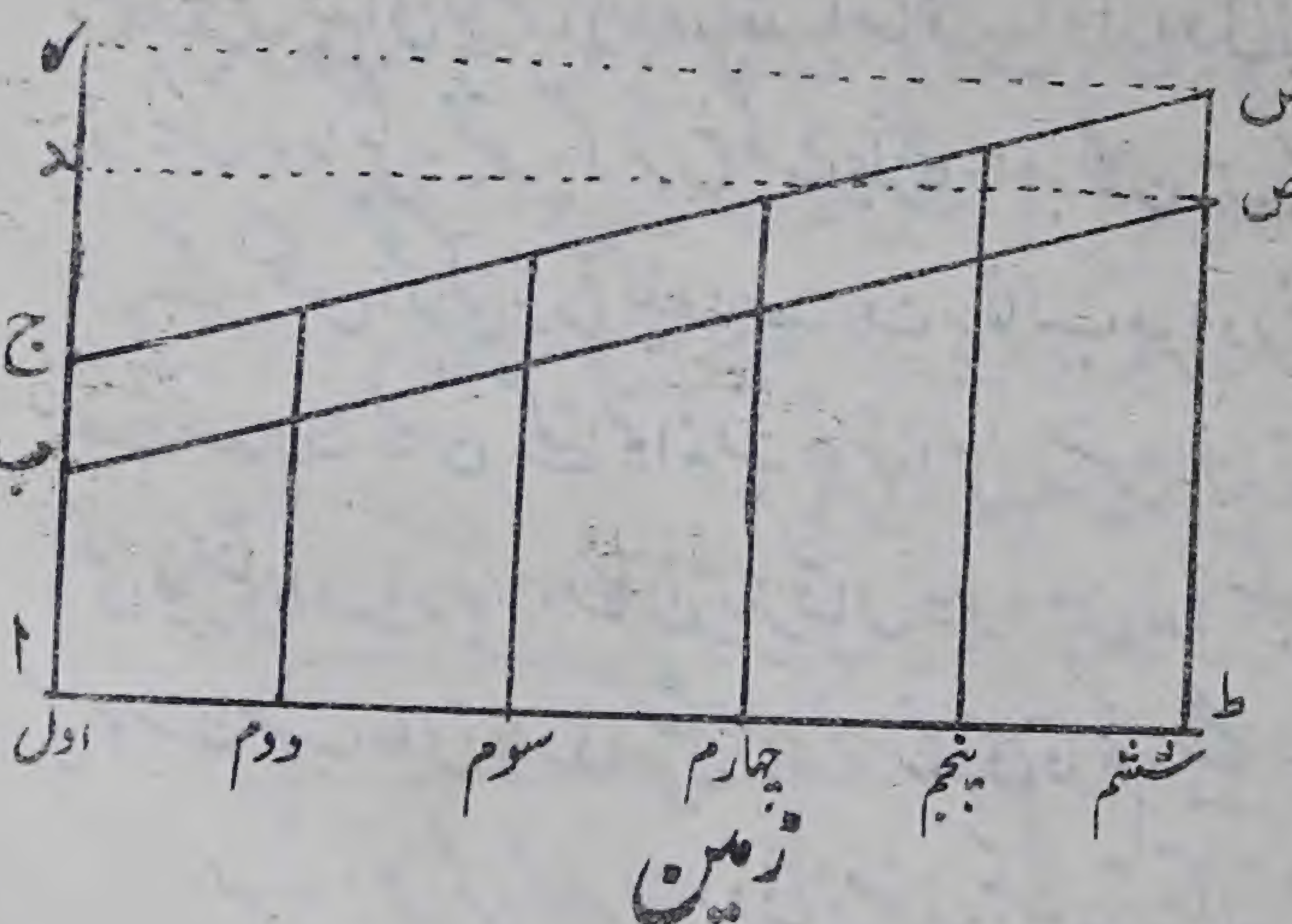
مذکورہ بالا نتائج سے ایک عملی ہدایت واضح ہوتی ہے - وہ یہ کہ اگر اضافہ نرخ کی اُمید ہو تو کمتر زرخیز زمینوں کو جن میں عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار بھی سست ہو، بہ قیمتِ حیثیت موجودہ خریدنا آئندہ اضافہ نرخ پر بہت کچھ منفعت کا باعث ہوگا - کیونکہ ایسے کھیتوں میں اضافہ لگان کی نسبت سب سے زیادہ موافق ہوگی - چنانچہ واقع میں اعلیٰ کھیتوں کی قیمت نسبتاً اس قدر نہیں بڑھ رہی ہے جس قدر کہ اوسط اور ادنیٰ کھیتوں کی -

مختلف اور یکساں زرخیز زمینوں کے لگان پر بلحاظ رفتار عمل قانون تقلیل حاصل اضافہ نرخ کا اثر بالتفصیل بیان ہو چکا - اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ کس طرح اضافہ نرخ سے لگان میں دو طرح کا اضافہ ہوتا ہے - کیونکہ بوجہ اضافہ نرخ بہ نسبت سابق کمتر مقدار پیداوار مصارف پیدائش پورا کر سکتی ہے - اول تو مقدار لگان میں اضافہ ہوگا - اس کے علاوہ اضافہ شدہ مقدار لگان کی قیمت بھی اسی نسبت سے بڑھ جائیگی - مثلاً کسی کھیت میں ۲۰ روپیہ کی لاگت سے ۶ من غلہ پیدا ہو - اب اگر نرخ ۴ روپیہ من قرار پائے تو لگان کی مقدار ایک من قیمتی ۴ روپیہ ہوگی - اور اگر کسی وجہ سے قیمت ۵ روپیہ من ہو جائے تو نہ صرف لگان کی مقدار ایک من سے دو من ہو جائے گی بلکہ قیمت بھی بجائے ۴ روپیہ من کے ۵ روپیہ من ہو جانے سے بجائے ۴ روپیہ کے ۱۰ روپیہ ہوگی - پس ظاہر ہے کہ اضافہ نرخ سے لگان میں دوگونہ اضافہ ہوتا ہے - اوّل مقدار میں دوم اس کی قیمت میں - اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر نرخ گھٹ جائے تو لگان میں اسی طرح دوگونہ تخفیف ہوگی - اول مقدار میں، دوسرے اس کی قیمت میں -

حصہ سوم باب زرعی ترقیات کا لگان پر اثر

۸۔ زرعی ترقیات کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ کہ صرف مصارف پیداوار میں تخفیف کریں اور مقدار پر ان کا کچھ اثر نہو۔ مثلاً جدید ریلوے لائن یا پختہ سڑک کا اجرا قرب وجوار میں نئی منڈی کا قیام۔ دوسرے وہ کہ زمین کی زرخیزی بڑھا کر ہر جرعہ اور ہر کھیت کی قوت پیدائش میں اضافہ کریں۔ گویا تخفیف مصارف کے ساتھ مقدار پیداوار میں بھی اضافہ ہو۔ مثلاً کھاد، آبپاشی، زرعی محنت کی ارزانی، جدید آلات کا رواج اور طریق کاشت کی ترقی۔ اب ہم دونوں قسم کی ترقیوں کے نتائج سے جداگانہ بحث کرتے ہیں۔

(۱) ترقی قسم اول۔ مقدار پیداوار قائم، مصارف میں تخفیف۔ اس ترقی سے اگر صرف اعلیٰ زمینیں مستفید ہوں اور ادنیٰ زمینیں بالکل محروم رہیں تو نرخ میں کوئی تخفیف نہو سکے گی صرف اعلیٰ زمینوں کا لگان اور بڑھ جائیگا۔ اس کے برعکس اگر یہ ترقی صرف ادنیٰ کھیتوں تک محدود ہو تو نرخ ضرور گھٹ جائیگا اور اعلیٰ کھیتوں کے لگان میں دو گونہ تخفیف ہو گی۔ لیکن اگر اعلیٰ ادنیٰ دونوں زمینیں یکساں مستفید ہوں یعنی سب کے مصارف میں بمقدار معین برابر تخفیف ہو تو نرخ گھٹے اور مقدار لگان میں اضافہ ہو گا۔ لیکن لگان کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہو گی۔ یہ پیچیدہ نتیجہ شکل ذیل سے بآسانی سمجھ میں آسکے گا۔



اس شکل میں اول کمترین وبیشترین مصارف اور قیمت لگان علی الترتیب اج۔ طس اور

حصہ سوم
باب ۹

ج ر س کے زرعی ترقیات کی بدولت مصارف میں بقدر ص س برابر تخفیف ہو کر ہر سہ مذکورہ بالا مدین علی الترتیب ا ب۔ ط ص اور ب د ص ہو گئیں۔ اصول اقلیدس کی رو سے ج ر س اور ب د ص دونوں مثلث برابر ہیں۔ گویا قیمت لگان میں اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن چونکہ نرخ میں تخفیف ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ بہ نسبت سابق لگان کی مقدار بڑھ گئی ہو گی۔ واضح ہو کہ ادنیٰ اور اعلیٰ تمام کھیتوں کو جن کی پیداوار زیر بحث ہے ایک قطعہ اراضی تصور کر کے ہر ایک کے مصارف بترتیب اضافہ اس شکل میں دکھا کر تخفیف مصارف کا اثر لگان کی مجموعی مقدار اور قیمت پر دکھایا جا سکتا ہے زمینوں کے جداگانہ لگان میں جو تبدیلیاں واقع ہونگی وہ اس قدر گوناگوں ہو سکتی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

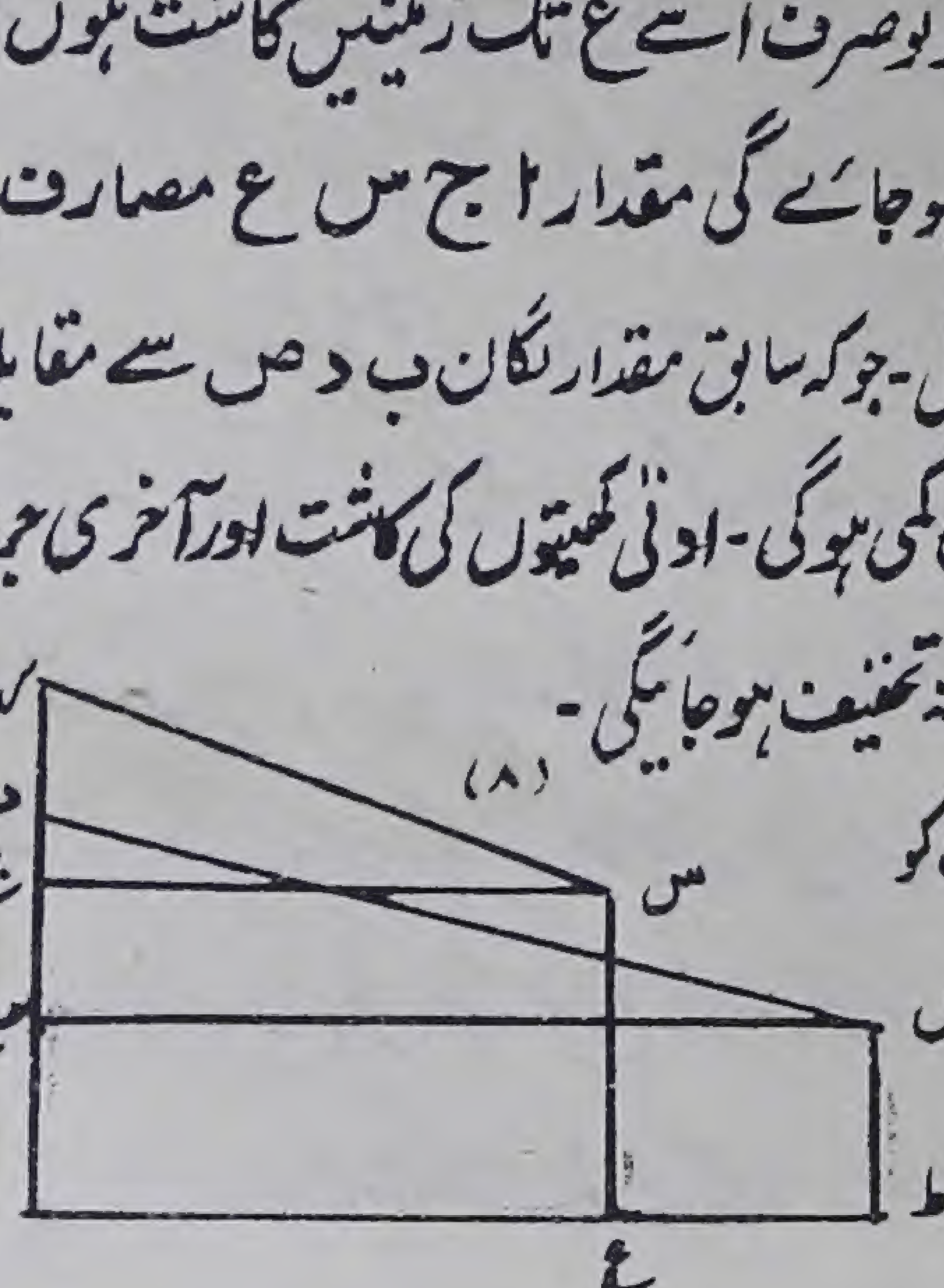
(ب) ترقی قسم دوم۔ پیداوار میں اضافہ نسبت مصارف میں تخفیف ظاہر ہے کہ بوجہ اضافہ پیداوار نرخ میں تخفیف ہو گی۔ فرض کرو کہ صرف اعلیٰ زمینوں پر ان ترقیات کا عملدرآمد ممکن ہے۔ اگر تخفیف مصارف کمی نرخ سے زیادہ رہے اور باوجود کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان میں تخفیف مصارف کی بدولت اضافہ ہو سکے تو یہ ترقیات اعلیٰ زمینوں میں پیدا کی جائیں گی اور بقدر اضافہ پیداوار ادنیٰ زمینوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہو جائیگی۔ نتیجہ یہ کہ نرخ گھٹ جائیگا۔ اور لگان میں بھی اضافہ نہ ہو سکے گا اس کے برعکس اگر کمی نرخ تخفیف مصارف پر غالب ہو اور نرخ کی کمی سے باوجود تخفیف مصارف لگان گھٹنے کا اندیشہ ہو تو اعلیٰ زمینیں ان ترقیات سے قصداً محروم رکھی جائینگی اور باوجود امکان یہ ترقیاں وجود میں نہ آسکیں گی۔ ادنیٰ زمینوں کی کاشت حسب سابق جاری رہیگی اور نرخ بھی قائم رہیگا۔

دوسرے فرض کرو کہ صرف ادنیٰ زمینوں تک یہ ترقیاں محدود ہوں۔ تو ان کے

پیدا کرنے سے ادنیٰ زمینوں کو کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ ہوگا۔ غالباً نرخ میں بقدر تخفیف مصارف جلد کمی نہ ہوسکے گی اور کم از کم کچھ عرصہ تک مزید ماحصل ملنا ممکن ہوگا۔ ایسی حالت میں اعلیٰ زمینیں بے بس اور لاچار ہونگی اور ادنیٰ زمینوں کی ترقیات کا نتیجہ بذریعہ کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان کی وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ لیکن اگر کل اعلیٰ ادنیٰ زمینیں ان ترقیات سے یکساں مستفید ہوسکیں یعنی سب کی پیداوار میں برابر بقدر معین اضافہ ہوسکے تو بوجہ اضافہ پیداوار نرخ میں کمی ہو کر۔ اکثر ادنیٰ زمینوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوجائیگا اور لگان میں وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ یہ نتیجہ بھی شکل ذیل سے صاف ظاہر ہوگا۔

اس شکل میں ایک ہی معین جرعہ کی بیشترین اور کمترین پیداوار اعلیٰ اور ادنیٰ زمینوں سے علی الترتیب ا ر اور ص ط ہے۔ ا سے ط تک کل زمینیں کاشت ہوتی ہیں۔ مقدار ا ب ص ط مصارف کاشت ادا کرتی ہے اور ب د ص داخل لگان ہے۔ اب ترقیات کی بدولت ہر جرعہ کی پیداوار بقدر د ر برابر بڑھ جائے اور پیداوار کی مقدار ا ر س ع۔ مقدار د ص ط کے برابر ہو تو صرف ا سے ع تک زمینیں کاشت ہوں گی اور ع سے ط تک کی کاشت بتدریج ترک ہوجائے گی مقدار ا ج س ع مصارف پورے کرے گی اور مقدار ج ر س لگان بنجائیگی۔ جو کہ سابق مقدار لگان ب د ص سے مقابلۃً بہت کم ہے۔ گویا ترقیات کی بدولت نرخ میں کمی ہوگی۔ ادنیٰ کھیتوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوگا۔ اور لگان میں دوگونہ تخفیف ہوجائیگی۔

(۸)



اس شکل میں بھی ہم نے مثل شکل نمبر ۷ کل زمینوں کو ایک قطعہ اراضی تصور کرکے ترقیات کا اثر لگان کی مجموعی مقدار اور قیمت پر ظاہر کیا ہے۔ ہر زمین کی جداگانہ

حصہ سوم
باب ۹

تبدیلیوں کے متعلق بوجہ کثرت اختلافات کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

واضح ہو کہ ترقیات کا لگان پر جو اثر پڑتا ہے، اس کا ہر حال میں صحیح صحیح پتہ لگانا محال ہے۔ ہم نے صرف چند نہایت عام اصول قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن تغیر حالات سے ان اصول کے عملدرآمد میں بیحد ردوبدل ممکن ہے۔ یہ جتانا بھی لازمی ہے کہ مذکورۂ بالا نتائج چند ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو ہمیشہ واقعات کے مطابق نہیں ہوسکتے وقت اور پیچیدگی سے بچنے کے لیے ہم نے کل نتائج میں طلب کو معین اور غیر متبدل فرض کیا۔ حالانکہ طلب میں برابر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی سے نتائج کی صحت پر بہت کچھ موافق یا مخالف اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح حسب ضرورت بعض نتائج میں پیداوار کے اضافہ اور مصارف کی تخفیف کو بھی یکساں بمقدار معین فرض کیا ہے حالانکہ اکثر یہ تبدیلیاں ہر زمین میں بمقدار مختلف ہوتی ہیں۔ یہ اعتراض بجا ہوگا کہ خلاف واقع حالات فرض کر کے نتائج مرتب کرنے سے واقعات سمجھنے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔ تحقیق کا یہ بھی ایک مسلمہ علمی طریق ہے جس کو طریق تسہیل کہتے ہیں۔ پیچیدہ مسائل کے سُلجھانے میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے۔ چند عام مفروضات متعلقہ کو خواہ ایک حد تک وہ بعید از واقع ہی کیوں نہوں، سیدھے سادے اصول قرار دیکر بتدریج واقعات کے اثر کا لحاظ کر کے ان عام نتائج میں ردوبدل کرنے سے بالآخر نتائج واقعات کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے بعض پیچیدہ مسائل کا حل کرنا اگر محال نہیں تو بدرجہا دشوار ضرور ہوگا۔ مسئلہ لگان کے مختلف پہلوؤں پر اس وقت تک جو کچھ کہا گیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بحث کا تعلق سال بہ سال جیسے مختصر دوران وقت کے بجائے سالہا سال کے وسیع زمانہ سے ہوتا ہے۔ تمام اسباب و نتائج متعدد سال کے عرصہ پر مبنی ہیں۔ سالانہ عارضی تبدیلیاں اس بحث میں ناقابل لحاظ سمجھی جاتی ہیں۔

حصہ سوم
باب ۹
ملک اراضی اور کاشت

۹۔ اکثر مہذب ممالک میں زمینداروں کا ایک ممتاز گروہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بیشتر زرعی زمینیں ان کی ملک ہوتی ہیں۔ لیکن خود کاشت کرنے کے بجائے وہ اکثر پیداوار کے مقرر حصے یا رقم معین کی فصلانہ ادائے گی کے معاوضہ میں جس کو قانوناً لگان کہتے ہیں، دوسرے لوگوں کو وقت معین کے واسطے اپنی زمین پر کاشت کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی یہی طریق بکثرت رائج ہے۔ ملک اور کاشت کی موجودہ علیحدگی سے زراعت کی ترقی میں بڑی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں جن کو رفع کرنے میں قانون بہت سرگرمی سے مصروف نظر آتا ہے چنانچہ کاشتکار کا تعلق زمین سے محض چندروزہ ہوتا ہے اور اضافہ لگان کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے وہ کھیت کی درستی اور کاشت کی ترقی میں ایسی جان توڑ کوشش نہیں کرتا جیسی کہ خود مالک ہونے کی حالت میں کرتا اور سچ پوچھو تو ایسا کرنا محض اقتضائے فطرت ہے۔ تعلق کے عارضی ہونے کا خیال اور حاصل کے ایک جزو سے بھی محروم رہنے کا اندیشہ خود قدرتاً کوشش کے منافی ہے۔ قانون ان موانع کا زور توڑنے کی بہت کوشش کر رہا ہے۔ زمیندار کو خود اس کے ذاتی نفع کے دباؤ سے زیادہ زیادہ عرصہ کے واسطے کاشتکار کو حق کاشت دینے کی بدرجہ مجبوری ترغیب دیتا ہے۔ اضافہ لگان پر طرح طرح سے حدود اور بندشیں قائم کرتا ہے۔ اور بیدخلی کے وقت کاشتکار کو زمیندار سے اُن تمام ترقیات کا معاوضہ دلاتا ہے جو کاشتکار نے اپنے صرف سے کھیت میں پیدا کی ہوں۔ بعض صورتوں میں کاشتکاروں کو تقریباً نیم ملک کی حد تک حقوق دے دیئے جاتے ہیں ان پر لگان بڑھانا نہایت دشوار اور ان کو بیدخل کرنا شاذ و نادر ممکن ہوتا ہے۔ اور بعض بیدخلی سے قطعاً مستثنےٰ کر دیئے جاتے ہیں۔ ان حقوق کے پیدا ہونے کی شرائط جو قانون نے مقرر کی ہیں وہ بھی زیادہ سخت نہیں۔ ایسے خاص حقوق والے کاشتکار دخیلکار اور باقی عام غیر دخیلکار

حصہ سوم
باب ۹

کہلاتے ہیں۔ غرضکہ قانون نے کاشتکار کو اضافہ لگان، بیدخلی اور معاوضہ ترقیات کے لحاظ سے زمیندار کے جبر و تشدد کے مقابلہ میں بہت معقول اماں دی ہے۔ اور غرض وجہ یہی ہے کہ کاشتکار ترقی زراعت میں دل سے کوشش کرے اور اپنی کوشش کا پھل پائے۔

زمیندار و کاشتکار اور خود کاشت زمیندار دو طریق مروج ہیں۔ اول بہت عام ہے۔ لیکن دوم بدرجہا بہتر ہے۔ ملک اور کاشت کی جدائی جس قدر ترقی زراعت کے منافی ہے ان کی یکجائی اسی قدر معاون ہے۔ چنانچہ قانون کا خاص منشا طریق اول کو حتی الوسع طریق دوم کے مشابہ بنانا قرار پا چکا ہے۔ معاشیین کا ایک گروہ سرکار و کاشتکار کا طریق تجویز کرتا ہے۔ گویا قوم اور گورنمنٹ کو زمیندار کا جانشین بنانا چاہتا ہے۔ اس جدید طریق پر بہت کچھ اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔ حامی اس کو طریق دوم پر قابل ترجیح بتاتے ہیں۔ معترض خلاف انصاف اور ناقابل عمل ثابت کرتے ہیں۔ ہم بھی اسکی خوبیوں اور نقائص سے اسی فصل کے آخر میں مختصراً بحث کریں گے۔ $(\frac{۱۲}{۹})$

زمینداری لگان

۱۰۔ زمیندار کاشتکار سے جو لگان لیتا ہے۔ اس کا ایک جزو تو اس اصل کا سود ہوتا ہے جو زمیندار نے اس زمین کے خریدنے اور اس کی ترقیات میں لگایا ہے۔ جو کچھ باقی رہے وہ کاشتکار کو حق کاشت دینے کا معاوضہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی مقدار کا جو رواج یا قانون یا معاہدہ کے مطابق قرار پاتی ہے، معاشی لگان کے مساوی ہونا ضرور نہیں۔ اگر کم ہے تو کاشتکار کا فائدہ ہے۔ اگر برابر ہے تو نہ فائدہ نہ نقصان اور اگر زیادہ ہے تو کاشتکار مقدار زائد یا تو اپنی ذاتی محنت اور اصل کے اجرت و سود میں سے یا بشرطیکہ طلب رسد پر غالب ہو، اس کو داخل مصارف کرکے اور نرخ بڑھا کر جدید ماحصل زائد سے ادا کرے گا۔ گویا زمینداری لگان کا معاشی لگان سے زائد حصہ یا تو غریب کاشتکار کی ذاتی اُجرت اور سود کاٹ کر اس کو ہمیشہ کے واسطے خستہ حال

یا چند روز میں تباہ کر دے گا۔ یا بحالت غلبہ طلب داخل مصارف ہو کر نرخ چڑھا دے گا اور خریداروں یعنی عوام کی جیب سے ادا ہوگا۔ لیکن زائد حصہ اکثر کاشتکار اور خریدار دونوں مل کر ادا کرتے ہیں جس کا نتیجہ نہ صرف زرعی پیداوار کی گرانی بلکہ کاشتکار کی تباہ حالی بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے حالات ابھی نایاب نہیں ہیں لیکن کم ضرور ہو رہے ہیں۔

زمین کی رسد اور طلب کا زمینداری لگان پر خاص اثر پایا جاتا ہے۔ نو آباد ملکوں میں جہاں زمین بکثرت دستیاب ہو سکتی ہے، زمینداری لگان اصل کے سود سے بہت کم بڑھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس قدیم ممالک میں جہاں آبادی گھنی ہے، زمین کی قلت ہے اور عام ذریعہ معاش زراعت ہے زمینداری لگان معاشی لگان سے بھی بڑھکر یا تو کاشتکار کو زیر بار کرتا ہے یا پیداوار کے خریدار کو۔ بالفاظ دیگر کاشتکار کی آمدنی گھٹاتا ہے یا نرخ پیداوار چڑھا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان اور آئرلینڈ کے بعض حصوں میں یہ نوبت آچکی ہے۔ قانون حتی الامکان زمینداری لگان کو حد اعتدال سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔

یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ زمینداری لگان کیونکر قرار پائے؟ آیا وہ پیداوار کا کوئی مقررہ حصہ ہونا چاہیے مثلاً تہائی۔ چوتھائی یا بہ حساب پیداوار بشکل زر مقرر ہو ۸ آنہ یا روپیہ من یا کوئی مقدار معین ہو۔ مثلاً دس یا پندرہ من یا کوئی رقم مثلاً چالیس یا پچاس روپیہ۔ لگان قسم اول سب سے بہتر ہے کیونکہ زمیندار مقدار اور نیز قیمت کی کمی بیشی میں حصہ رسد شریک رہتا ہے۔ صورت دوم بھی اوّل کے مشابہ ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ لگان اور پیداوار کی باہمی نسبت نرخ کے اضافہ اور تخفیف کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔ بشکل سوم گو مقدار لگان معین ہے لیکن کم از کم نرخ کی کمی بیشی میں زمیندار کی شرکت قائم رہتی ہے لیکن بحالت چہارم زمیندار کو نہ مقدار پیداوار سے تعلق نہ نرخ سے

حصہ سوم
باب ۹

کچھ سروکار۔ ہر حالت میں وہ اپنی مقررہ رقم کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن جبکہ بوجہ قلت بارش یا وبا پیداوار میں نمایاں کمی واقع ہو تو قانون بخیال انصاف زمیندار کو وصولی لگان کچھ عرصہ تک ملتوی کرنے یا لگان کا مناسب حصہ معاف کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

سرکاری مالگزاری

۱۱۔ گورنمنٹ پیداوار زمین کا جو حصہ خود لیتی ہے، مالگزاری کہلاتا ہے۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ہے کہ جب سرکاری حصہ زمینداری لگان کا ایک جزو ہو، جیسا کہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں بقدر نصف پایا جاتا ہے تو مالگزاری سے صرف زمیندار کی آمدنی گھٹ جاتی ہے۔ کاشتکار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خواہ کل لگان زمیندار کی جیب میں رہے یا گورنمنٹ اس میں حصہ بانٹے، کاشتکار کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کی حصہ طلبی سے زمیندار کو لگان بڑھانے کی ترغیب پیدا ہوسکتی ہے۔ اور اپنی سابق مقدار لگان برقرار رکھنے کے لیے وہ تاحد امکان مالگزاری کا بار کاشتکار پر ڈالنے کی کوشش کرے تو عجب نہیں۔ مگر دور اندیشی سے بذریعہ قوانین اضافہ لگان پر ایسی شرائط عاید کردی گئی ہیں کہ زمیندار کو مالگزاری کا کوئی جزو کاشتکار پر منتقل کرنے کا بہت کم موقع مل سکتا ہے اور جہاں زمیندار موجود نہوں اور سرکار مالگزاری براہ راست کاشتکار سے وصول کرے، جیسا کہ دکن میں ہوتا ہے تو سرکار کی حیثیت زمیندار کی ہوجاتی ہے اور مالگزاری کا مضر اور غیر مضر اثر حسب حالات زمینداری لگان کا سا پڑتا ہے۔ پس اگر حقیقتاً مالگزاری معاشی لگان کے اندر اندر ہے تب کچھ مضائقہ نہیں، صرف زمیندار یا کاشتکار کے ماحصل زائد میں سے حصہ نکل جائے گا۔ لیکن اگر اس حد سے آگے بڑھ کر زمیندار کے سود یا کاشتکار کی اُجرت وسود میں سے بھی حصہ بانٹے تو اس کے دو نتیجے ممکن ہیں۔ زرعی ترقیات میں رکاوٹ، زراعت

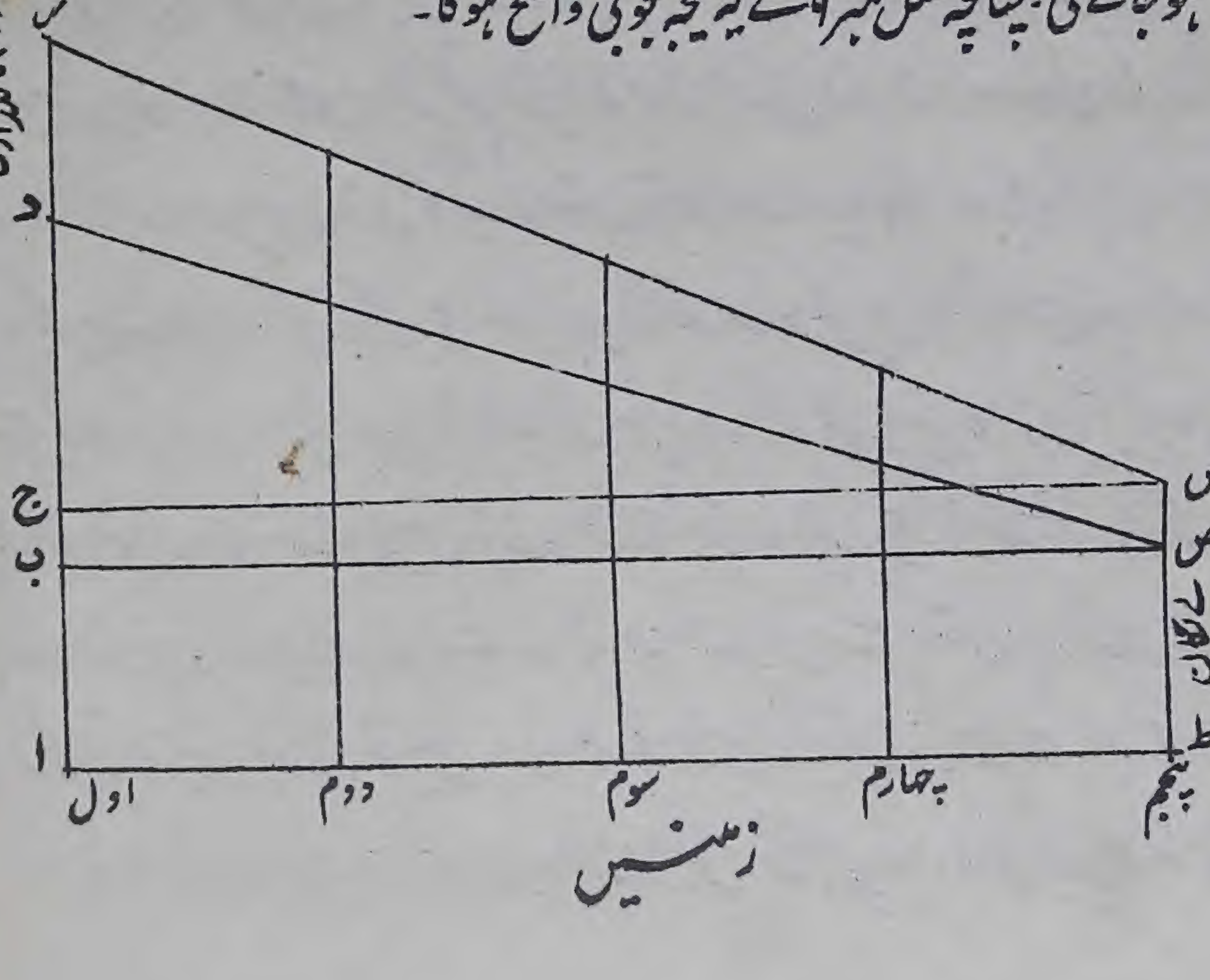
میں تنزل پس پیداوار میں کمی ہونا تو بہرصورت یقینی ہی۔ اب اگر تحقیق رسد سے پیداوار کی قیمت میں معقول اضافہ ہوسکا تو مالگزاری کا بار بقدر اضافہ قیمت خریداروں یعنی عوام پر جا پڑے گا، کچھ زمیندار اور کاشتکار کے سود اور اُجرت سے وصول ہوگا۔ اور باقی بے لگان والے کھیتوں کے غریب کاشتکاروں کی زراعت روک کر اور ان کو تباہ کرکے خود بھی غارت ہوجائے گا۔ لیکن اگر خدانخواستہ قیمت میں اضافہ نہ ہوسکا، تو زراعت بند ہونے سے کاشتکار برباد ہوجائیں گے اور سرکار کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئے گا۔ جب زراعت ہی نہ ہوگی تو مالگزاری کہاں سے آئے گی۔ پس صاف ظاہر ہی کہ تعین مقدار مالگزاری میں بجد اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہی۔ بزعم خود سرکاری آمدنی بڑھانے کے خیال سے بے بس زمیندار اور بے زبان کاشتکار پر مالگزاری از حد بڑھا دینا مرغی مار کر ایک دم سونے کے انڈے نکالنے کی احمقانہ حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شمالی ہندوستان میں مالگزاری ترقی زراعت میں کمتر حارج نظر آتی ہی۔ لیکن مسٹر جٹس راناڈے، آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر رومیش چندر دت جیسے معاملہ فہم اور باخبر لوگ جنھوں نے ہندوستان کے معاشی حالات کا مطالعہ اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے دیا تھا اور جن کو اہل الرائے سمجھے جانے کا پورا حق حاصل ہی، شاکی ہیں کہ خصوصاً دکن میں مالگزاری حد مناسب سے تجاوز کرکے کم وبیش وہی افسوسناک نتائج پیدا کر رہی ہی جن کا اوپر ذکر کیا جاچکا ہی۔ اور شمالی ہندوستان میں آیندہ اضافہ احتیاط طلب ہی۔ نہ معلوم گورنمنٹ ہندوستانیوں کے ایسے بے لوث اور قابلانہ مشوروں سے مستفید ہونا کہاں تک پسند کرتی ہی۔ لیکن معاشی قوانین بدلنا بھی گورنمنٹ کے قبضۂ قدرت سے باہر ہی۔

اگر معاشی لگان تمام زمینوں پر بشرح معین مثلاً کل پیداوار کی ایک چوتھائی

حصہ سوم
باب ۹

مالگزاری قائم کی جائے تو اس کا کاشت اور نرخ پر کیا اثر ہوگا؟ پیدائش لگان کی بحث میں ہم نے چند ایسے ادنیٰ کھیتوں کی کاشت یا انتہائی جرعوں کا استعمال فرض کیا ہے جن کے مصارف پیدائش پیداوار کی قیمت کے برابر ہیں اور جن پر کچھ لگان نہیں ملتا۔ ان کو اصطلاحاً زمین بے لگان یا جرعۂ بے لگان کہتے ہیں۔ اب اگر بے لگان زمین یا بے لگان جرعوں کی پیداوار مجموعی پیداوار کا جزو قلیل ہو اور سخت ناگزیر نہ ہو تو ایسی زمینوں کی کاشت اور جرعوں کا استعمال ترک ہو کر مقدار پیداوار میں خفیف سی کمی ہو کر نرخ میں تھوڑا سا اضافہ ہونا ممکن ہے۔ لیکن مالگزاری کا بیشتر حصہ معاشی لگان سے وصول ہوگا۔ اور بحیثیت مجموعی کاشت اور نرخ پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑیگا۔ صرف زمیندار یا کاشتکار کی آمدنی (جو اب تک کل معاشی لگان پا رہے تھے) گھٹ جائیگی۔

اس کے برعکس اگر بے لگان زمین اور جرعوں کی پیداوار مجموعی مقدار کا جزو اعظم ہو اور قطعاً ناگزیر ہو تو کاشت بحالت موجودہ جاری رہے گی۔ مالگزاری مصارف میں شامل ہو کر اسی قدر نرخ بڑھادے گی۔ اور زمین کے لگان کی قیمت وہی رہے گی۔ البتہ مقدار میں تخفیف ہو جائے گی۔ چنانچہ شکل نمبر ۹ سے یہ نتیجہ بخوبی واضح ہوگا۔



قبل مالگزاری نرخ ا ج ہی اور مقدار لگان ج ر س بعد قیام مالگزاری بشرح ایک چوتھائی پیداوار نرخ بھی اس شرح سے بڑھ کر ا ب ہو جاتا ہی۔ لگان کی مقدار گھٹ کر ب د ص رہ جائے گی۔ لیکن بوجہ اضافہ نرخ قیمت سابق برقرار رہے گی۔ اُس شکل میں مختلف زرخیزی کی زمینوں کا اوسط پیداوار فی جریب دکھایا گیا ہی اور بغرض سہولت فرض کیا گیا ہی کہ تمام زمینوں میں صرف ایک ہی جریب استعمال ہوتا ہی۔

یا فرض کرو کہ اعلیٰ متوسط اور ادنیٰ تین زمینیں ہیں جن سے علی الترتیب ۱۲،۱۵ اور ۸ من غلہ پیدا ہوتا ہی اور نسبت مصارف ۴، ۵ اور ۶ روپیہ من ہی۔ اس حالت میں اعلیٰ اور متوسط زمین کو ۵ من اور ۲ من لگان یا قیمتی ۳۰ و ۱۲ روپیہ حاصل ہوگا۔ اب فرض کرو کہ تینوں زمینوں پر بشرح ایک چوتھائی پیداوار مالگزاری قائم کر دی جائے اور ادنیٰ زمین کی پیداوار بھی سخت ناگزیر ہو، چونکہ ادنیٰ زمین ہمارے مفروضہ کے مطابق بے لگان ہی اس کے باقی ۶ من کی قیمت لازماً سابق ۸ من کے برابر ہو جائے گی اور نرخ بجائے ۶ روپیہ من کے ۸ روپیہ من قرار پائے گا۔ چونکہ کل کی $\frac{1}{4}$ مالگزاری باقی $\frac{3}{4}$ کے ایک تہائی یعنی $\frac{1}{3}$ کے برابر ہے۔ قیمت بھی اسی نسبت سے ۶ روپیہ کے $\frac{1}{3}$ کی برابر بمقدار ۲ روپیہ بڑھکر ۸ روپیہ ہو جاتی ہی۔ گویا مالگزاری اور اضافہ نرخ کی نسبت یکساں ہوتی ہے۔ قیام مالگزاری کے بعد اعلیٰ اور متوسط زمین کا لگان علی الترتیب
{مصارف (۱۵ × ۴) ۔ ($\frac{1}{4}$۱۱ × ۸) قیمت} وہی ۳۰ روپیہ اور {مصارف (۱۲ × ۵) ۔ (۹ × ۸) قیمت} ۱۲ روپیہ رہے لیکن بوجہ اضافہ نرخ مقدار بجائے ۵ من اور ۲ من کے صرف $\frac{3}{4}$۳ اور $\frac{1}{2}$۱ رہ جائے گی۔ ان دو مثالوں

حصہ سوم پر غور کرنے سے مذکورۂ بالا نتائج صاف ظاہر ہو سکتے ہیں۔

باب ۹ واضح ہو کہ اگر مالگزاری مقدار پیداوار کے کسی حصہ کے بجائے بحساب زر مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ فی من پیداوار۔ تو بھی معاشی لگان پر وہی اثر پڑے گا جو اوپر بیان ہوا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بحالت اول مالگزاری اور پیداوار کے باہم نسبت معین ہے۔ مثلاً ایک ثلث یا چہارم پیداوار اور بحالت آخر پیداوار کی گرانی اور ارزانی کے بموجب مالگزاری کی نسبت بھی علی الترتیب گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ مثلاً شرح مالگزاری ایک روپیہ من ہو۔ اب اگر نرخ پیداوار پانچ روپیہ من ہے تو مالگزاری پیداوار کا پانچواں حصہ ہو گی اور اگر نرخ گھٹ کر چار روپیہ من رہ جائے تو مالگزاری بڑھ کر پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ ہو جائے گی۔

تقرر مالگزاری کی چار صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ یا تو وہ ایک معین مقدار ہو۔ مثلاً دس یا پنج من، یا کوئی مقررہ رقم ہو مثلاً دس بیس روپیہ، یا پیداوار کا ایک مقررہ حصہ ہو مثلاً ایک ثلث یا چہارم، یا بحساب پیداوار بشکل زر مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ یا آٹھ آنہ من۔ یہی چار صورتیں زمینداری لگان کی بھی بیان ہو چکی ہیں۔ دونوں حالتوں میں نتائج بھی یکساں نمودار ہوتے ہیں۔ زمینداری لگان اور سرکاری مالگزاری میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ زمیندار کاشتکار کی رضامندی بغیر لگان مقرر نہیں کر سکتا۔ لیکن سرکار کو اختیار ہے۔ جو کچھ مالگزاری مناسب سمجھے مقرر کر دے، آگے چل کر نتیجہ برا نکلے یا بھلا۔

زمین کو ترقی ملک دینے کی تجویز

۱۲۔ لگان میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے وہ زمین کی قدرتی خواص اور ایسی عام معاشی ترقیات کا نتیجہ ہے جس میں زمیندار کی ذاتی کوشش کو کچھ دخل نہیں۔

زمین کی ترقی میں زمیندار اگر کچھ محنت اور اصل صرف کرتا ہی تو اُس کا معاوضہ بشکل اُجرت و سود لگان سے جداگانہ شمار ہوتا ہی۔ زمیندار کے حق میں لگان کو محض خوش قسمتی اور حسن اتفاق کا نتیجہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا۔ یہی حال زمینوں کی قیمت کا ہی کہ مالک کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہی۔ اضافہ قیمت بھی اسباب لگان کا آفریدہ ہی۔ حاصل کلام یہ کہ لگان اور نیز قیمت زمین قدرت اور بے شمار غیر متعلق لوگوں کی کوشش سے بسرعت بڑھ رہی ہی اور ہر اضافہ پر صرف قبضہ کر لینا زمیندار کا کام ہی۔ شہر شکاگو میں ایک افتادہ زمین جو ۱۸۳۰ء میں محض مفت ایک آنہ فی مربع گز سے بھی کم قیمت پر خریدی گئی ۶۴ برس کے عرصہ میں حسن اتفاق کی بدولت شہر کی توسیع سے اس کا موقع ایک ایسے آباد اور کاروباری چوک کے کنارے آ پڑا کہ ۱۸۹۴ء میں وہی زمین تین ہزار روپیہ گز سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی۔ غضب ہی کہ ۱۸۹۵ء میں لندن کے مشہور عالم بازار لمبارڈ اسٹریٹ کے پہلو میں ایک قطعہ اراضی سترہ ہزار روپیہ فی گز سے کچھ ہی کم قیمت پر فروخت ہوا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہی کہ جب عام ملکی اور معاشی ترقیات جو بے شمار لوگوں کی محنت اور اصل کی کوشش کا نتیجہ ہیں، لگان اور قیمت یوں بے حد و حساب بڑھائیں تو ان اضافوں کی مالک بھی منجانب ملک گورنمنٹ کیوں نہ بنے۔ مالک زمین اپنی محنت اور اصل کا معاوضہ شوق سے لے۔ لیکن ماحصل زاید کے لامحدود اضافوں سے اس کو کیا تعلق۔ عوام کی کوشش اور صرف سے وہ پیدا ہوتا ہی اور عوام کی نمائندہ گورنمنٹ اس کی جائز حق دار ہی۔

اضافہ ماحصل زائد پر گورنمنٹ کے قبضہ کرنے کی چند ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ گورنمنٹ کل زمین مالکوں سے خود خرید لے۔ لیکن اول تو اس کے واسطے کافی رقم مہیا ہونی دشوار، دوسرے بحیثیت مالک سرکار لاتعداد قطعات کا انتظام بہت طوالت طلب اور

حصہ سوم
باب ۹

بیش خرچ ہوگا۔ زیادہ آسان ترکیب یہ ہے کہ سرکار مال گزاری اور ہاؤس ٹیکس اس قدر بڑھا دے کہ مالک زمین کو اس کے اصل اور محنت کا جو خرید زمین اور اس کی ترقیات میں صرف ہوئی ہو پورا پورا معاوضہ مل کر باقی کل اضافہ داخل خزانہ ہو۔ اس صورت میں گورنمنٹ بہت کچھ دردسری سے بچے گی اور مقصد اصلی بھی حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ اکثر مہذب ممالک میں یہی طریق رواج پا رہا ہے۔

لیکن واضح ہو کہ طریق آخر الذکر میں بھی چند خطرناک نقص مضمر ہیں۔ اوّل تو زمیندار کے اصل و محنت کا معاوضہ باقی اضافہ سے جدا کرنا دشوار اور اندیشہ ہے کہ سرکاری ملازموں کا اندازہ اکثر خلاف واقعہ اور زمیندار کے حق میں مضر ہوگا۔ یہ طرز عمل نہ صرف انصاف کے خلاف ہے بلکہ زرعی ترقیات اور اضافہ کاشت یا بالفاظ دیگر ملکی مرفہ الحالی کے سخت منافی ہوگا۔ دوسرے جب کہ گورنمنٹ اضافہ لگان و قیمت زمین کی مالک بنتی ہے تو عام ملکی حالات کی تبدیلی سے زمیندار کے معاوضہ میں جو کمی پیدا ہو اس کی تلافی کرنی بھی گورنمنٹ پر فرض ہونی چاہیئے ورنہ نفع ہتیانا اور نقصان کا بار غریب زمیندار پر ڈالنا تو وہی مثل ہوگی کہ میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو۔ اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ گورنمنٹ اپنی گرہ سے ایسے نقصانات کی تلافی کرنے پر کہاں تک آمادہ ہوگی۔ تیسرا اعتراض بھی معقول ہے کہ کل لگان یا اضافہ قیمت پر گورنمنٹ کا قبضہ ہو جانے سے زمین کی قیمت بے حد گھٹ جائیگی اور جن لوگوں نے موجودہ بڑھی ہوئی شرح سے زمین خریدی ہے یا تو اُن کو جدید تخفیف قیمت کا معاوضہ ملنا چاہیئے یا تخمینہ لگان سے اس کل رقم کا سود خارج کرنا چاہیئے جو اس نے قیمتاً ادا کیا ہو۔ ورنہ کسی عام شرح سے ان پر مال گزاری یا ٹیکس قائم کرنا سراسر بیجا اور ظلم ہوگا۔

ظاہر ہے کہ طریق دوم کے رواج میں بھی کس قدر احتیاط لازمی ہے اور اس کا لحاظ رکھنے کی سرکاری ملازموں سے توقع کرنا خلاف تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ بداحتیاطی

جس کا سرکار کے موافق اور زمیندار کے مخالف ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے نہ صرف لوگوں کے حق میں ظلم بلکہ عام بہبودی اور مرفہ الحالی کے واسطے سخت مضر ہوگی۔

گویا سب سے بہتر یہ ہے کہ جدید نظام میں کوئی بڑا ردوبدل نہ کیا جائے۔ اضافہ لگان اور ہاؤس ٹیکس میں نہ صرف بلحاظ انصاف بلکہ بخیال بہبودی عامہ اعتدال ملحوظ رہے ملکی ترقی روک کر سرکاری آمدنی بڑھانا گویا مرغی مار کر سونے کے انڈے لینے کی ہوس کرنا ہے۔ البتہ اب سے موجودہ طریق ملک کو روکا جائے، جو زمینیں اب تک کسی کی ملک نہ ہوں سرکار ان پر قبضہ کرلے اور اُن کے لگان اور قیمیت کی بلاشرکت غیرے مالک بنے چنانچہ اسی اصول پر جنگلات سرکاری ملک قرار دیئے جارہے ہیں۔ عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک زمین کے معاملہ میں صرف 'گزشتہ را صلوٰۃ و آیندہ را احتیاط' کا اصول قابل عمل اور بے ضرر نظر آتا ہے۔ زمین کے نجی ملک کا موجودہ طریق ناقص سہی لیکن اس قدر پھیلا ہوا ہے اور مستحکم جڑ پکڑ چکا ہے کہ اس کے استیصال کی کوشش سے اور بھی زیادہ مضرت پہنچنے کا خوف ہے۔ البتہ ایک حد تک بتدریج اصلاح ممکن ہے۔

باب ۱۰ دس

اُجرت

تجزیہ (۱) اُجرت کا مفہوم (۲) قوانین اُجرت (۳) مسئلہ اُجرت فنڈ (۴) مسئلہ معیار زندگی (۵) مسئلہ پیداآوری محنت (۶) مسئلہ پیداآوری مختتم (۷) اقسام اُجرت (۸) فرق اُجرت کے اسباب (۹) ارزانی وگرانی محنت (۱۰) اضافہ اجرت اور اُس کے نتائج

۱- یوں تو ہر قسم کی محنت کا معاوضہ اُجرت ہی ہے۔ مثلاً درزی دس روپیہ کا کپڑا خرید کر کوٹ تیار کرے جو بارہ روپیہ کو فروخت ہونے چاہئیں تو یہ دو زائد روپیہ اس کی محنت کی اجرت شمار ہونی چاہیئے۔ لیکن معاشیات جس اُجرت سے بیشتر بحث کرتا ہے وہ محنت کی ایک خاص حالت سے متعلق ہے۔ ہم اصل داروں اور آجروں کی نوعیت مختصراً دولت کے حصہ داروں کے تحت میں بیان کر چکے ہیں (۴)، جب سے ان دو طبقوں نے زور پکڑا، مزدوروں کا بھی ایک گروہ کثیر پیدا ہوگیا اور محنت کی بھی مثل دیگر اشیاء باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی۔ محنت فروش مزدور، خریدار آجر اور قیمت اُجرت کہلاتی ہے۔ اس سے قبل نہ تو تجارت محنت کا بازار اس قدر گرم تھا اور نہ اُجرت مثل قیمت معاشی قوانین کی اس قدر پابند ہوسکتی تھی۔ اکثر صناع اور پیشہ ور اپنے ہی اصل سے بطور خود چیزیں تیار کرتے تھے پیداوار کی قیمت میں سود اور اجرت دونوں شامل تھے۔ لیکن بوجہ ملک واحد ہونے کے اُن کی تفریق غیر ضروری تھی۔ محنت کی خرید و فروخت خانگی خدمات مثلاً باورچیگری، سائیسی

حصہ سوم
باب ۱

خدمتگاری یا چند معزز پیشوں مثلاً معلمی، طبابت تک محدود تھی۔ شرح اجرت بیشتر رسم و رواج کی پابند تھی اور تعین شرح پر معاشی قوانین کا اثر آج کل کے مقابلہ میں عشرِ عشیر بھی نہ تھا۔ گوناگوں ترقیات کی بدولت تجارتِ محنت نے وہ فروغ پایا ہے کہ تمام ملک اس کی منڈی بنے ہوئے ہیں۔ ہر ملک کا گروہ کثیر اس کاروبار میں لگا ہوا نظر آتا ہے اور خواص محنت کی وجہ سے جن کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، مزدور اور اُجرت ہر ترقی یافتہ ملک میں نہایت دشوار اور نتیجہ خیز معاشی مسائل خیال کئے جاتے ہیں۔ اُجرت کو اکثر مزدور کا حصہ پیداوار یا حصہ قیمت پیداوار کہتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُجرت پیداوار کی تیاری اور فروخت کے قبل محنت شروع ہوتے ہی آجر تبکل زر ادا کرنے لگتا ہے مزدور کو نہ تو پیداوار یا بعد سے حصہ ملتا ہے۔ نہ فروخت پیداوار تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کام شروع ہوتے ہی آجر ما حصل مستقبل کی اُمید پر اپنی گرہ سے اُجرت روزانہ ہفتہ وار یا ماہانہ پیشگی ادا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اجرت کی مذکورۂ بالا تعریف ایک معنی میں صحیح بھی ہے۔ کیونکہ اُجرت کا موجودہ پیداوار اور ما حصل مستقبل کی مقدار سے اور جب سے زر ادائیگی کا رواج ہوا ہے قیمت سے بھی قریبی تعلق ہے۔ ان ہی تعلقات کی تحقیق و تشریح معاشیات کا منشا ہے۔

قوانین اُجرت

۲ - بظاہر تو شرح اُجرت باہمی رضامندی اور معاہدہ سے قرار پاتی ہے۔ لیکن خود رضامندی اور معاہدے پر گوناگوں معاشی حالات کا بے حد اثر پڑتا ہے حتیٰ کہ تعین اجرت کے اسباب معاشی قوانین کے تابع ثابت کئے جاتے ہیں۔ رہا اجرت پر رسم و رواج کا اثر ہو وہ بھی سیاسی اور معاشی ترقیات کی وجہ سے بسرعت زائل ہو رہا ہے۔ اوّل اوّل شرح اُجرت کو قانون طلب رسد سے سمجھایا گیا۔ اگر دو آجر ایک مزدور کو بلاویں تو اُجرت بڑھے گی اور اگر دو مزدور ایک آجر کی طرف دوڑیں تو اُجرت گھٹے گی۔ یہ مسئلہ بالکل درست سہی لیکن یقیناً سطحی ہے اور علمی صحت و وضاحت سے معرّا۔ یہ صرف ایک واقعہ کا بیان ہے کمی بیشی

حصہ سوم باب ۱

اجرت کے اسباب اور حدود کا اس سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تاہم اس قانون کا اُجرت کے اساسی قوانین سے قریبی تعلق ہے۔ جن کی توضیح آئندہ فرق اجرت کے تحت میں کریں گے اول قوانین اجرت مع تنقید درج ذیل کرتے ہیں۔

مسئلہ اُجرت فنڈ

۳- اوائل بیسویں صدی میں انگلستان کے مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ دیگر ممالک یورپ کے بدرجہا بہتر تھی اور ساتھ ہی اس کے وہاں اصل کی مقدار بھی سب ملکوں سے بہت زیادہ موجود تھی۔ لہٰذا اس زمانہ کے معاشیین نے مقدار اصل اور شرح اجرت کے درمیان براہ راست ایک قریبی تعلق قرار دیا جس کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے۔ چنانچہ پیدائش دولت کے بیان میں یہ رشتہ واضح کیا جا چکا ہے۔ اصل محنت بغیر مردہ ہے اور محنت اصل بغیر اپاہج۔ مزدور کو اصل نہ صرف بشکل آلات مشین اور پیداوار خام درکار ہے بلکہ بطور مایحتاج زندگی مثلاً خوراک و لباس بھی ناگزیر ہے۔ تاکہ دوران عمل پیدائش میں وہ زندہ اور تندرست رہے لیکن بہت کم اصل مزدوروں کی ذاتی ملک ہوتا ہے۔ بحالت موجودہ آجر اصل داروں سے اصل بمعاوضہ سود مستعار لے کر کارخانہ جاری کرتے ہیں جن میں مزدور اصل قائم سے کام کرتے اور اصل دائرہ بطور اجرت پاتے ہیں بہرحال اصل محنت کا ناگزیر معاون ہے اور اس کا اضافہ مزدوروں کے حق میں بے حد مفید ہے۔ چنانچہ کمی بیشی اصل کا نتیجہ مشرق و مغرب کے مزدوروں کی مالی حالت سے بخوبی روشن ہے۔ لیکن گزشتہ صدی کے معاشیین نے محنت و اصل کے مذکورہ رشتہ پر اکتفا نہ کر کے اس میں مبالغہ سے کام لیا اور صحت کی کوشش میں حقیقت سے تجاوز کر گئے۔ اُنھوں نے اصل دائر کی مقدار جو ادائی اجرت میں صرف کیا جاتا ہے معین تصور کر کے شرح اجرت کو تعداد مزدوران اور مقدار اصل دائر کی باہمی نسبت پر منحصر قرار دیا۔ مثلاً اگر کسی ملک میں اصل دائر کی مقدار ایک کروڑ روپیہ ہو اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ، تو ہر مزدور کی اوسط آمدنی

حصہ سوم باب ۱

سو روپیہ سال ہوگی۔

جدید تحقیقات سے چند معقول اعتراضات کی بنا پر یہ مسئلہ غیر معتبر قرار پاچکا ہے۔ اول تو اصل دائر کی کوئی ایسی مقدار معین فرض کرنا جس کی ادائی بہ شکل اجرت لازمی ہو محض بے بنیاد ہے۔ آجر ہمیشہ اپنی ذاتی غرض سے جو متعدد اسباب کے تابع ہوگی۔ اُجرت میں کمی بیشی کرتا ہے، کسی مقدار معین کی لازمی تقسیم کی مجبوری سے اُجرت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ دوسرے خود اس مسئلہ کی سلاست ایک سطحی دھوکا ہے۔ غور کرنے سے اس کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ اجرت کی مجموعی مقدار مزدوروں کی تعداد سے تقسیم کرکے اوسط شرح اجرت دریافت کی جاتی ہے۔ ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کثرت اصل اضافہ اجرت کا باعث ہوتا ہے۔ لیکن یہ دونوں باتیں اس قدر صریح ہیں کہ ان کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ لہذا اس مسئلہ سے اُجرت کی کوئی علمی توضیح نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ اس سے محنت و اصل کے باہمی تعلق پر توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے۔

موجودہ ایجادات نے اصل میں بہ شکل مشین جو کچھ اضافہ کیا ہے اور جس کی بدولت عمل پیدائش میں اصل و محنت کے حصے گھٹتے بڑھتے ہیں، اس سے پیدائش دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جاچکی ہے۔ اس موقع پر مذکورۂ بالا بحث کی طرف رجوع کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا۔ ($\frac{۵}{۴}$ ۱)

بہر حال اضافہ اصل کا خواہ وہ کسی شکل میں ہو، نتیجۂ قریب یا بعید ازدیادِ طلب محنت اور بیشی شرح اجرت ہوتا ہے۔ لہذا مسئلہ اجرت فنڈ سے محنت کے پہلو طلب پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے۔ محنت کا پہلوے رسد جو اس مسئلہ میں سراسر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے مسئلہ سے واضح ہوگا جس کو ہم درج ذیل کرتے ہیں اور ان دونوں کی روشنی میں محنت کے ہر دو پہلوے طلب و رسد کا مطالعہ کرنے سے اُجرت کے متعلق ایک قرین

حصہ سوم
باب ۱

حقیقت مسئلہ مترتب ہو سکتا ہے۔

مسئلہ معیار زندگی

۴۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بڑے بڑے کارخانے، مل اور فیکٹری جاری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور بھی اپنی محنت کو آجر کے ہاتھ مثل دیگر اشیاء بکثرت فروخت کرنے لگے اور قیمتِ محنت اُجرت کہلاتی ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت اس کے مصارف پیدائش سے کم نہیں ہو سکتی، کسی قدر زیادہ یا کم از کم برابر ضرور ہو گی۔ ایسا کون احمق ہو گا جو نقصان اُٹھانے کے لئے کوئی چیز بنانے کی زحمت گوارا کرے گا۔ اگر کسی وجہ سے قیمت مصارف پیدائش سے گھٹ جائے تو جلد سے جلد ایسی چیز کی پیدائش ترک کر دی جائے گی پس قیمت کا مصارف پیدائش کے کم از کم مساوی ہونا ہر چیز کی پیدائش کے واسطے شرط لازمی ہے۔ اس اہم مسئلہ سے مبادلہ دولت کے بیان میں مفصل بحث کریں گے (۷/۱۸) یہاں اس کا سیدھا سادھا مفہوم سمجھ لینا کافی ہے۔ فرض کرو انجن سے برقی طاقت بنائی جاتی ہے اب جو کوئلہ انجن چلانے میں جلتا ہے اس کی قیمت اور نیز مطالبات فرسودگی ایسی شرح سے کہ انجن پرانا اور بے کار ہونے تک اس کی کل قیمت وصول ہو جائے جس سے نیا انجن خریدا جا سکے، یہ دونوں مدیں برقی طاقت کے مصارف پیدائش میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں زمین کا لگان، انجن، کارخانہ کی تعمیر میں جو لاگت آئی ہے اس کا سود اور ملازمین کی تنخواہ بھی جزو مصارف ہیں لیکن اس موقع پر اول الذکر دو مدوں کا لحاظ کرنا کافی ہے باقی نظر انداز کی جاتی ہیں۔ مزدور اور محنت کا تعلق بھی بعینہٖ انجن اور برقی طاقت کا سا ہے گویا مزدور کی مایحتاج زندگی اور پرورش اولاد کے مصارف جو اس کے جانشین ہوں گے مصارف پیدائش محنت میں شامل ہیں اور اگر اجرت کسی وجہ سے اُن کی مجموعی مقدار سے گھٹ جائے تو افلاس غریب مزدور کی زندگی کو ناقابل برداشت بنا کر اس کو جلد تباہ کر دے گا اور اس تباہی کا اثر آئندہ نسلوں پر پھیل کر کثرت مرض ضعف پست خیالی اور ناکارگی جیسی

ناقابل اصلاح ابتری کا باعث ہوگا اور عام مرفہ الحالی کے سرچشمے مسدود کردے گا۔ کسی چیز کا بنانا یا نہ بنانا اختیاری ہے۔ بصورت اندیشہ نقصان پیدائش ترک کی جاسکتی ہے لیکن غریب مزدور کو محنت سے کوئی مفر نہیں اوّل تو اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ بیکار بیٹھکر کھا سکے۔ دوسرے ترک محنت خود اس کے حق میں سراسر نقصان ہے۔ چنانچہ مزدور کی ان کمزوریوں سے خواص محنت کے تحت میں ہم مفصل بحث کرچکے ہیں (د ۱۳۸)

پس تخفیف اُجرت کے لحاظ سے غریب مزدور کی حالت نہایت قابل رحم ہے اور اکثر اس پر نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی مثل صادق آتی ہے۔ لیکن جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے از حد تخفیف اُجرت نہ صرف مزدور کے حق میں تباہ کن ہے بلکہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کو بھی ناقابل تلافی مضرت پہنچاتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہوچکا کہ اجرت کا مزدور اور اس کے خاندان کی مایحتاج زندگی کے واسطے کافی ہونا کس قدر ضروری اور مفید ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مایحتاج زندگی کا کوئی معیار معین ہے یا اس میں کمی بیشی ممکن ہے۔ اور اگر ہے تو ایسی تبدیلی تخفیف و اضافہ اجرت کی پیشرو ہے یا پس آیندہ ؟۔

اٹھارویں صدی کے آخری نصف دوران میں جب علماء متوکلین نے اس مسئلہ کی بنا ڈالی تو اس وقت فرانس کے مزدوروں کی مالی حالت نہایت خستہ تھی اور جو کچھ اجرت ملتی تھی وہ اشد ضروریات زندگی کے واسطے بمشکل کفایت کرتی تھی۔ ہمعصر حالات سے متاثر ہوکر انھوں نے قرار دیا کہ مایحتاج زندگی ناگزیر ضروریات تک محدود ہے اور اجرت اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اول تو پہلے ہی سے بیکار اور متلاشیٔ روزگار مزدوروں کی ایک بڑی جماعت موجود ہے، دوسرے آبادی اصل اور کاروبار سے کہیں زیادہ جلد بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اُجرت ناگزیر ضروریات کی حد سے تیزی کے ساتھ البتہ گھٹنے کا اندیشہ اکثر دامنگیر رہتا ہے، چنانچہ پس ماندہ ممالک میں اب تک مزدوروں

کا یہی حال ہی۔ گنی بوٹی نیا شوربا روز کنواں کھودنا روز پانی پینا۔ اگر چار دن کام نہ ملے تو اندوختہ کا صفایا ہی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں مایحتاج زندگی ضروراً ضروریات تک محدود ہے اور اجرت مایحتاج تک۔

لیکن ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی مالی حالت دیکھکر یقین ہوتا ہے کہ مایحتاج زندگی کا کوئی ایسا معیار معین نہیں کہ اس میں رد و بدل نہو سکے بلکہ ناگزیر ضروریات سے لیکر رسمی ضروریات حتیٰ کہ کم خرچ تک تعیشات اس میں شامل پائے جاتے ہیں گویا مایحتاج کا معیار کسی ملک کی معاشی ترقی یا پس ماندگی کے مطابق بلند اور پست ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکن مزدور اچھا خاصہ خوش خوراک خوش پوشاک ہے اور اس کے مکان میں علاوہ ضروری سامان کے۔ آرائش و تفنن طبع کی بھی معمولی چیزیں از قسم تصاویر و باجہ موجود ملیں تو عجب نہیں شنبہ کی رات کو وہ کھیل تماشے دیکھنے کا بھی لطف اٹھاتا رہتا ہے البتہ اس میں ایک عیب ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ فضول خرچ ہے اور اڑے وقت کے خیال سے کافی پس انداز نہیں کرتا۔ لیکن مزدوروں کی انجمن اتحاد نے ضمانت فنڈ قائم کر کے جس کا ہم آیندہ مفصل حال لکھیں گے۔ یہ خرابی بھی ایک بڑی حد تک رفع کر دی ہے یورپ کے مزدوروں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ لیکن ایشیا میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے یعنی مزدور کی زندگی سب سے سادی اور کم خرچ ہے اور اس کی شرح اُجرت بھی بہت کم ہے۔ ہندوستانی مزدور کی حالت اس سے بہتر سہی لیکن یورپین مزدور کے مقابلہ میں پھر بھی ادنی ہے نہ اس کو زندگی کا اس قدر لطف میسر ہے نہ اس کے پاس زیادہ اندوختہ۔ یہ تو تحقیق ہو چکا کہ مزدوروں کا معیار مایحتاج زندگی ہر ملک میں جدا ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بلند اور پس ماندہ میں پست۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اضافہ اجرت بلندی معیار کا باعث ہوتا ہے یا نتیجہ بحیثیت عمل کس کو کس پر تقدم

حاصل ہے۔

گو تعجب ہوتا ہے لیکن معاشیین کے ایک گروہ کا قول ہے کہ معیار ما یحتاج سے اُجرت قرار پاتی ہے۔ گویا کہ معیار بلند کرنے سے اُجرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا تو غریب مزدور کے دن بھر جاتے۔ جب چاہتا نئی نئی ضروریات اختیار کر کے اجرت میں اضافہ کرا لیتا۔ اور حسب دلخواہ زندگی کا لطف اُٹھاتا۔ سیدھا سادھا کھانا موٹے جھوٹے کپڑے اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں پر قناعت کرنے کی اس کو کون خوشی یا مجبوری ہوتی۔ ہم نہیں کہتے کہ اس طریق سے وہ اجرت میں لاانتہا اضافہ کرا سکتا۔ لیکن کم از کم موجودہ تنگدستی کو وہ ضرور رفع کر دیتا اور اپنے تئیں ایسا بے بس اور لاچار نہ پاتا کہ دوسروں کی ہمدردی اور حمایت کا محتاج رہتا۔

واضح ہو کہ اگر محنت کی رسد محدود ہو اور طلب غالب۔ بالفاظ دیگر اگر مزدوروں کی تعداد معین ہو اور اُن کی بہت جگہ مانگ ہو گویا کوئی مزدور بیکار نہ ہو تو ایسی حالت میں مزدور جتھا بنا کے اجرت میں مناسب اضافہ کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ محنت با مہارت کی اُجرت میں اس تدبیر سے مزدوروں کے موافق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن محنت بے مہارت کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بیکار مزدوروں کی جماعت موجودہ شرح اُجرت قبول کر کے کوشش اضافہ سے مزاحم ہوتی ہے اور مزدوروں کا گروہ اعظم اسی دشواری سے اضافہ اجرت میں لاچار ہے۔ لیکن دباؤ ڈالے بغیر اضافہ اُن کی اُجرت میں بھی بتدریج برابر ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ معیار ما یحتاج بلند ہوتا جاتا ہے مگر اس تبدیلی کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

(۵) جیسا کہ عاملین پیدائش کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے، محنت کیا ہے؟ دولت پیدا کرنے کا ایک آلہ۔ اس کا افادہ کیا ہے؟ پیدا آوری۔ معلوم ہے کہ زمین

حصہ سوم | باب ۱ | مسئلہ پیدا آوری محنت

کی قیمت زرخیزی اور انجن کی قیمت طاقت محرکہ کے مطابق ہوتی ہے اور یہ دونوں معیار قیمت افادہ پیدا آوری کی محض مختلف شکلیں ہیں۔ پس اگر محنت کی قیمت بھی یعنی اجرت مقدار پیدا آوری پر منحصر ہو تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ خود واقعات اس اصول کے شاہد ہیں۔ جس مزدور کی محنت میں پیدا آوری خواہ بشکل عمدگی یا مقدار کام خواہ بشکل ہر دو زیادہ پائی جاتی ہے اُس کو اُجرت بھی زیادہ دی جاتی ہے۔ اُجرت اور پیدا آوری کا تعلق اس قدر بدیہی ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اصول پیدا آوری سے صرف اجرت کی کمی بیشی کا ایک اساسی سبب واضح ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم تعین شرح اجرت کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کرینگے۔

پیدا آوری مختتم

(۶) یوں تو پیدائش دولت کے واسطے ہر سہ عاملین زمین محنت اور اصل کی شراکت لازمی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ زراعت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے اور صنعت و حرفت میں اصل کی کارگزاری خاص طور سے قابل لحاظ ہوتی ہے، محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے۔ اوپر جا بجا خصوصاً لگان کی بحث میں زراعت پر قانون تقلیل حاصل کا قوی اثر ظاہر کر چکے ہیں یعنی یہ کہ کاشت میں چند ابتدائی جرعوں کے استعمال کے بعد کوئی ایک جرعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ اس کا اور اس کے بعد جرعوں کا حاصل مقابلتہً ماسبق جرعوں کے حاصل سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جرعوں میں محنت اور اصل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر قطعہ زمین کی طرح مقدار اصل بھی جو استعمال ہو مقرر کر لی جائے اور خالص محنت کے جرعوں میں اضافہ کیا جائے تو بھی اس قانون کا عملدر آمد نمودار ہو گا۔ مثلاً دس بگہ زمین میں سو روپیہ کی لاگت سے کاشت کی جائے خود کاشتکار اور اس کے دو لڑکے مل جل کر کھیت پر کام کریں اور ۵۰ من غلہ پیدا ہو۔ اب اگر ایک مزدور لگایا جائے تو پیداوار ۶۰ من ہو جائے۔ دو مزدور

بڑہانے سے ۶۶ من اور تین بڑہانے سے ۷۰ من ہو گی۔ ایسی حالت میں مزدور اول کی محنت کی پیدا وار ۱۰ من دوم کی ۶ من اور سوم کی ۴ من شمار ہو گی۔ اب اگر مزدو سوم بقدر ۴ من اجرت طلب کرے تو کاشتکار کو کچھ بچت نہ ہو گی اور غالباً وہ اس کو رکھنے پر رضامند نہو گا۔ اس لیے جب کہ مزدور سوم کو بوجہ تہیدستی محنت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور بوجہ کثرت مزدوراں بپابندی قانون تقلیل حاصل اس سے زیادہ اپنی محنت سے پیدا ہی نہیں کرسکتا تو بمجبوری اس کو کچھ کم چار من اجرت پر قناعت کرنی ہو گی لیکن لطف یہ ہے کہ کاشتکار اوّل اور دوم مزدور کو بھی اس سے زیادہ اُجرت دینا گوارا نہ کریگا۔ اور اُن کو بھی اتنی ہی قبول کرنی پڑے گی، کیونکہ بحالت مفروضہ اُن کو دوسری جگہ ۴ من سے زیادہ اُجرت نہیں مل سکتی، اگر ایسا ممکن ہوتا تو مزدور سوم ہی ۴ من پر کیوں رضامند ہوتا۔ اگر مزدور اول یہ کھیت چھوڑ کر دوسری جگہ کام تلاش کرے تو اس کی حیثیت مزدور سوم کی سی ہو گی اور نئی جگہ غالباً وہی ادنی اُجرت قبول کرنی پڑے گی۔ کاشتکار زیر بحث کا اوّل کے چلے جانے سے کوئی نقصان نہ ہو گا کیونکہ اب باقی دونوں مزدوروں کی محنت کی پیدا وار ۱۰ من اور ۶ من ہو جانے سے ۴ من شرح اُجرت کے حساب سے وہی ۸ من بچت ہو گی جو پہلے ہوتی اگر موجودہ مزدور دوم نے اپنی پیدا وار محنت کی بیشی کی بنا پر اجرت میں بھی اضافہ چاہا تو متلاشی روزگار مزدوروں میں سے کوئی نہ کوئی آکر مزدور دوم کی جگہ لے لیگا اور اضافہ اُجرت پر بوجوہات مذکورالصدر پھر وہی بندش قائم ہو جائے گی جو مزدور اول کے جانے سے قبل پیش آئی تھی بلکہ اگر کوئی گردش کا مارا جو تھا مزدور کھیت مذکورالصدر پر آگیے اور قانون تقلیل حاصل کی بدولت شرح اُجرت ۴ من سے بھی گھٹا دے تو عجب نہیں۔

مذکورہ بالا تیسرے یا چوتھے مزدور اور اس کی محنت کی پیداوار کو مزدور مختتم اور

پیداوار مختتم کہنا ناموزوں نہوگا۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ اجرت قانون تقلیل حاصل کے اثر سے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور مزدوروں کی کثرت سے اس کی مقدار میں کمی ہوتی ہے۔

زراعت کی مثال میں ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا بعینہ وہی حال صنعت و حرفت کا ہے۔ عمل پیدائش میں وہاں زمین کا حصہ بڑا ہوا ہے، یہاں اصل کا۔ اس فرق سے قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں کوئی تغیر نہیں ہوتا مثال بالا میں اگر کھیت کے بجائے کارخانہ اور زراعت کے بجائے صنعت اور ۴ من کے بجائے چار شئے لکھدی جائیں تو اس کی صحت میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ یہاں یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قبل صنعت و حرفت قانون تکثیر حاصل کے ماتحت بتائی جا چکی ہے، یہاں وہ قانون تقلیل حاصل کے تابع کہی جاتی ہے گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی دھوکا ہے قانون تقلیل حاصل کی ماتحتی سے مراد یہ ہے کہ قطعہ اراضی کی طرح کوئی مقدار لامحدود محنت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ اگر دس ہزار اصل سے ۵۰ مزدور کام کر کے ایک مقدار پیدا کریں تو اسی اصل سے سو مزدور کام کر کے دوگنی مقدار پیدا کر سکیں گے۔ غالباً ڈیوڑھی کرنی بھی دشوار ہوگی اور یہ عمل قانون تقلیل کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اب غور کیجئے کہ صنعت و حرفت قانون تکثیر حاصل کے زیر عمل کیوں کہلاتی ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت میں استعمال مشین اور پیدائش بر پیمانہ کی بیحد گنجائش ہے۔ جس کا نتیجہ نسبتاً تخفیف مصارف پیدائش ہے اور یہی قانون تکثیر حاصل کا منشا ہے اور صنعت پہ کیا منحصر ہے۔ بعض بعض حالتوں میں زراعت پر بھی قانون کا ایک حد تک اثر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ پس واضح ہوا کہ قانون تکثیر حاصل کا زمین محنت اور اصل کی مقدار سے تعلق ہے جو مل کر کام کریں

اور قانون تقلیل حاصل عمل پیدائش میں زمین محنت اور اصل کی باہمی نسبت سے متعلق ہے۔ بالفاظ دیگر اگر عاملین کی بڑی بڑی مقدار یکجا کام کرسکیں تو قانون تکثیر کا عمل ظہور پذیر ہوگا اور اگر عاملین میں سے کسی کی مقدار نسبت مناسب سے تجاوز کرے تو اس کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ زراعت و صنعت دونوں یکساں قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں، محنت کے جرعوں کی پیداوار ایک خاص حد کے بعد نسبتاً گھٹنے لگتی ہے، اجرت ہمیشہ محنت کی پیداوار مختتم کی مساوی ہوتی ہے اور کثرت مزدوران سے اس کی مقدار گھٹتی یقینی ہے۔

اول تو اجرت پیداوار مختتم کے برابر قرار پائی پھر کثرت مزدوران سے اس کی مقدار گھٹی اس پر طرہ یہ کہ مزدوروں کی لاچاری، تہیدستی، جہالت، پست ہمتی۔ رسم و رواج کی پابندی اور آجروں کے غلبہ اور تسلط کی بدولت یہ کمترین معاوضہ بھی پورا پورا نہیں ہاتھ آتا ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ محنت کا ماحصل زائد بشکل منافع آجر کی جیب میں جاتا ہے (۱۲) آجر اگر محنت کی پیداوار میں سے ایک مناسب حصہ بطور کمیشن لے بھی تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لیکن جب وہ مزدوروں کے کمترین حصہ میں سے بھی کچھ غصب کرے تو یہ ظلم ہے۔ یا تو مزدور پائمال ہو جاویں گے یا تنگ آکر وہ اسٹرائک شروع کردینگے۔ دونوں صورتوں میں عام ملکی مرفہ الحالی کو مضرت پہنچنا یقینی ہے۔

واضح ہو کہ مزدور مختتم آجر کا بہت بڑا محسن ہے۔ اضافہ ماحصل زائد کے لحاظ سے اس کی حالت بعینہ مثل نہر کی جھال کی چوٹی کے ہے جو نیچی ہو ہو کر پانی کی زیادہ زیادہ مقدار اپنے اوپر سے گزرنے کا موقع دیتی ہے اور یہی اوپر سے گزرنے والا پانی گویا ماحصل زائد ہے۔ جو پانی جہاں سے رکا رہے اس کو مزدوروں کی اجرت سمجھنا چاہیے

یہ مزدور جتنا آگے بڑھے گا ماسبق مزدوروں کو بشکل تخفیف اُجرت نقصان پہنچائیگا اور آجر کو بشکل اضافہ ماحصل زائد نفع۔ لیکن اگر پیچھے ہٹے تو نتیجہ بالکل برعکس ہوگا کسی کاروبار میں بمقابلہ دسویں مزدور مختتم کے پانچوں مزدوروں کے حق میں مفید اور آجر کے حق میں مضر ہے۔ دسویں کی حالت اس کے برعکس ہے اور نہ دور مختتم کا قرب و بعد بھی گویا محنت اور اجرت کے متعلق قانون طلب و رسد کی ایک گونہ تشریح ہے۔

یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ مزدور مختتم سے لازماً وہی مزدور مراد ہے جو بلحاظ ترتیب یا وقت سب سے آخر میں شریک کار بنے۔ بلکہ مزدوروں کے اُسی گروہ میں جو ایک ہی وقت کام شروع کرے مزدور مختتم کی موجودگی ممکن ہے۔ درحقیقت مزدور مختتم سے مراد کام کرنے والی ایسی جماعت کا کوئی فرد ہے کہ جس میں اگر کوئی جدید مزدور شامل کریں تو مزید ماحصل اس کی اُجرت سے کم رہے۔ اوّل تو جب مزدوروں کی ایک جماعت مل کر کوئی کام کرے تو ہر ایک کے کام کی جداگانہ مقدار دریافت کرنا اکثر محال ہوتا ہے۔ دوسرے یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ مزدور مختتم کارکردگی میں باقی دوسروں کے برابر ہے پس اس کی محنت کا جداگانہ ماحصل جس کا دریافت کرنا دشوار ہے۔ دوسروں سے کم ہونا ضروری نہیں۔

اس کے شریک جماعت ہونے سے ماحصل میں جو اضافہ ہوتا ہے اور جو سب ماسبق اضافوں سے کم مقدار ہوتا ہے۔ درحقیقت کل جماعت کی مجموعی محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ نہ اس کی جداگانہ محنت سے اور اس کے سب سے کم مقدار ہونے کا باعث مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص نہیں بلکہ قانون تقلیل حاصل ہے۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ کسی کام میں تعداد مناسب سے زیادہ مزدوروں کی شرکت نہ صرف مالی نقصان بلکہ خرابی کام کا باعث ہوتی ہے اور مزدور مختتم کی کل بحث اسی واقعہ کی تشریح ہے اور کچھ نہیں

پس ثابت ہوا کہ اجرت کا محنت کی پیدا آوری سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ پیداوار مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا باقی ہے کہ خود یہ معیار کسقدر غیر معیّن ہے اور کتنے بیشمار اسباب اس کی کمی بیشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ایک سادہ مثال لو جو زراعت وصنعت دونوں سے مشابہ ہے۔ کسی شخص کے ہاں دودھ مکھّن کا کارخانہ جاری ہے۔ گائے بھینسوں کی نگرانی کے واسطے دس گھوسی نوکر ہیں اگر گیارہواں گھوسی ملازم رکھا جائے تو گلہ میں دس گایوں کا اضافہ ہو سکے گا۔ گویا موجودہ مشینوں سے ان کے دُودھ کا مکھّن نکل سکے گا۔ اور ان کے رہنے کے واسطے موجودہ جگہ میں سے گنجائش نکل سکے گی۔ کسی طرح پر کارخانہ میں توسیع کی ضرورت نہوگی۔ اب اگر اس گیارہویں گھوسی کی اُجرت جدید دس گاؤں کی آمدنی سے کم ہو تو کارخانہ دار اس کو ضرور ملازم رکھ لیگا۔ اور اس کا کام محنتِ مختتم ہوگا۔ واضح ہو کہ محنت مختتم کے ماحصل کی کمی بیشی گھوسیوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ خود تعداد قوانین رسد وطلب کے تابع ہے۔ ایک طرف تو موجودہ نسل کا وہ طبقہ ہے جس سے گھوسی مہیّا ہو سکیں، دوسری جانب دُودھ مکھّن کا صرف اور ایسے کارخانوں کی تعداد۔ گویا دودھ مکھّن کی حالت طلب ٗ رسد اور یہ حالت خود بیشمار اثرات کے تابع ہے۔ علاوہ ازیں چارہ کی قلّت وکثرت کا بھی محنت مختتم سے قریبی تعلق ہے اور چارہ کی پیداوار زرعی حالت سے متعلق ہے جو خود بیشمار اسباب کے زیر اثر ہے۔ مزید براں گائے بھینسوں کی رسد جس کا دارومدار چارہ کی مقدار اور چراگاہوں اور گھوسیوں کی تعداد پر ہے اور اُن کی طلب جو چمڑہ، گوشت، دُودھ مکھّن اور زرعی کام کی طلبوں پر منحصر ہے، محنت مختتم پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ قصّہ مختصر محنت مختتم کا تعیّن بیشمار پیچ در پیچ اسباب پر منحصر ہوتا ہے۔ ہم کو یہ جاننا کافی ہے کہ کسی کام میں یکساں کارگردگی والے مزدوروں کی شرح اُجرت محنت مختتم کے ماحصل کے برابر ہوتی ہے گویا

شرح اُجرت کا معیار پیداوار مختتم ہے۔

اُجرت کے متعلق اس وقت تک جو چار مسئلے بیان کئے گئے ہیں اُن میں سے ہر ایک جداگانہ کل حقیقت کا صرف ایک جزو واضح کرتا ہے۔ ہر ایک بذات خود نا تکمل ہے لیکن تکمیل تشریح اُجرت کے واسطے ان سب کا اجماع لازمی ہے۔ اگر ربڑ کے چند تسموں سے کوئی چیز لٹکائی جائے تو وزن سنبھالنے میں ہر ایک تسمہ باقی تسموں کو مدد دیتا ہے اور سب کی مجموعی قوت سے اُن کی یکساں لمبائی قرار پاتی ہے اب اگر کسی تسمہ کی لمبائی گھٹائی بڑھائی جائے یا اس کی قوت میں کمی بیشی پیدا کی جائے تو یقیناً باقی تسموں کی لمبائی میں بھی فرق پیدا ہوگا اور لٹکنے والی چیز کی سطح بھی ضرور اونچی نیچی ہو جائے گی بعینہ یہی حال مذکورۂ بالا مسائل کے تعلق کا ہے۔ مسئلہ اُجرت فنڈ محنت کی طلب پر مسئلہ معیار مایحتاج زندگی محنت کی رسد پر اور مسائل پیدا آوری محنت و پیداوار مختتم تعین شرح اُجرت پر روشنی ڈال کر مسئلہ اُجرت کی کامل توضیح کرتے ہیں۔ اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ گویا یہ کل مسائل اُجرت پیدا کرنے والے مشین کے پُرزے ہیں اور ظاہر ہے کہ مشین چلنے کے واسطے ہر ایک پُرزہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کوئی دوسرا ان تمام مسائل کو کسی ایک جامع مسئلہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کامیاب ہونی محال نظر آتی ہے ہر ایک کو جداگانہ ذہن نشین کر کے ان کا باہمی تعلق سمجھ لینے سے بھی وہی مطلب حاصل ہوتا ہے اور یہ طریق سہل بھی ہے۔

۷۔ چند اصول پر اُجرت کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ اوّل اُجرت متعارف اور اُجرت صحیحہ کو لیجئے۔ بالعموم مزدور کو اُجرت بشکل زرِ نقد ادا کی جاتی ہے مثلاً کچھ آنے روز یا چند روپیہ ماہوار لیکن فی نفسہ یہ زرِ نقد گیا ہے سونے چاندی اور تانبے جیسی دھاتوں

کے ٹکڑے جن کو مزدور کھا پی سکے نہ پہن اوڑھ سکے۔ دولتمند لوگ جو قیمتی زیورات اور سامان کے شایق ہوں، ان دھاتوں کے ٹکڑوں سے کچھ کام لے سکتے ہیں لیکن غریب مزدوروں کے نزدیک جن کی ضروریات زندگی سادہ اور مختصر ہیں، یہ ٹکڑے بذات خود مٹی کے برابر نکمے ہیں۔ وہ تو اس لئے محنت کرتے ہیں کہ کھانے کو روٹی پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سامان راحت میسّر آسکے تو فبہا ورنہ مضایقہ نہیں۔ بہ ایں ہمہ اگرچہ بلاواسطہ نہ زرِ نقد سے مزدور کی احتیاج پوری ہوتی ہے نہ مزدور کو اس سے سروکار جیسا کہ ہم آگے چل کر تقسیم دولت کے تحت میں واضح کرینگے زرِ نقد نہایت سہولت افزا آلہ مبادلہ ہے۔ بذاتِ خود مزدور کی ضروریات سے خارج سہی لیکن بحیثیت آلۂ مبادلہ وہ مزدور کو حصول ضروریات میں بیش بہا مدد دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے مزدور بھی بلاحجّت اس کو بطور اُجرت قبول کرلیتا ہے۔ جب خورد و نوش اور لباس و مکان کا سامان مزدور کا مقصود ٹھہرا اور اسی کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ محنت کرتا ہے تو اسکی اُجرت کا صحیح معیار اس سامان کی وہ مقدار ہے جو وہ اُجرت کے زرِ نقد سے خرید سکے۔ زرِ نقد کی مقدار فی نفسہٖ اس کے نزدیک ناقابل لحاظ ہے۔ اُجرت بمعیار ضروریات اُجرت صحیحہ اور بمعیار زرِ نقد اُجرت متعارف کہلاتی ہے۔ مزدور کی کُل ضروریات کو شے واحد مثلاً گیہوں تصوّر کرکے فرض کرو کہ کسی زمانہ میں اُجرت متعارف دس روپیہ ماہوار ہے اور اُجرت صحیحہ ۵ من گیہوں، اب اگر اُجرت متعارف۔ اسسے بڑھکر ۱۶ روپیہ ہوجائے۔ اور بوجہ گرانی نرخ اُجرت صحیحہ ۵ من سے گھٹکر ۴ من رہ جائے تو اُجرت متعارف میں نصف سے زیادہ اضافہ کے باوجود اُجرت صحیحہ بمقدار ⅕ تخفیف ہوجائیگی اس کے برعکس اگر اُجرت متعارف صرف آٹھ روپیہ ہو لیکن بوجہ ارزانی نرخ اُجرت صحیحہ ۶ من گیہوں ہوجائے تو باوجود کمی اُجرت متعارف اُجرت صحیحہ میں بیشی ہوجائے گی۔ گویا بہ لحاظ اضافہ

حصہ سوم ۱۰۶

وتخفیف ان دونوں قسم کی اُجرتوں میں کوئی تعلق معیّن نہیں۔ اُنکی تبدیلی میں موافقت اور مخالفت دونوں ممکن ہیں۔ اور جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں مزدور کو تو مقدار گیہوں سے غرض ہے نہ کہ تعداد روپیہ سے لہذا اُجرت صحیحہ کا اس کی حالت پر مفید و مضر اثر پڑتا ہے نہ کہ اُجرت متعارف کا۔ چونکہ اُجرت کا تعیّن اور ادائگی بشکل زرِ نقد بجد آسان ہے۔ اُجرت متعارف کا رواج ہوگیا۔ ورنہ مزدور کو صرف اُجرت صحیحہ سے سروکار ہے اور جبکہ زر نقد کا استعمال اسقدر رائج نہ تھا اور نیز اب بھی پسماندہ دیہات میں اُجرت بشکل غلّہ ادا کیجاتی ہے۔ اِن دونوں قسم کی اُجرتوں کے فرق سے بخوبی واضح ہوگا کہ مزدور کی مرفہ الحالی اُجرت صحیحہ کے اضافہ سے وابستہ ہے یہ اضافہ دو طرح سے ظہور پذیر ہوسکتا ہے۔ اگر نرخ ضروریات معیّن ہو تو اُجرت متعارف کے بڑھنے سے۔ اور اگر اجرت متعارف متعیّن ہو تو نرخ ضروریات گھٹنے سے، اور اگر اضافہ اُجرت متعارف کے ساتھ نرخ ضروریات میں تخفیف بھی ہو تو پھر کیا کہنا گویا اُجرت صحیحہ میں دوگونہ اضافہ ہوجائے گا۔ لیکن حالت بالکل اس کے برعکس ہو ایک طرف تو اُجرت متعارف بڑھ رہی ہے۔ دوسری طرف ضروریات گراں ہوتی جاتی ہیں، گویا دو متضاد قوتیں اُجرت صحیحہ پر عمل کررہی ہیں۔ اب اگر اضافہ اُجرت متعارف کا اثر گرانی ضروریات پر غالب آگیا تو اُجرت صحیحہ میں اسی نسبت سے اضافہ ہوجائے گا۔ اور اگر اثر اُلٹا پڑا تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا۔ گویا باوجود اضافہ اُجرت بوجہ گرانی ضروریات اُجرت صحیحہ میں تخفیف ہوجائے گی۔ یہی آخری حالت ہی جو ہندوستان کے مزدور اور بلا دست پیشہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر آمدنی کو روپیہ سے شمار کرتے ہیں تو بہ نسبت سابق معقول اضافہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ضروریات کے معیار سے تخمینہ کرتے ہیں تو معاملہ اکثر برعکس نظر آتا ہے اور اس مُعمّہ کی وہ کیسے بھولے پن سے توجیہ کرتے ہیں کہ چودھویں صدی میں دُنیا سے خیر و برکت اُٹھ گئی۔ کلجگ میں مایا کا ست نکل گیا گھر گھر بڑے بوڑھے شاکی ہیں

کہ خدا جانے روپیہ کے کیا پر نکل آئے۔ آتا معلوم ہوتا ہو جاتا نظر نہیں آتا۔ کوئی کتنا ہی کمائے حصہ سوم
اس زمانہ میں پورا نہیں پڑتا۔ اس میں شک نہیں کہ ضروریات کا اضافہ بھی خاندانی مصارف باب ۱۰
کی زیادتی کا باعث ہو سکتا ہو۔ لیکن ہندوستان کے مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں میں یہ ادبار گرانی ضروریات کی بدولت پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستانی مزدور کی مالی حالت اور اس کے اسباب سے مفصل بحث کرنا ایک جداگانہ کتاب معیشت الہند میں زیادہ موزوں ہوگا یہاں مجمل اشارہ کافی ہے۔

واضح ہو کہ ازالۂ مرض سے انسداد مرض بہتر ہو۔ اُجرت صحیحہ بڑھانے یا بالفاظ دیگر مزدور کی مالی حالت قوی کرنے کا طریق بہ نسبت اُجرت متعارف بڑھانے کے نرخ ضروریات گھٹانا بدرجہا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افزونی آبادی اور قانون تقلیل حاصل کے قوی اثرات گرانی کے معاون اور ارزانی کی راہ میں سخت مزاحم بنے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی ترقی کارکردگی اور عجیب و غریب ایجادات کی مدد سے ان اثرات کا زور بہت کچھ توڑا جا رہا ہو اور مصنوعات میں اکثر قانون تکثیر حاصل کا اثر غالب نظر آتا ہو۔ محنت کی پیدا آوری میں جتنا اضافہ ہوگا یعنی اسکی ایک مقدار معیّن سے جتنی زیادہ پیداوار حاصل ہوگی یا پیداوار کی معیّن مقدار حاصل کرنے کے واسطے جسقدر کم محنت درکار ہوگی ضروریات جو اس محنت سے پیدا ہونگی ارزاں ہو جائینگی۔ چنانچہ کارکردگی کی ترقی اور کلوں کی ایجاد کا منشا یہی محنت کی پیداواری کا اضافہ ہوتا ہو اور اسیوجہ سے اُن کے عمل کا اثر ارزانی ضروریات پر بہت موافق پڑتا ہو۔ یہ خیال نکرنا چاہیے کہ ارزانی ضروریات اگر مزدوروں کے حق میں مفید ہو تو ضروریات کے پیدا کرنے والوں کے حق میں بشکل تخفیف آمدنی مضر ہوگی۔ اوّل تو خود ہر ایک پیدا کرنے والے کو بہت سی ضرورتیں درکار ہیں اور اگر اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی ارزانی سے اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو باقی

دوسری ضروریات کی ارزانی جو اس کو درکار ہو اس نقصان کی بشکل تخفیف مصارف پوری تلافی کردے گی علاوہ ازیں ارزانی کی بدولت خود اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی طلب بڑھے گی اور پیدایش برپیمانہ کبیر کے فوائد یا قانون تکثیر حاصل کے اثرات کی بدولت مصارف پیدایش میں ارزانی کے مطابق کم وبیش تخفیف ہوسکے گی۔ اور مزید براں شرح منافع فی شے بوجہ ارزانی گھٹ بھی جائے تو منافع کی مقدار کلی بوجہ اضافہ خرید اشیاء بڑھ جانا عجب نہیں اور ظاہر ہو کہ ہر شے کو منافع کی مقدار کلی سے مطلب ہو نہ کہ شرح منافع فی شے سے (۱۲/۳) اس سے ثابت ہوا کہ ارزانی ضروریات سب کے حق میں مفید ہو اور غالباً کسی کے حق میں بھی مضر نہیں۔ اور قوم کو خوشحال اور دولتمند بنانے کا کارگر طریق محنت و اصل کی پیدا آوری بڑھا کر ضروریات کو ارزاں کرنا ہو اور بس۔

اُجرت کی دو قسمیں متعارف اور صحیحہ بلحاظ معیار ادائگی بیان کی جاچکی ہیں۔ بلحاظ معیار تعین شرح بھی اُجرت کی تین قسمیں پائی جاتی ہیں جبکہ اُجرت کا حساب مطابق اس مقدار وقت کے ہو جو محنت میں صرف کی جائے تو یہ اُجرت مختص بالزماں کہلاتی ہے مثلاً بیس روپیہ ماہوار یا چار آنہ روز۔ اور جبکہ اُجرت مطابق مقدار کام قرار پائے تو اس کو اُجرت مختص بالعمل کہتے ہیں مثلاً کپڑا بنوائی ۲ آنہ گز یا اناج پسوائی ایک روپیہ من یا کتاب لکھوائی ایک روپیہ جزو۔ اُجرت خواہ مختص بالزماں ہو یا مختص بالعمل۔ اس کی مقدار کارکردگی کے مطابق اکثر مزدوروں کے حق میں جدا ہوگی بمعمولی خدمتگار کو آٹھ روپیہ تو ہوشیار کو دس روپیہ ماہوار دیئے جاسکتے ہیں بمعمولی بڑھئی آٹھ آنہ اور کاریگر بارہ آنہ روز پاتا ہو۔ یہی حال اُجرت مختص بالعمل کا ہو۔ جو جتنا کام کرے گا۔ اتنی اُجرت پائے گا۔ ایک ہی شرح سے بعض زود نویس اور محنتی کاتب عہ روز کماتے ہیں اور بعض بمشکل آٹھ آنہ جو مقدار اُجرت بلحاظ کارکردگی دریافت کرتے ہیں

اس کو اُجرت مختص بہ کارکردگی کہتے ہیں۔

واضح ہو کہ بندش رسم ورواج سے مزدوروں کی رہائی کا بالفاظ دیگر اُن کے آزادانہ مقابلے کا نتیجہ اُجرت مختص بالزماں ونیز مختص بالعمل میں فرق اور اُجرت مختص بہ کارکردگی میں تناسب پیدا ہوتا ہو۔ مقابلے کے دباؤ سے ہر مزدور کی اُجرت اس کی کارکردگی کے مطابق بنجائے گی۔ اسیوجہ سے اُجرت مختص بالزماں اور مختص بالعمل میں فرق نمایاں ہوگا۔ غیر مساوی کارکردگی والے مزدور نہ اُجرت مختص بالزماں برابر پاسکیں گے نہ اُجرت مختص بالعمل۔ ہر ایک کی اُجرت کارکردگی کے مطابق ہوگی۔ اور مساوات کارکردگی کے ساتھ ہی مساوات اُجرت خواہ مختص بالزماں ہو یا مختص بالعمل ممکن ہو لہذا جب کہا جاتا ہو کہ مزدوروں کے آزادانہ مقابلہ کا نتیجہ مساوات اُجرت ہی تو وہاں پر اُجرت مختص بہ کارکردگی مُراد ہوتی ہو۔

واضح ہو کہ محنت جسقدر زیادہ نقل پذیر ہوگی اور کام جسقدر غیر تخصیص طلب ہوگا اُسیقدر آزادانہ مقابلہ کا مذکورہ بالا نتیجہ بیشتر واضح ہوگا۔

اُجرت مختص بہ کارکردگی کے متعلق ایک مغالطہ جس کا پیدا ہونا ممکن ہی جتانا ضروری معلوم ہوتا ہی۔ مسئلہ پیدا آوری مختتم کے تحت میں بیان کیا گیا ہی کہ مزدوروں کی کسی جماعت کی شرح اُجرت مزدور مختتم کی پیدا آوری محنت کے جو سب سے کم ہوتی ہے، برابر ہوگی (د ۶/۱) لیکن جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جاچکا ہی۔ ایسی جماعت کے کُل مزدوروں کی کارکردگی یکساں ہونی چاہیئے نہ کہ کم وبیش۔ اور محنت مختتم کی پیدا آوری کمی کا باعث عمل قانون تقلیل حاصل ہی۔ نہ کہ مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص (د ۶/۱) اور یہاں پر آزادانہ مقابلہ کا اثر جو ہر مزدور کی اُجرت اسکی کارکردگی کے مطابق بنا دینا ظاہر کیا گیا ہی۔ تو ایسے مزدوروں کی کارکردگی میں بجائے یکسانیت کے فرق فرض کیا جاتا ہی۔ گویا ان دونوں

حصہ سوم باب ۱۰

بحثوں کا علی الترتیب نتیجہ یہ ہی کہ یکساں کارکردگی والے مزدور برابر برابر اجرت پاتے ہیں اور مختلف کارکردگی والے مزدوروں کی شرح اُجرت میں کارکردگی کی کمی بیشی کے مطابق تخفیف و اضافہ ہوتا رہتا ہی جو جتنا کام کرتا ہی اتنی اُجرت پاتا ہی۔

چونکہ ان دونوں مسئلوں میں بظاہر تضاد نظر آنے کا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ احتیاطاً مزید تشریح کردی گئی۔

فرقِ اُجرت کے اسباب

(۸) شرح اُجرت میں بیشمار فرق پائے جاتے ہیں۔ غریب قُلی دن بھر بوجھ ڈھوکر بمشکل کُنبہ کی گزر کے لایق شام تک کماتا ہی اور ایک مشہور گویا گھنٹہ بھر گا کر صدہا روپیہ پالیتا ہی۔ سرکاری ملازمین یا کارخانجات کے مزدوروں کی فہرست تنخواہ یا اُجرت اُٹھا کر دیکھو تو چند روپیہ سے لیکر ہزاروں روپیہ تک بیشمار مدالج نظر آئیں گے۔ ظاہر ہی کہ یہ بیشمار دیرپا اور بڑے بڑے فرق محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہوسکتے۔ اُجرت صحیحہ کے تخمینہ میں جن جن باتوں کا لحاظ لازمی ہی اوّل اُن کی تفصیل کریں گے بعدہٗ ہم فرق اُجرت کے اسباب تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

تخمینہ اُجرت صحیحہ میں اُمور ذیل لازمی طور سے توجہ طلب ہیں۔

(۲) زرِ نقد کی قوّت مبادلہ میں کمی بیشی۔ بالفاظ دیگر ضروریات کی گرانی و ارزانی باوجودیکہ ریلوں نے اکثر چیزوں کی قیمت ہر جگہ کم و بیش مساوی کردی ہے، تاہم واقعات شاہد ہیں کہ خورونوش کی معمولی چیزیں جنکی مزدور کو ضرورت ہی شہروں میں بہ نسبت دیہات و قصبات کے زیادہ گران ملتی ہیں۔ ایندھن، گھاس، چارہ جن کی مفصلات میں کوئی کمی نہیں۔ شہروں میں غلّہ کی مانند تُل کر فروخت ہوتے ہیں۔ اور مکانات کے کرایہ میں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہی۔ حاصل کلام یہ کہ جو ضروریات شہروں میں ایک روپیہ سے پوری ہوتی ہیں اُن کے واسطے مفصلات میں آٹھ آنے بلکہ اس سے بھی کم کافی ہیں اور اسیوجہ سے دیہات کی

حصہ سوم
باب ۲

مزدور گو اجرت میں زرِ نقد کم پائیں لیکن بلحاظ حصول ضروریات وہ شہر والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہ ہوں گے چنانچہ شہر والوں کی آمدنی کی زیادتی اکثر سطحی دھوکا ہوتی ہے۔ ان کو قصبات کے کم آمدنی والوں سے زیادہ آرام میسر نہیں ہوتا۔ شہروں میں جو چیزیں بمقابلہ قصبات کے ارزاں ملتی ہیں وہ اکثر تعیشات سے متعلق ہیں۔ دولتمند اُن سے لطف اُٹھا سکتے ہیں غریب مزدور کی حیثیت سے وہ بالاتر ہیں۔ جہاں تک مایحتاج زندگی کا تعلق ہے۔ مفصلات کی بود و باش بمقابلہ شہروں کے بہت کم خرچ ہوتی ہے۔

(ب) طریق ادائگی اُجرت: بالعموم تو مزدوروں کو صرف اجرت متعارف دی جاتی ہے لیکن بعض پیشہ وروں کو اجرت کا ایک جزو بشکل ضروریات بھی ملتا ہے۔ یعنی ان کی کچھ اجرت متعارف ہوتی ہے اور کچھ صحیحہ۔ مثلاً سائیس کو علاوہ ماہواری تنخواہ کے رہنے کے واسطے مکان، جلانے کے واسطے بچی کچی گھاس اور امراء کے ہاں پہننے کے واسطے وردی بھی ملتی ہے۔ باورچی کو بھی علاوہ تنخواہ کے خوراک و مکان ملتا ہے۔ ریلوے ملازمین کو کرایہ معاف ہے۔ کہیں کہیں بڑے کارخانوں کے مزدوروں کو مکانات بلا کرایہ دیئے جاتے ہیں۔ ان کو ضروریات تھوک فروشی کے کم تر نرخ سے مہیا کی جاتی ہیں۔ اور نیز پیداوار خام کے بعض ناقص حصے جو کارخانہ دار کے نزدیک از کار رفتہ ہوتے ہیں مزدوروں کو مل جاتے ہیں جن سے وہ تھوڑا بہت کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ غریب مزدور موسم سرما میں خصوصاً رات کے وقت روئی اوٹنے کے کارخانوں میں نہایت شوق سے کام کرتے ہیں کیوں کہ علاوہ اجرت ملنے کے ان کو سردی کی تکلیف سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ یہ تمام ضروریات جو مزدوروں کو حاصل ہوتی ہیں اجرت صحیحہ کا جزو ہیں۔ اور اجرت کلی کے تخمینہ میں ان کا لحاظ ضروری ہے۔

یہاں یہ نکتہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کو جو ضروریات مہیا کی جاتی ہیں

حصہ سوم باب ۶ ان کی قدر و قیمت کا تخمینہ مزدور کے نقطۂ خیال سے کرنا چاہئے نہ کہ آجر کے۔ فرض کرو کہ کوئی امیر اپنی تزک و شان کے خیال سے اپنے ملازمین کو زرق برق قیمتی لباس پہنائے یا اپنے پاس اس کو کسی ایسی جگہ رکھے جہاں کرایہ مکان و صرف خوراک بہت زیادہ ہو تو ایسے لباس کی قیمت یا خرچ خوراک و کرایہ مکان کا حصہ رسد جزو اس کی اجرت میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ مزدور اگر آجر کا مطیع نہ ہوتا تو نہ ایسا لباس پہنتا، نہ ایسی جگہ آکر رہتا۔ مذکورۂ بالا مصارف کی مقتضی آجر کی ضروریات ہیں نہ کہ مزدور کی۔ لہذا آجر کی ضروریات مہیا کرنے میں خواہ کچھ ہی صرف ہو مزدور کی اُجرت میں ان کے مصارف کا صرف اس قدر حصہ شمار کرنا چاہئے جو خود مزدور کی ضروریات کے واسطے بحالت خودمختاری مزدور کو درکار ہوتا۔ اسی طرح اگر مزدور کو ایسی چیز ملے جو آجر کے نزدیک محض نکمی اور ناکارہ ہو اور مزدور کا اس سے کوئی کام نکل سکے تو یہ چیز نہ ملنے کی حالت میں ایسی ضرورت پر مزدور کو جو کچھ صرف کرنا پڑتا وہ اس چیز کے تعلق سے مزدور کی اجرت میں شمار کرنا چاہئے حاصل کلام یہ کہ کوئی چیز جو مزدور کو دی جاتی ہے آجر کے نزدیک بیش قیمت ہو یا ناکارہ، اس کی قیمت وہ رقم قرار دینی چاہئے جو مزدور کو چیز نہ ملنے کی حالت میں ضرورت متعلقہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرنی پڑتی۔

(ج) خود مزدور کو یا اس کے خاندان کو مزید اجرت حاصل کرنے کا موقع: بعض پیشے ہیں کہ ان میں علاوہ تنخواہ کے مزید آمدنی حاصل کرنے کے موقعے بھی پیدا ہو سکتے ہیں اسکول کے مدرس نج کے طور پر طلباء کو پڑھا کر تنخواہ ملازمت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ روپیہ کما لیتے ہیں۔ بعض طبیب اور ڈاکٹر کسی عزیز یا دوست کا دواخانہ جاری کرا کر اپنے مریضوں کو وہاں سے دوا خریدواتے ہیں اور منافع میں خود بھی شریک رہتے ہیں۔ اسی طرح ہوشیار درزی کپڑا بھی خود ہی فروخت کرتے ہیں۔ اور دوسری جگہ سے خریدے ہوئے

کپڑے کے مقابلہ میں اپنے ہاں کے کپڑے کو جلد تر اور زیادہ عمدگی سے تیار کرکے گاہکوں کو اپنی دکان سے کپڑا خریدنے پر ایک حد تک مجبور کرتے ہیں۔ علاوہ اجرت سلائی کپڑے کی تجارت سے بھی منافع اٹھاتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور دفتروں کی ملازمت میں اپنے عزیز و اقربا کے واسطے صورتیں پیدا کرنی آسان ہوتی ہیں اور بعض محکموں مثلاً ریلوے میں تو کسی ملازم کی رشتہ داری ازروئے قاعدہ امیدوار کے حقوق میں داخل ہے۔ حصول ملازمت میں بعض پس ماندہ فرقوں کے افراد کو انہیں تعلقات کی کمزوری کی وجہ سے بمقابلہ دیگر قابو یافتہ فرقوں کے ناکامی یا کم از کم دقت پیش آتی ہے۔ اگر کسی خاندان کے اکثر افراد ملازم ہوں اور فرداً فرداً تنخواہ کم ہو تو خاندان کی مجموعی آمدنی کسی ایسے خاندان سے زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے جہاں صرف ایک شخص بڑی تنخواہ پاتا ہے اور باقی سب بے کار ہیں۔ اور چوں کہ مالی حالت کل خاندان کی مجموعی آمدنی اور مصارف کی نسبت سے متعلق ہے لہذا اقربا و اعزا کے واسطے ملازمتیں پیدا کرنے کی قدرت اجرت صحیحہ کا اس وجہ سے ایک جزو ہے کہ اس سے خاندانی آمدنی بڑھانے کی ضرورت حاصل ہوتی ہے۔ ہر سمجھدار مزدور ایسے کارخانہ میں جہاں صرف اس کی محنت درکار ہو، آٹھ آنہ روز پر کام کرنے کے مقابلہ میں دوسرے کارخانہ میں چھ آنہ روز پر کام کرنا پسند کرے گا جہاں اس کے بچے بھی سہل کام کرکے ۳؍ روز کما سکیں۔ چنانچہ باوجود کمی شرح اجرت مزدور اس جگہ رہنا پسند کرتے ہیں جہاں خاندان کے اکثر افراد کام پا سکیں۔ گویا مزدور کے نزدیک خاندان کی مجموعی آمدنی قابل لحاظ ہے نہ کہ شرح اجرت اور یہی بات قرین عقل بھی ہے۔ خاندانی آمدنی کی اہمیت صنائع تضمینی و تفضیمی کے تحت میں بھی واضح کی جا چکی ہے (۱۲)

کسی شے میں خود ملازم کو جو مزید آمدنی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً اسکول کے مدرس کو نجی تعلیم سے فیس ملتی ہے تو اس کو اصطلاحاً اجرت تضمیمی کہتے ہیں، خاندان کی مجموعی کمائی

حصہ سوم کو بھی اجرت خاندانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

باب ۱ ان دونوں قسم کی اجرتوں کا اجرت صحیحہ سے جو قریبی تعلق ہے ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں۔

(د) سلسلۂ ملازمت کا قیام: بعض پیشے تو بارہوں مہینے یکساں چلتے ہیں جیسے دھوبی، حجام، سقّے اور باورچی کا کام لیکن بعض خاص خاص موسم یا حالات میں فروغ پاتے ہیں اور باقی وقت بیکاری میں بسر کرتے ہیں مثلاً درزی اور معمار بارش کے موسم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن موسم پھرا آتے ہی ان کا روزگار چمک اٹھتا ہے۔ تجارتی مرکزوں میں غلہ ڈھونے والے مزدور جن کو پلّہ دار کہتے ہیں، فصل ربیع و خریف کے موقع پر اتنا زیادہ کما لیتے ہیں کہ برسات میں گھر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے بیاہ شادی کے موسم کچھ مقرر سے ہیں ان دنوں میں تو باورچی اور باجہ بجانے والوں کو سائیاں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن باقی دنوں میں وہ اتفاقی تقریبوں کا نہایت بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جب آب و ہوا بگڑتی ہے تو طبیب اور ڈاکٹروں کو دم لینے تک کی مہلت نہیں ملتی اور ہر وقت مٹھی گرم رہتی ہے۔ لیکن اچھے موسم میں وہ بھی باطمینان مطب میں بیٹھے دوستوں کی گپ یا تاش و شطرنج کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مریض آ گیا تو نسخہ لکھ دیا ورنہ اکثر مبارک دن وہ دوستوں کی لطف صحبت ہی سے دل شاد رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ روزگار چلنے کے زمانہ میں ایسے غیر مستقل ملازمت والے اتنا زیادہ کمانے کی کوشش کریں گے کہ بیکاری کا زمانہ بسر کرنے کے لئے کافی پس انداز کر سکیں لہٰذا اگرچہ ایسے پیشہ وروں کی شرح اجرت زیادہ معلوم ہو لیکن درحقیقت باکاری و بیکاری کا زمانہ شمار کرنے سے ان کی اُجرت کا اوسط بہت گھٹ کر معمولی شرح پر آ جاتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگر بے کاری کا زمانہ سخت محنت اور جفاکشی کے بعد

پیش آئے تو اس سے صحت و تندرستی کو بے حد نفع پہنچتا ہے۔ اور رہا آمدنی رُک جانے سے جو کچھ نقصان ہوتا ہے اس کی بہت کچھ تلافی راحت اور تقویت صحت سے ہو جاتی ہی مثلاً کامیاب بیرسٹر کو کس قدر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہی۔ عدالت کی تعطیل کلاں اس کی تندرستی کے حق میں اس قدر مفید ہی کہ کاروبار رک جانے سے اُس کو حقیقتاً کوئی نقصان نہیں پہنچتا اس بیکاری کے زمانہ میں ماسبق کاروبار کی دماغی اور جسمانی تکان رفع ہو کر بعد تعطیل بیرسٹر تازہ دم کام شروع کرنے کے قابل ہو جاتا ہی جو صحت و راحت ایسی بے کاری میں حاصل ہوتی ہے وہ بھی اجرت صحیحہ کا جزو سمجھنی چاہیئے اس کے برعکس اگر کاروبار کی کساد بازاری سے بے کاری مسلط ہو جائے تو ایسی حالت میں بجائے آرام و تقویت کے پریشانی کی تکلیف سے صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔ گویا ایسی بے کاری سے اجرت صحیحہ کے اوسط میں تخفیف ہو جاتی ہی۔

بے کاری کے مذکورۂ بالا فرق کی بدولت بلا تنخواہ رخصتی ملازم اور بیکار آدمی کی حالت میں کتنا فرق نظر آتا ہے۔ ایک کے نزدیک بیکاری ضروری ہے اور دوسرے کے حق میں وبال جان۔

(س) پیشہ کا صحت و طاقت پر اثر: اکثر کام تو ایسے ہیں کہ مزدور اُن کو عرصہ دراز تک سرانجام دے سکتا ہی۔ لیکن بعض کاموں کا مزدور کی صحت پر اس قدر مضر اثر پڑتا ہی کہ اس کو جلد ناکارہ بنا دیتا ہی۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ تعداد اموات کا پیشہ کی نوعیت سے بہت کچھ تعلق ہے۔ پادریوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ ان کی تعداد اموات سو فرض کر کے نسبتاً تعداد اموات کاشتکاروں میں صرف ۱۱۴ قانون پیشہ لوگوں میں ۱۵۲ شراب بنانے والوں میں ۲۴۵ شراب فروشوں میں ۲۷۴ کمہاروں میں ۳۱۴ اور کان کھودنے والوں میں ۳۴۱ انگلستان میں تخمینہ کی گئی۔ چنانچہ بیمہ کمپنیاں بھی اس واقعہ کا

حصہ دوم باب

لحاظ کرکے ایسے لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیتی ہیں جو ازحد خطرناک اور مضر صحت پیشوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ باوجود تمام احتیاطوں کے کان کنی خطرناک اور مضرت رساں ہے اور خصوصاً پارہ کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت دو ایک ہی سال میں اس قدر تباہ ہو جاتی ہے کہ ان کو زندگی کے باقی دن کاٹنے دوبھر ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ دکن میں جہاں پارہ نکلتا ہے مزدوروں سے کم وبیش دھوکہ لالچ اور جبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطرناک اور مخرب صحت کام لینے کے لئے مزدوروں کو اعلیٰ شرح اجرت کا لالچ دینا لازمی ہے۔ اضافہ آمدنی کے لالچ بغیر کون خطرہ اور علالت اپنے ذمہ لینا گوارا کر سکتا ہے اور جہاں مضرت کا اندیشہ اتنا قوی ہو کہ لالچ کی کشش بھی مزدور مہیا نہ کر سکے۔ تو مجبوراً دھوکہ یا جبر سے بھی کام لینا عجب نہ ہوگا۔ اگرچہ قانون کی تیز شعاعیں ہر جگہ امن وعافیت کی روشنی پھیلا رہی ہیں، پھر بھی خدا جانے ظلم وتشدد کی تاریکی ابھی کہاں کہاں چھائی ہوئی ہے۔ ایسے معدودے چند ازحد مضر صحت پیشوں کے علاوہ معمولی پیشوں میں بھی کام کا صحت پر کم وبیش مضر اثر پڑتا ہے اور شرح اجرت میں بھی اکثر اسی کے مطابق کمی بیشی ہوتی ہے۔

جو مزدور ایک پُرامن کام میں ہر روز کماتا ہے خطرناک کام میں دس بارہ آنہ روز کما سکے تو عجب نہیں ہے اور جو "زیستن برائے کار" کے قائل ہیں وہ جان پر کھیل کر آمدنی بڑھاتے ہیں۔

(س) مصارف پیشہ: عام مقولہ ہے کہ وکالت کا پیشہ نمایش طلب ہے۔ وکیل کو کامیابی کے واسطے ظاہری ٹھاٹھ رکھنا لازمی ہے۔ مکان شاندار و آراستہ ہو، گھوڑا گاڑی بھی قیمتی اور نفیس ہو، عمدہ لباس سے ذاتی وجاہت بھی بڑھی چڑھی رہے عام تعلقات وسیع ہوں، حکام اور رؤسا سے ربط ضبط بڑھا ہوا ہو۔ تب کہیں وکالت

زور پکڑ سکتی ہے۔ ورنہ محض سادگی کی وجہ سے لوگ اس قدر بدعقیدہ ہو جاتے ہیں کہ بعض قابل سے قابل وکیلوں کے جوہر کھلنے نہیں پاتے۔ اور یوں کوئی لعل گودڑ میں چمک اٹھے تو وہ مستثنے سمجھنا چاہیئے۔ یوں تو ہر پیشے میں ذاتی وجاہت اور طریق بود و باش کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن وکالت میں وہ بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ طبابت کا بھی کم وبیش یہی حال ہے۔ اسی طرح عدالتی عہدوں کے مقابلہ میں انتظامی عہدہ بیش خرچ ہے ڈپٹی کلکٹروں کو مقامی رؤسا اور معززین سے میل جول رکھنے کے لئے بود و باش بھی اعلےٰ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کھانے کھلانے میں بھی ان کا صرف ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر مصنف چاہے تو بجد سادہ زندگی بسر کرے اور اس کے کام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض مصارف محض پیشہ کی مجبوری سے انسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں ورنہ اس کی کوئی ضرورت اُن سے حاصل نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس پیشے میں شریک نہ ہوتے تو ایسے مصارف کبھی گوارا نہ کرتے۔ محض موکلوں یا مریضوں کی یا طالب علموں کی ضرورت سے وکیل، طبیب یا معلم معقول کرایہ پر عمدہ موقع کے وسیع مکانات لیتے ہیں۔ ورنہ اگر وہ کسی دفتر میں ملازم ہوتے تو شاید اس سے ایک چوتھائی کرایہ کے مکان کو اسی کے برابر اپنے واسطے آرام دہ پاتے۔ یا فرض کرو کہ کوئی شخص اپنے ملازم کو مجبور کرے کہ وہ معمول سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے، تو ایسے کل مصارف جو مزدور کو محض پیشے کی خاطر برداشت کرنے پڑیں اور جو شریک پیشہ ہونے کی صورت میں وہ گوارا نہ کرتا، اس کی اجرت سے منہا کرنے ضروری ہیں۔ جو کچھ باقی بچے وہی اُس کی اُجرت ہے۔ اس کی اُجرت کو قبل و بعد منہائی مصارف پیشہ علی الترتیب اجرت خام اور اجرت خالص کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔

(ص) مناسبت شوق و مذاق: اکثر اشخاص کو کسی نہ کسی چیز کا خاص شوق اور مذاق ہوتا ہے۔ کوئی لذیذ کھانے کا شوقین ہے تو کوئی نفیس لباس کا۔ کسی کو گانے بجانے کی دُھن ہے تو کوئی سیر و شکار کا دیوانہ ہے۔ کوئی روپیہ کا خواہاں ہے کوئی عزت کا طالب اور کسی کو حکومت و اقتدار سے زیادہ کوئی چیز بھی مرغوب نہیں۔ اور بعض طبیعتوں کے خواص اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ وہ افعال و اعمال پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ گنوارو کہاوت ہے۔ "چار سے دو ہی کر دے۔ پر نام داروغہ دھر دے" حکومت پسند طبیعتیں مالی آمدنی کی پروا کم کرتی ہیں۔ ڈپٹی کلکٹری جیسے انتظامی عہدوں سے ایسے مصارف وابستہ ہیں کہ ان کی آمدنی خالص بعض دیگر مساوی تنخواہ والے عہدوں سے کم اور ہر ایک شخص رشوت بھی نہیں لیتا۔ اس عہدہ کے واسطے جو اس قدر سخت کوشش اور مقابلہ ہوتا ہے۔ اس کا حقیقی باعث وہ تعزز اقتدار ہے جو اس سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ فوج کی تنخواہ نسبتاً دوسرے محکموں سے کم ہے لیکن سپاہی منش لوگ ایسی جاں بازی کی ملازمت پر جان دیتے ہیں۔ سیاحت پسند لوگ ریلوے کی ملازمت سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ شکاریوں کو جنگلات کی ملازمت بے حد پسند ہے۔ سیر و تفریح کے شائق ایسے مقامات میں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں جہاں آب و ہوا عمدہ ہو اور دلکش قدرتی مناظر کی کثرت ہو۔ گرچہ عام طور پر لوگ جہاں موقع پاتے ہیں ملازمت کر لیتے ہیں۔ لیکن بعض طبیعتوں پر شوق اور مذاق کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ انتخاب ملازمت میں ان کا خاص لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان کی خاطر مالی منفعت کی تخفیف تک گوارا کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی اجرت صحیحہ میں اجرت متعارفہ کے علاوہ لطف و مسرت بھی شمار کرنا چاہئے، جو شوق پورا ہونے سے حاصل ہوتا ہے اور جس کا تخمینہ زر نقد کی وہ مقدار ہے جو شخص مذکور اس کی خاطر چھوڑنے پر

حصہ سوم
باب ۲

رضامند ہو سکے۔

گویا شوق پورا کرنے کی حالت میں خود محنت مزدور کے حق میں دولت بن کر اجرت صحیحہ کا جزو ہو جاتی ہے۔ اس واقع کو بعنوان تشریح خدمت مقدمہ میں واضح کر چکے ہیں۔ یہاں یہ جتانا بھی ضرور ہے کہ جو کام مذاق کے خلاف ہو اور طبیعت کو گراں گزرے اس کی اجرت صحیحہ سے وہ بے لطفی اور تکلیف منہا کرنی چاہیئے جو ایسے کام کرنے سے خاص طور پر محسوس ہو اور جو محنت کی عام تکان سے بالکل جداگانہ اور مختلف ہے اور جس کا تخمینہ بھی وہ زر نقد ہے جو اس سے بچنے کے لئے مزدور چھوڑنے پر آمادہ ہو سکے۔ گویا کوئی کام جس حد تک مزدور کے مذاق کے خلاف ہوگا اس کے حق میں افادہ منفی بن کر اجرت صحیحہ میں تخفیف کر دے گا۔ گویا بحالت مساوات اجرت متعارفہ بے مذاق کام کرنے والے کی اجرت صحیحہ سے حسب مذاق کام کرنے والوں کی اجرت صحیحہ زیادہ اور خلاف مذاق کام کرنے والوں کی کمتر ہوگی۔ پس مزدور ثانی الذکر کی اجرت صحیحہ مزدور آخر الذکر سے بدرجہ اولیٰ زیادہ ہوگی۔

مثلاً اگر کوئی شخص مجبوری سے یا اتفاق سے یا شوق سے کاشمیر یا شملہ رہ کر کام کرے تو ان تینوں حالتوں میں بمقابل یک دیگر علی الترتیب اجرت صحیحہ زیادہ ہوگی۔ جب تکمیل شوق بھی اجرت صحیحہ کا جزو ٹھیرا تو اگر علمی مذاق کے لوگ مالی منفعت کی جستجو ترک کر کے مناسب ضروریات پر اکتفا کریں اور مشغلہ تعلیم و تصنیف میں شاد و فرحاں رہیں تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ حقیقی شاعر، ادیب، فلاسفر جیسے قوی علمی مذاق والوں نے ہمیشہ مادی دولت کو ناقابل التفات سمجھا ہے۔

یہاں یہ جتانا خالی از لطف نہ ہوگا کہ افراد کی طرح قوم اور فرقوں کے شوق و مذاق بھی کم و بیش جداگانہ اور مخصوص ہوتے ہیں۔ مثلاً پٹھان، سکھ، راجپوت اور مرہٹے

حصہ سوم
باب ۱

اب تک فوجی خدمت کے شائق ہیں۔ انتخاب ملازمت میں مسلمان بالعموم حکومت اور اختیار کا زیادہ لحاظ کرتے ہیں۔ اور اہل ہنود مقدار تنخواہ پر نظر رکھتے ہیں۔ پارسیوں کو دفتر کا کام بہت پسند ہے۔ بنگالی دماغی محنت کے بڑے مرد ہیں۔ راجپوتانہ کے مارواڑی لین دین کے کام میں بے اعتدالی اور بدنامی کی حد تک مصروف اور ماہر ہیں۔ اور کاٹھیاواڑ کچھ کے بوہرے میمن تجارت میں ایسے مگن رہتے ہیں جیسے پانی میں مچھلی۔

اجرت صحیحہ کے تخمینہ میں جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے، اُن کی تفصیل بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس کی فرق کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اجرت کے اضافہ و تخفیف کے اسباب اور حدود قوانین اجرت کی بحث میں واضح کئے جا چکے ہیں (۶ ، ۱۰) لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذکورۂ بالا قوانین کا مجموعی عمل بشکل قانون طلب و رسید نمودار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر مزدوروں کی موجودہ اور مطلوبہ تعداد کی باہمی نسبت سے ان قوانین کے مطابق اجرت میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے۔ قانون طلب رسید کا اجرت کے اساسی قوانین سے تعلق جتانے کے بعد اب ہم اس کا اجرت پر اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

عام تجربہ ہے کہ اگر ایک چیز کے دو خریدار ہوں تو قیمت بڑھے گی اور اگر ایک کے خریدار کو ایسی دو چیزیں پیش کی جائیں تو قیمت گھٹ جائے گی۔ گویا قیمت میں اضافہ اور تخفیف علی الترتیب رسد اور طلب کی کمزوری یا بالفاظ دیگر طلب و رسد کے غلبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال اجرت کا ہے۔ اگر ایک مزدور کو دو آجر بلائیں تو اجرت بڑھے گی۔ اور اگر ایک آجر کی طرف دو مزدور دوڑیں تو اجرت میں تخفیف ہونا یقینی ہے۔ گویا قیمت کی طرح اجرت بھی بلحاظ کمی بیشی قانون طلب و رسد کے زیر عمل ہے۔ چیزیں بنانے کے واسطے محنت ناگزیر ہے۔ لہٰذا کسی چیز کی طلب میں کمی بیشی ہونے سے اس

محنت کی طلب میں بھی کمی بیشی لازمی آتی ہے تو چیز مذکور کے بنانے میں صرف ہو مثلاً گھڑی سگریٹ یا موٹر کار رواج جس قدر گھٹے بڑھے گا، اُسی قدر کم زیادہ اُن کے بنانے والے درکار ہوں گے گویا چیزوں کی طلب سے محنت متعلقہ کی طلب محنت کی حقیقت سے وابستہ ہے اوپر بیان کر چکے ہیں اب ہم رسد محنت کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اور یہ دونوں پہلو پیش نظر ہونے کے بعد قانون طلب و رسد کا اجرت پر عملدرآمد بخوبی ذہن نشین ہو سکے گا۔ واضح ہو کہ جس طرح نہر کی چھالیں پانی کے بڑے بڑے تختے جا بجا روکے رکھتی ہیں اور صرف سطح کا پانی ان پر گزر گزر کر آگے بڑھتا رہتا ہے، بعینہ محنت کی آزادانہ رسد میں بھی چند زبردست بندشیں سدِ راہ ہو کر ترقی پزیر محنت کی مقدار گھٹاتی چلی جاتی ہیں۔ اگر یہ بندشیں نہ ہوتیں تو سطح آب ہر جگہ برابر ہوتی۔ پانی جدھر ڈھلاؤ پاتا بہنے لگتا۔ مزدوروں کے طبقوں میں اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا۔ رسد محنت فوراً طلب کی پیروی کرتی۔ لیکن جب کہ متعدد بندشیں آزادانہ حرکت میں مزاحم ہوں تو پانی میں پست و بلند تختے اور مزدوروں میں اعلیٰ ادنےٰ طبقے پیدا ہو جانے لازمی ہیں۔ اور پانی کا بہاؤ اور محنت کی رسد بیشتر بندشوں کی حالت پر منحصر ہو جاتی ہے۔ چند قابل لحاظ رکاوٹیں جو رسد محنت میں مزاحم ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) قدرتی مناسبت و استعداد: کہتے ہیں کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تعلیم سے نہیں بنتا۔ گویا استعداد شاعری خداداد ہوتی ہے۔ اکتسابی نہیں ہو سکتی۔ یہی حال کم و بیش مصوری اور موسیقی کا ہے۔ ان فنون لطیفہ میں ہر کوئی محنت اور کوشش کے زور سے کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ خیال ہے کہ عمدہ تراش اور اعلیٰ جرّاحی کے واسطے بھی بعض ہاتھ قدرتاً موزوں ہوتے ہیں۔ جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں صرف بعض نہایت توانا تندرست ہوتے ہیں اور بعض از حد ذکی و تیز فہم اور باقی دونوں لحاظ سے اوسط

حصہ دوم
باب ۳

اور ادنیٰ درجہ میں شمار ہوتے ہیں گویا مناسبت اور استعداد کی تقسیم غیر مساوی ہے خود قدرت نے محنت کی رسد پر حدود قائم کرکے مزدوروں کے جدا جدا طبقے پیدا کر دیئے جس کام کے واسطے خداداد استعداد کی ضرورت ہے اس کے کرنے والوں کی رسد قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ الہ آباد کی مشہور نمائش میں مس گوہر سرکاری اہتمام سے بمشکل ایک گھنٹہ روز گاتی ہوگی۔ کئی ہزار روپیہ کے ٹکٹ روز فروخت ہوتے تھے۔ جس میں سے صرف ایک ہزار مس گوہر بطور فیس لے لیتی تھی۔ اگر مس گوہر جیسی گانے والوں کی کثرت ہوتی تو ایسی آمدنی ناممکن تھی۔ ملکۂ روس نے جب ایک مشہور گانے والے سے شکایت کی کہ وہ روس کے سپہ سالار اعظم کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ روزانہ فیس وصول کر رہا ہے تو اس نے کیا معقول جواب دیا کہ پھر آپ اپنے سپہ سالار اعظم ہی سے گانا کیوں نہیں گوا لیتی ہیں میری کیا ضرورت ہے۔ اگر محض کوشش سے مصوری میں کمال پیدا کرنا ممکن ہوتا تو مانی و بہزاد کا نام دنیا میں یوں غیر فانی نہ ہو سکتا۔ ایک ایک تصویر کی ہزارہا روپیہ قیمت کیوں دی جاتی ہے۔ دستی تصاویر فوٹو کی طرح کیوں ارزاں نہیں بکتیں۔ اکثر کلوں کی ایجاد نے جسمانی طاقت کی ضرورت گھٹا دی۔ تاہم بعض کاموں میں اب تک جسمانی طاقت خاص طور سے درکار ہے اور ایسے طاقتور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے شرح اجرت بھی معمول سے زیادہ ہے۔ لوہا صاف کرنے اور ڈھالنے کے کارخانوں میں بعض ان پڑھ مزدور نہایت طاقت طلب کام کرکے تین سو روپیہ ماہوار تک کما لیتے ہیں۔ علمی کاموں میں خداداد دماغی قوت کا فرق ہر طرف نمایاں ہے قانونی دنیا کے آسمان پر مسٹر محمود مرحوم کا نام مثل آفتاب کیوں روشن ہے۔ ڈاکٹر راش بہاری گھوش بیرسٹر بھی نہیں صرف وکیل ہائی کورٹ ہو کر ہزار روپیہ پیشی کیوں کر کما لیتے ہیں؟ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر قلتِ رسدِ محنت جو اضافہ شرح

اجرت کا باعث ہوتی ہے وہ قدرت کی آفریدہ ہے۔ حصہ سوم

(ب) صرف و وقت اکتساب قابلیت۔ قدرت نے انسان میں جو استعداد ودیعت کی ہے اس کی حالت اس سونے کی سی ہے جو مٹی میں ملا کان میں پڑا ہو۔ کان سے کھود کر نکالنا مٹی سے صاف کرنا سونے سے کام لینے کی مقدم شرطیں ہیں۔ بعینہٖ خدا نے انسان کو جو استعداد عطا کی ہے اس کا پتہ لگانا اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اس کو اصلاح اور ترقی دے کر کمال پیدا کرنا قابلیت کے واسطے لازمی ہیں۔ خواص محنت کی بحث میں ہم بالتفصیل واضح کر چکے ہیں کہ کیوں کر تعلیمی مصارف اور تربیت کی دقتیں اکثر ہونہار غریب بچوں کو ان ترقیات سے محروم کر دیتی ہیں جن کی وافر استعداد اُن کی ذات میں موجود ہوتی ہے (۳/۵) بہت نہیں لیکن پھر بھی چند نیوٹن شیکسپیر، نپولین، بسمارک اور گلیڈ اسٹون یورپ میں ضرور پیدا ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے ایک ایک کے سوائے باقی سب نامساعد حالات کے شکار ہو گئے۔ اس موقع پر خواص محنت کا بیان پڑھنے کی سفارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گویا رسد محنت پر ایک حد تک قدرت نے غیر مساوی تقسیم استعداد سے قایم کر دی۔ دوسری حد استعداد کو قابلیت بنانے کے مصارف اور دقتوں سے پیدا ہو گئی۔ باب ۱

(ج) مذکورۂ بالا غیر اختیاری بندشوں کے علاوہ کچھ رُکاوٹیں مذہب رسم و رواج اور قانون نے بھی رسد محنت میں پیدا کر رکھی ہیں۔ مثلاً مسلمان شراب کے کام سے جُدا رہتے ہیں۔ ہندو گوشت اور چمڑے کے کاروبار میں بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں۔ مسلمان تو بلا تکلف ہندوؤں کی بنائی چیزیں کھاتے ہیں مگر اکثر ہندو سوائے اپنے ہم مذہب اور خصوصاً برہمن کے اور کسی کی بنائی حتیٰ کہ چھوئی ہوئی کھانے پینے کی چیز کو پاس تک نہیں آنے دیتے۔ اسی وجہ سے مسلمان حلوائیوں کی دُکانیں بہت کم

سرسبز ہو سکتی ہیں۔ لوہار، بڑھئی، معمار، درزی وغیرہ کے پیشے رسماً دستے خیال کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ اب ان پیشوں کی اجرت معقول ہو گئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے لیکن اب تک رسم و رواج کے اثر سے نادار شریف قلیل ملازمت حتیٰ کہ فاقہ کشی کو یہ پیشے اختیار کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔ غریب شریف دس روپیہ کی معلمی کو بیس روپیہ کی درزی گری سے ہزار درجہ غنیمت سمجھے گا۔ اسی مشیخت کا نتیجہ ہے کہ بے کار شریفوں پر افلاس کی مصیبت چھائی ہوئی ہے اور پیشہ ور لوگ جن کو رذیل خیال کیا جاتا ہے روز بروز خوش حال اور مال دار بنتے جاتے ہیں۔ شریفوں کو خاندانی محلات کی مرمت کی بھی توفیق نہیں اور پیشہ ور نئے نئے مکانات تیار کرا رہے ہیں۔ شریف آبائی جائداد گرو رکھتے پھرتے ہیں۔ پیشہ وروں میں جائداد کا شوق پھیل رہا ہے۔ اگر کچھ دنوں رسم و رواج پیشے اختیار کرنے میں یوں ہی مزاحم رہے تو ان دونوں طبقوں کی مالی حالت میں بالکل کایا پلٹ ہو جائے گی بمقابلہ ہمسایہ قوموں کے مسلمانوں میں پیشے خاص طور سے شرافت کے منافی خیال کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید گزشتہ حکومت کا خمار ہو۔ ورنہ اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق مٹائے اور پیشہ وروں کا رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلا تکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ اسلامی تاریخ کے سب سے درخشاں حصے میں مسلمانوں کی آزادی پیشہ گری ہی خاص طور سے نمایاں نظر آتی ہے۔ لیکن کیسے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ خود فرقہ بند ہمسایہ قوم تو ہمارے آزادانہ اصول اختیار کر کے شاہ راہِ ترقی پر چل نکلے اور ہم اس کے پابند کن اصول اپنے اوپر عائد کر کے بے دست و پا افلاس و نکبت کے جال میں پھنسے رہیں۔ پیشہ کی عزت اور ذلت کا اسلامی معیار اکل حلال کا ملنا ہے۔ اس معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے بمشکل کوئی ایسا پیشہ ہو گا جس کو تھوڑا بہت عمائد واکابر اسلام نے اختیار نہ کیا ہو۔

جب تک ہم اپنے قدیم مسلک کی طرف پھر عود نہ کریں، ہماری مالی اور ہر قسم کی اصلاح و ترقی محال ہے۔

قانون نے رسد محنت پر ایک طرف نمایاں حد قایم کی ہے۔ یعنی فوج میں سوائے سکھ، پٹھان، راجپوت اور مرہٹہ جیسی جنگجو قوموں کے اور کوئی ہندوستانی فرقہ بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ بعض محکموں کی ملازمت کے واسطے عمر کی بھی شرط لازمی ہے۔ چونکہ جدید کارخانوں میں جہاں ہزارہا مزدور یک جا کام کرتے ہیں بحالت عدم نگرانی مزدوروں کی صحت و اخلاق خراب ہونے حتیٰ کہ جان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے لہٰذا ایک فکٹری ایکٹ پاس کر کے کارخانوں کی رسد محنت پر قانونی حدود عائد کر دی گئیں۔ ۹ سال سے کم عمر بچے داخل نہیں ہو سکتے۔ اور ۱۴ سال تک عمر والے ۶ گھنٹے روز سے زیادہ اور رات کے وقت کام نہیں کر سکتے عورتیں بھی صرف روئی اوٹنے کے کارخانوں میں رات کے وقت کام کر سکتی ہیں۔ کوئی مزدور ۱۲ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں فکٹری مزدوروں کی خاص نگرانی کی جاتی ہے۔ ورنہ آجروں کی چیرہ دستی اور مزدوروں کی ہوس کا یقینی نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

علاوہ مذکورۂ بالا مذہبی رسوم اور قانونی حدود کے خود انسانی طبیعت اور عادات بھی رسد محنت میں حائل ہوتی ہیں جرّاحی کا کام گھناؤنا مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے نفاست پسند طبیعت اس سے ہمیشہ دست کش رہی اور یہ فن اکثر حجاموں کے ہاتھ چھوڑ دیا گیا۔ واقعہ ہے کہ بعض لوگ تو عمل جرّاحی دیکھنے تک کی تاب نہیں لا سکتے۔ حتیٰ کہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ ڈاکٹری مدرسوں میں جو طالب علم داخل ہوتے ہیں اُن میں سے تخمیناً دس فی صدی چند ماہ میں اس وجہ سے علیحدہ ہو جاتے

حصہ سوم باب۱ ہیں کہ چیر پھاڑ کے کام سے ان کی طبیعت از حد متنفر ہوتی ہے۔ بعض لوگ اس قدر احتیاط پسند ہوتے ہیں کہ وہ کم تر اجرت پر قناعت کر کے جرأت طلب اور خطرناک کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بعض کام گندے بھی ہیں اور اس قدر آسان کہ ادنی ترین مزدور جن کی تعداد ہمیشہ کثیر ہوتی ہے ان کو کر سکتے ہیں۔ ایسی محنت کی رسد ہمیشہ وافر ہوتی ہے اور شرح اجرت بھی ادنے۔ چنانچہ حلال خور اور خاکروب اسی طبقہ میں شامل ہیں۔

ارزانی وگرانی محنت (۹) ارزانی محنت کا مسئلہ جس قدر عملی لحاظ سے اہم اور قابل تحقیق ہے، اتنا ہی اصولی حیثیت سے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ عام طور پر تو ارزانی سے مقدار اجرت کی کمی مراد لی جاتی ہے یعنی بہر روز والے مزدور کی محنت آٹھ آنہ اجرت والے سے ارزاں مانی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت محنت کی ارزانی کو فی نفسہ مقدار اجرت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ارزانی نسبت پیداوار محنت اور اجرت موافقت سے متعلق ہے۔ مثلاً اگر ایک مزدور چار آنہ روزانہ اجرت پر بارہ آنہ کا کام کرے اور دوسرا آٹھ آنہ پر ایک روپیہ چار آنہ کا تو پہلے کی پیداوار محنت اور اجرت کی نسبت بمقابلہ دوسرے کے زیادہ موافق ہے۔ لہذا پہلے کی محنت دوسرے سے لازماً ارزاں ہے۔ بظاہر تو یہ اصول بالکل درست نظر آتا ہے۔ لیکن بعض حالتوں میں یہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکا میں بمقابلہ اکثر ترقی یافتہ ممالک کے باوجودیکہ نہ صرف مقدار اجرت سب سے زیادہ بلکہ نسبت پیداوار واجرت بھی کم تر موافق ہے تاہم وہاں کی محنت سب سے ارزاں خیال کی جاتی ہے۔ اس معمہ کا حل ارزانی کے تغیر پزیر مفہوم میں مضمر ہے۔ یاد ہوگا کہ بلحاظ کاشت وسیع ودقیق زرخیزی زمین کے دو مفہوم بیان کئے گئے تھے۔ بحالت اول اس سے

حصہ سوم باب ۱

پیداوار اور مصارف کاشت کی موافقت مراد ہے اور بحالت دوم مقدار پیداوار کی بیشی۔ بعینہٖ ارزانی اجرت کا مفہوم بھی ذو معنی ہے۔ بلحاظ تعدد مفہوم زرخیزی زمین اور ارزانی محنت میں کامل مشابہت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ زرخیزی کی مذکورۂ بالا بحث کا ارزانی کی مندرجہ ذیل توضیح سے مقابلہ کرنا صرف مفید بلکہ باعث دلچسپی ہوگا۔

فرض کرو کہ چار مزدور ۴۔۶۔۸ اور ۱۰ آنہ اجرت لے کر ۱۲۔۱۵۔۲۰ اور ۲۴ آنہ قیمتی چیزیں روز تیار کریں۔ اب اگر آجر کو ایک مہینہ میں ۴۵ ہزار روپیہ کا سامان تیار کرانا مقصود ہو تو اس کام کے واسطے قسم اول کے مزدور ۲۰۰۰ دوم کے ۱۶۰۰ سوم ۱۲۰۰ اور چہارم کے ۱۰۰۰ درکار ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اور صنعتی مرکزوں میں لگان زمین بہت اعلیٰ ہے اور کارخانوں میں نہایت بیش بہا کلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ سو سو مزدوروں کی ٹولی کے واسطے ۵۰ روپیہ ماہوار تنخواہ کے نگراں ۱۰۰ روپیہ ماہوار کرایہ کا قطعہ اراضی اور پچاس ہزار کا اصل قائم بشکل مشین و عمارت درکار ہو۔ جس کی شرح سود ۵ فی صدی اور مطالبات فرسودگی (جن کی مفصل تشریح آیندہ کریں گے) ۴ فی صدی سالانہ ہو تو مختلف قسم کے مزدوروں سے کام لیتے میں مجموعی مصارف پیدائش علاوہ قیمت پیداوار خام حسب ذیل ہوں گے۔

	مزدور قسم اول (۲۰۰۰)	دوم (۱۶۰۰)	سوم (۱۲۰۰)	چہارم (۱۰۰۰)
اجرت	۱۵۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۷۵۰
تنخواہ نگراں و لگان زمین	۵۰۰۰	۴۰۰۰	۳۰۰۰	۲۵۰۰
سود اصل و مطالبات فرسودگی	۷۵۰۰	۶۰۰۰	۴۵۰۰	۳۷۵۰
	۲۷۵۰۰	۲۸۰۰۰	۲۵۵۰۰	۲۵۰۰۰

حصہ سوم
باب ۱

تخمینہ اول و چہارم پر غور کرنے سے واضح ہو گا کہ پس ماندہ ممالک میں جہاں بیش بہا اصل سے نہیں لیا جاتا اور لگان زمین بھی اعلیٰ نہ ہو بالفاظ دیگر مقدار سود، لگان نہیں ہے اور مصارف پیدائش کا جزو قلیل ہے ارزانی محنت پیداوار و اجرت کی نسبت کی موافقت پر منحصر ہے۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جہاں سود اور لگان مصارف پیدائش کے قابل لحاظ ابزا ہیں ارزانی محنت خاص طور سے پیداوار کی بیشی سے متعلق ہے۔ اگرچہ نسبت پیداوار و اجرت مقابلۃً کمتر موافق ہو۔ لیکن اگر کمی موافقت حد مناسب سے تجاوز کر جائے گی تو باوجود بیشی پیداوار ایسی محنت ارزاں نہ ہو سکے گی چنانچہ اگر قسم چہارم کے مزدور بجائے ۱۰ ر ۱۲ آنہ اجرت ے کر ۲۴ آنہ قیمتی چیز تیار کریں تو ان سے کام لینے میں مصارف پیدائش ۰ ۵ ۷ ۲ تک بڑھ کر اُن کی محنت قسم اوّل سے بھی گراں ہو جائے گی دوسرے اور تیسرے تخمینہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں اجرت مختص بالعمل کی یکساں شرح سے جو مزدور اجرت مختص بالزماں جس قدر زیادہ مقدار میں حاصل کر سکے گا۔ اس کی محنت بھی اسی قدر ارزاں پڑے گی۔ اول تینوں تخمینوں کے مطالعہ سے تیسرا قابل توجہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مقدار و پیداوار محنت میں زیادہ فرق ہو جیسا کہ اول و سوم میں تو باوجود کمتر موافقت نسبت پیداوار و اجرت ارزانی محنت بیشی پیداوار کی پیرو ہو گی۔ اور اگر مقدار پیداوار میں فرق کم ہو جیسا کہ اوّل و دوم میں تو باوجود بیشی پیداوار ارزانی محنت موافقت نسبت پیداوار و اجرت کے تابع ہو گی۔ گویا فرق مقدار پیداوار کی کمی بیشی کے مطابق ارزانی محنت علی الترتیب موافقت نسبت پیداوار و اجرت اور بیشی مقدار پر منحصر ہے۔ حاصل کلام مذکورۂ بالا تینوں کا یہ ہے کہ پس ماندہ ممالک میں شرح اُجرت مختص بالعمل جس قدر ادنےٰ ہو گی محنت ارزاں ہو گی۔ یکساں پس ماندہ اور ترقی یافتہ ممالک میں مزدور اجرت

مختص بالعمل کی مساوی شرح سے جس قدر زیادہ اجرت مختص بالزماں حاصل کر سکے گا اس کی محنت اُسی قدر ارزاں ہوگی۔ اور خاص ترقی یافتہ ممالک میں اس مزدور کی محنت ہی ارزاں ہے۔ جو سب سے زیادہ اجرت مختص بالزماں حاصل کرے اگرچہ حد مناسب تک شرح اجرت مختص بالعمل بمقابلہ دیگر ممالک ناموافق بھی ہو چنانچہ یہی آخری حالت امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ وہاں مزدور بمقابلہ دوسرے ملکوں کے زیادہ کماتا ہے اور اجرت مختص بالعمل کی شرح بھی مقابلۃً اعلیٰ ہے۔ لیکن پھر وہاں کی محنت سب سے ارزاں اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت وہاں پر مصارف پیدائش میں سود اور لگان کا جزو بہت غالب ہے اور اس غلبہ کا نتیجہ ہم مندرجۂ بالا تخمینہ میں بھی واضح کر چکے ہیں۔

امریکن علمائے معیشت کا مقولہ کہ سب سے اعلیٰ اجرت والی محنت سب سے ارزاں ہی۔ بظاہر ایک چیستان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مذکورۂ بالا بحث سے اس قول کی صداقت اور اہمیت ظاہر ہی۔ علاوہ ازیں معاشی ترقیات اور کلوں کی ایجادات کا مزدور کی مالی حالت پر کیونکر مفید اثر پڑ سکتا ہے۔ اور کس حالت میں اضافۂ اجرت آجر و مزدور کے حق میں برابر مفید ہونا ممکن ہے۔ ان اہم مسئلوں کی بھی یہاں تشفی بخش توضیح ہوگی

اضافۂ اجرت اور اس کے نتائج

(۱۰) جو معاملات شمار و اعداد میں ظہور پذیر ہو سکیں۔ مثلاً آبادی اموات و پیدائش امراض، تجارت درآمد و برآمدات کے اعداد سے صحیح نتائج اخذ کرنا معاشی اصول کی صحت جانچنا۔ ان کی ترمیم و تائید کرنا بے حد دشوار کام ہے جو معاشیات میں ایک جداگانہ فن اعداد شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس فن کی تفصیلی بحث برمحل نہ ہوگی اس کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہی۔ مگر اتنا جاننا کافی ہی کہ اس کام سے

حصّہ سوم
باب ۴

چند در چند شرائط متعلق ہیں جن میں سے اکثر کی پابندی اگر محال نہیں تو بے حد دشوار ضرور ہے
انہیں دقت طلب شرائط کی بدولت یہ مقولہ صحیح ہے کہ اعداد سے ہر قسم کے حتیٰ کہ متضاد
نتائج اخذ کئے جاتے ہیں جب تک شرائط لازمی کی تکمیل نہ ہو۔ اعداد کی حالت بالکل
موم کی سی ہے جس سانچے میں چاہو ڈھال دو۔ چنانچہ اعداد وہی ایک ہیں لیکن دو
گروہ اپنے اپنے طور پر ہندوستان میں افلاس و دولتمندی کا اضافہ ثابت کرتے ہیں۔
فرق اجرت ہی کو لیجئے۔ طبقہ طبقہ کے مزدوروں کی تعداد اور اُن کے کاروباری وقت
کا سالانہ تخمینہ کر کے اُن کی اجرت متعارف کا جداگانہ اوسط نکالنا۔ بعدہٗ زر نقد کی قوت
مبادلہ اور ہر طبقہ کی ضروریات کا علیحدہ اندازہ کر کے اجرت صحیحہ کا پتہ لگانا، یہ سب تحقیق
زمانۂ ماضی و حال کے اوقات مُعیّن کے متعلق کر کے دونوں نتائج کے مقابلہ سے اضافہ
وتخفیف اجرت کا دریافت کرنا، کیا کچھ آسان کام ہے؟ علاوہ احتیاط کس قدر وسعت
معلومات درکار ہے۔ اور حسب ضرورت صحیح و مکمل اعداد کا ملنا آج کل کے ترقی یافتہ
زمانہ میں بھی کس قدر دشوار ہے چونکہ پیش پا افتادہ اعداد سے بلا تامل نتائج نکال کر ان کی صحت
پر اعتماد کرنے سے عجیب و غریب بے بنیاد مغالطے پیدا ہونے ممکن ہیں۔ بطور تنبیہ عددی
نتائج کی احتیاط طلبی اور مغالطہ انگیزی کی طرف اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

کسی ملک کے مزدوروں کی مجموعی کمائی تعداد مزدوران سے تقسیم کر کے جو اوسط اُجرت
فی مزدور نکالا جاتا ہے۔ اس سے نہ تو مزدوروں کی مالی حالت پر کچھ روشنی پڑتی ہے نہ اضافہ
وتخفیف شرح اجرت کا ہی پتہ چلتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک ایک ہزار مزدوروں کے دو
گروہ ہیں اوّل گروہ میں ۵۰۰ کی اجرت ۱۲ روپیہ ماہانہ ۴۰۰ کی ۲۵ روپیہ اور ۱۰۰ کی
۴۰ روپیہ ماہانہ ہے۔ دوسرے گروہ میں ۵۰۰ کی آمدنی ۸ روپیہ ۴۰۰ کی ۱۵ اور ۱۰۰ کی
۱۰۰ روپیہ ماہوار رہے۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت مجموعی اوّل گروہ کی مالی حالت دوم سے بہت

حصہ سوم
باب ۱۰

بہتر ہے۔ تاہم دونوں گروہوں کا اوسط اجرت وہی ۲۰ روپیہ مزدور ہے۔ اور اگر گروہ دوم میں آخری ۱۰۰ کی اجرت ۱۱ روپیہ ہوجائے تو اوسط اور بھی زیادہ گویا ۲۱ روپیہ فی مزدور ہوجائے گی۔ حالانکہ مالی حالت اب بھی گروہ اوّل کی برتر رہے گی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ۱۲ روپیہ والے مزدوروں میں سے ۳۰۰-۲۵ والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰-۴۰ والوں میں آملیں۔ بالفاظ دیگر ۲۰۰ کی اجرت ۱۲ اور ۴۰۰ کی ۲۵ اور ۴۰۰ کی ۴۰ ہوجائے تو اوسط اجرت بڑھ کر بجائے ۲۰ کے ۲۸ ۱/۲ روپیہ ہوجائے گا حالانکہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ مزید برآں اگر شرح اجرت ۱۰ فیصدی گھٹادی جائے تو بھی اوسط ۲۵ ۱/۲ فی مزدور قایم رہے گا۔ گویا اجرت میں ۱۰ فیصدی تخفیف کے ساتھ ساتھ اوسط میں ۲۵ فیصدی اضافہ ہوگیا۔ اس کے برعکس اگر ۲۵ روپیہ والے مزدوروں میں سے ۳۰۰-۱۲ روپیہ والوں میں آملیں تو اوسط صرف ۱۶ روپیہ رہ جائے گا۔ حالانکہ شرح اجرت برقرار ہے بلکہ اگر اجرت میں ۱۰ فی صدی اضافہ کردیا جائے تو بھی اوسط تقریباً ۱۸ روپیہ پڑے گا گویا باوجود ۱۰ فی صدی اضافۂ اجرت اوسط میں ۱۰ فی صدی تخفیف نظر آئے گی۔ ان سادہ مثالوں سے واضح ہوا کہ جب تک پوری تفصیل پیش نظر نہ ہو محض اوسط سے مزدوروں کی مالی حالت اور تبدیلی شرح اجرت کا صحیح علم ہونا محال ہے۔

اوسط اور تبدیلی شرح اجرت کی بے تعلقی سے ایک قابل لحاظ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اضافہ شرح اجرت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک انفرادی، جیسا کہ مثال بالا میں ۱۲ روپیہ والے مزدوروں کا ۲۵ روپیہ والوں میں یا ۲۵ والوں کا ۴۰ والوں میں آملنا۔ جہاں تک ادنیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں ترقی کرنے والے مزدوروں کا تعلق ہے، اجرت کے اضافہ میں کوئی شک نہیں لیکن یہ اضافہ صرف اُن کی ذات تک محدود ہے۔ فی نفسہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ طبقہ ادنےٰ کے پس ماندہ اور طبقہ اعلیٰ کے سابق مزدوروں کو

اس سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اضافہ اجرت کی دوسری صورت طبقہ وار ہوتی ہے۔ گویا مزدوروں کے کل گروہ کی اجرت میں کچھ فی صدی اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور کل مزدور یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ مثال مذکورۂ بالا میں جب کہ ۱۲ روپیہ والوں میں سے ۲۰۰ مزدور ۲۵ روپیہ والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰۔ ۴۰ روپیہ والوں میں آئیں تو اضافہ اجرت انفرادی ہوگا۔ لیکن اگر ۱۲ روپیہ والے ۵۰۰ مزدوروں کی اجرت ۲۰ روپیہ اور ۲۵ والے ۴۰۰ کی اجرت ۳۰ روپیہ اور ۴۰ والے ۱۰۰ کی اجرت ۶۵ روپیہ ہوجائے تو اضافہ اجرت طبقہ وار کہلائے گا۔ اور دونوں صورتوں میں اوسط اجرت یکساں ۲۰ روپیہ سے بڑھ کر ۲۲$\frac{1}{2}$ روپیہ ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انفرادی اضافہ کے مقابلہ میں طبقہ وار اضافہ کا اثر مزدوروں اور نیز ملک کی مالی حالت پر کہیں زیادہ وسیع اور گہرا پڑے گا۔ چنانچہ اضافہ شرح اجرت سے بالعموم طبقہ وار اضافہ مقصود ہوتا ہے۔ اور اسی مفہوم میں ہم نے اوسط اور تبدیلی اجرت کی بے تعلقی اوپر واضح کی ہے۔

اضافہ اجرت کی بلحاظ وسعت دو صورتیں، اور اس کا عام مفہوم بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کا فیض یاب مزدوروں کی حالت پر اثر دکھانا چاہتے ہیں بعض ضرورتیں قیام زندگی کے واسطے ناگزیر ہیں۔ مثلاً کھانا، پینا، لباس، مکان بعض عمدہ کارکردگی کے واسطے لازمی ہیں۔ مثلاً مقویِ جسم غذا۔ آرام دہ لباس اور آسائش مکان صحت بخش آب وہوا آرام لینے کی مہلت خودداری کا احساس، ترقی کی امنگ اور یہ سامان مقدار اجرت کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ بدقسمتی سے مرفہ الحالی کی بدولت کہیں کہیں مزدوروں کی ضروریات اُن بے جا تعیشات کی حد میں داخل ہوگئی ہیں جو اخلاق صحت اور کارکردگی سب کے حق میں کم وبیش مضر ہیں یہ حالت بیشتر یورپ اور امریکا جیسے ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہے۔ لیکن وہاں بھی تمام مزدوروں کی ضروریات قسم دوم تک محدود ہیں۔ مقابلۃً

حصہ سوم
باب ۱۰

صرف چند کو رنگ رلیاں میسّر ہو سکتی ہیں۔ ایشیا کا غریب مزدور کم و بیش ضروریات قسم اوّل پر قانع پایا جاتا ہے۔ لیکن مزدور کے حق اجرت کی تفریط افراط سے بھی زیادہ مضر ہے اور ضروریات قسم دوم کی بہم رسانی نہ صرف مزدور بلکہ کل ملک کے حق میں بے حد مفید ہے۔ واضح ہو کہ ایسی ضروریات میں بہت کچھ اضافہ اور ترقی کی گنجائش ہے۔ مزدور کی ضروریات قسم دوم تک محدود کرنے سے یہ غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اضافہ اجرت پر کوئی حد بندی مقصود ہے۔ بلکہ یہ جتانا مدنظر ہے کہ مذہبی معاشرتی اور تعلیمی اثرات اور بحد مناسب قانونی پابندی سے مزدور کو بدمذاقی اور بری عادت سے روکا جائے تاکہ وہ ضروریات قسم سوم کی طرف کم مائل ہو اور اپنی زندگی ضروریات قسم اول و دوم پر قایم کرکے خود بھی جائز لطف اٹھائے اور ملک کی مرفہ الحالی میں بھی اضافہ کرے چونکہ ہر ملک میں جماعت کثیر مزدور پیشہ ہوتی ہے۔ لہذا مزدوروں کی تربیت و اصلاح گویا کل آبادی سے متعلق ہے۔

اگر مزدور صرف معدودے چند ضروریات قسم اول کا عادی اور انھیں پر قانع ہے تو اضافہ اجرت کا نتیجہ تخفیف محنت ہوگا۔ مثلاً اگر چار آنہ روز اجرت اُس کی کل ضروریات کے واسطے کافی ہیں اور ضروریات بڑھانے کا اس کو شوق نہ ہو تو اجرت ۸ آنہ روز ہو جانے کی حالت میں وہ غالباً ہفتہ میں دو تین روز کام کرنا چھوڑ دے گا۔ بلاضرورت وہ کام کیوں کرنے لگا۔ چنانچہ ہمارے ملک کے اکثر کاریگر درزی، سنار، بڑھئی جو تھوڑی سی محنت سے ضرورت کے لائق کما لیتے ہیں بدشوق اور کام چور ہونے میں مشہور عالم ہیں۔ وہ دُکان پر بہت کم نظر آتے ہیں اور اُن سے کام نبوانے کے لئے پہرہ بٹھانا لازمی ہے۔ گرم ممالک کے باشندے جن کی ضروریات مقابلۃً مختصر ہیں اور بآسانی مہیا ہو سکتی ہیں۔ کام سے کمتر مانوس پائے جاتے ہیں اور بیشی اجرت سے وہ اکثر کمی محنت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے

حصہ سوم
باب ۱

برعکس اگر مزدور کو ضروریات قسم دوم کا چسکا لگ جائے اور ایسی ضروریات کا میدان نہایت وسیع ہے تو اضافہ اجرت کے ساتھ ساتھ اس کو کام سے بھی زیادہ محبت ہوگی۔ اس کی کارکردگی ترقی کرے گی۔ گویا ہم سانی ضروریات کا تعلق، اضافہ اجرت، تکثیر محنت اور ترقی کارکردگی میں باہم سبب اور نتیجہ کا دوگونہ رشتہ قائم کرکے مزدور کا طرز بود و باش اعلیٰ اور اس کی زندگی پُر لطف بنا دے گا۔ چنانچہ یورپ اور امریکا کے صناع جس قدر اپنے کام میں ماہر ہوں گے اور ان کی اجرت اعلیٰ ہوگی اتنی ہی وہ اپنے کام میں توجہ اور محنت کریں گے۔ تاکہ زندگی کے نئے نئے لطف جو ان کے پیش نظر ہیں اُٹھا سکیں قسم دوم کی ضروریات شائق مزدور کو محنت کے میدان میں اسی طرح دوڑاتی ہیں جیسے پیاسے کو دور افتادہ سرچشمہ درمیانی فاصلہ طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اور منزلِ مقصود جس قدر قریب ہوتی جاتی ہے آتش شوق تیز تر گردد کے مطابق جدت پسندی بھی بڑھتی ہے حتیٰ کہ فائز المرام ہونے پر بجائے کسل و تکان کے بوجہ مسرت کامیابی طاقت اور چستی میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ ان ضروریات میں گویا دو چند خوبی ہے۔ ان سے نہ صرف محنت کا شوق بڑھتا ہے بلکہ کارکردگی بھی ترقی کرتی ہے اور چوں کہ ان کا سلسلہ نہایت طولانی ہے، مزدور کو اسی طرح شاہ راہ ترقی پر بہت دور پہنچا سکتی ہیں۔ چنانچہ مزدور کو ضروریات قسم اوّل پر اکتفا نہ کرنے دینے ضروریات قسم سوم سے بچانے اور قسم دوم کا از حد شوق پیدا کرنے کا امریکہ میں خاص اہتمام پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح اجرت اعلیٰ، مزدور خوش حال محنت ارزاں، اور ملک دولتمندی میں سب سے پیش پیش ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ پس ماندہ اور افلاس زدہ طبقوں میں بمقابلہ ترقی یافتہ اور خوش حال لوگوں کے اولاد کی ترقی ہے۔ دیگر اسباب کچھ بھی ہوں لیکن ایک معاشی وجہ یہ بھی

قرین قیاس ہے کہ ان کی ضروریات زندگی اتنی مختصر اور کم خرچ ہوتی ہیں کہ باوجود بے مائگی کثرت اولاد کچھ بار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں ضروریات اس قدر کثیر اور بیش خرچ ہو گئی ہیں کہ ہر عاقبت اندیش آدمی تعداد اولاد کا مسئلہ اپنے حق میں قابل توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر وجوہات کے مصارف خاندان کے متحمل نہ ہو سکنے کا خوف بھی ترقی یافتہ ممالک میں بہت سے لوگوں کو شادی سے روکتا ہے۔ خود ہندوستان پر نظر کیجئے کہ جوں جوں مصارف زندگی بڑھ رہے ہیں بیاہ شادیوں میں بھی تاخیر زیادہ ہو رہی ہے۔ اول بسر اوقات کی صورت پیدا کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے بقول حضرت اکبر ؎

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس
موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

اور گو اخلاقی لحاظ سے یہ فعل قابل نفریں سہی لیکن واقعہ ہے کہ مصنوعی طریق سے پیدائش کی حد بندی کر کے اچھے بھلے لوگ ایک دو بچوں سے زیادہ اولاد پسند نہیں کرتے اور اس لئے کہ بطریق احسن پرورش پا سکیں تعین تعداد خود اولاد کے حق میں بھی مفید خیال کرتے ہیں۔ پیدائش اولاد کے اس نمایاں فرق کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ طبقوں کی اجرت بڑھنے سے اُن کی کارکردگی تو بڑھتی نہیں لیکن اولاد میں جلد اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ رسد محنت کی زیادتی سے اجرت کے پھر قدیم سطح پر گر پڑنے کا اندیشہ دامنگیر رہتا ہے اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں بیشی اجرت سے کارکردگی میں معقول ترقی ہوتی ہے اور مقابلۃً اولاد میں اضافہ بہت کم جس سے اجرت کا اضافہ مستقل اور دیرپا ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔

ترقی کارکردگی اور اضافہ تعداد مزدوران کا جو اجرت پر اثر پڑتا ہے اس کی مزید توضیح خالی از منفعت نہ ہو گی ارزانی محنت کی بحث میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ ادنیٰ کارکردگی والے مزدوروں کی بڑی جماعت سے کام لینے کے مقابلہ میں اعلیٰ کارکردگی والے مزدوروں کے

مختصر گروہ سے کام لینا آجر کے حق میں زیادہ مفید ہے۔ اگرچہ بحالت دوم اجرت مختص بالعمل کی شرح اعلیٰ تر بھی ہو۔ گویا اعلیٰ کارکردگی والے مزدور کو ادنےٰ کے مقابلے میں اجرت مختص بالعمل نسبتاً زیادہ ملنی بھی ممکن ہے د ۳/۱، علاوہ ازیں فرض کرو کہ دس مزدوروں کی جماعت میں گیارہویں کا اضافہ ہو۔ ظاہر ہے کہ محنت مختتم مقدار پیداوار گھٹ کر شرح اجرت میں تخفیف ضرور کر دے گی۔ چنانچہ قوانین اجرت کی بحث میں پیداآوری مختتم کے عنوان سے یہ مسئلہ بخوبی واضح کیا جا چکا ہے د ۶/۵، فرض کرو کہ اجرت میں بقدر ۱/۳ کمی ہو۔ اب اگر ان ہی دس مزدوروں کی کارکردگی بڑھ کر ان کو گیارہ مزدوروں کے کام کرنے کے قابل بنا دے تو باوجود مذکورۂ بالا کمی شرح ان کی اجرت میں تخمیناً ۱/۱۵ اضافہ ہوگا۔ کیونکہ اب ان میں سے ہر ایک بمقابلہ سابق اجرت کے ۱۱/۱۰ × ۲۹/۳ یعنی ۱۹/۳ حاصل کر سکے گا پس ثابت ہوا کہ ترقی کارکردگی آجر اور مزدور بالفاظ دیگر کل ملک کے حق میں بے حد مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرح اجرت کے متعلق جو آجر اور مزدوروں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہے تو غیر جانب دار عوام اور نیز گورنمنٹ اکثر مزدوروں کی ہمدرد اور طرف دار پائی جاتی ہے۔

باب گیارہ

ترقیات مزدوران

تجزیہ (۱) انجمن اتحاد مزدوران (۲) بیمہ فنڈ (۳) حفظان صحت
(۴) تخفیف اوقات (۵) اضافۂ اجرت (۶) اسٹرائیک یا ہڑتال (۷) شرکت منافع

انجمن اتحاد مزدوران

یورپ اور امریکہ میں اکثر پیشوں کے مزدوروں نے باقاعدہ اپنی اپنی اتحادی انجمنیں قایم کر رکھی ہیں جن میں ہم پیشہ مزدور جوق جوق مقررہ ماہانہ چندہ دے کر شریک ہوتے ہیں۔ اور اتفاق عمل کے زور سے کل ممبروں کی بہبودی اور ترقی کی ہر مناسب طریق سے کوشش کرتے ہیں۔ ان انجمنوں کی ہر دل عزیزی اہمیت اور تقویت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ہر سمجھ دار مزدور اُن کی ممبری اپنے حق میں ضروری اور مفید خیال کرنے لگا ہے جرمنی اور انگلستان میں اتحادی مزدوروں کی تعداد ۲۵ اور ۲۴ لاکھ ہے۔ لیکن بلحاظ نسبت آبادی ایسے مزدور ڈنمارک اور سویڈن میں سب سے زیادہ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی انجمنیں بلحاظ کارگزاری وحسنِ انتظام ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقوں کی انجمنوں سے بدرجہا افضل نظر آتی ہیں۔ ان کی بار آور کوششوں سے ترقی یافتہ قوموں کے افراد کی ارادی قوت اور عملی قابلیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے مہتمم اور نگراں نہایت قابل اور کارگزار لوگ ہوتے ہیں جن میں سے بعض کو ممبری پارلیمنٹ تک کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اتفاق کی طاقت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ اور جب ایسی طاقت نہایت باخبر معاملہ فہم اور خیر اندیش سرگروہوں کے ہاتھ میں آجائے تو اس سے کیا کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مزدور

حصہ سوم باب ۱۱

کسی شمار قطار میں نہ تھے۔ اور ہوتے کیسے؟ غریب، بے علم، بے شمار اور منتشر، دولتمند اور قابو یافتہ آجروں کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں کم وبیش کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ اوّل تو خود ان کا افلاس، کثرت اور انتشار اُن کی سب سے بڑی کمزوری کا باعث تھے۔ علاوہ ازیں ملکی قانون سازی میں ان کا برائے نام بھی دخل نہ تھا۔ خود غرض اور کوتہ اندیش آجر حسب دل خواہ اپنے موافق قانون پاس کر کے اپنے اقتدار سے بے بس مزدوروں کے خلاف ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے تھے حتیٰ کہ انگلستان میں ۱۸۲۴ء تک اسٹرائک میں مزدوروں کی کسی جماعت کا اپنے مطالبات پورا کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام چھوڑ دینا قانوناً بڑا جرم تھا اور ۱۸۷۱ء تک مزدوروں کو اتحادی انجمنیں باضابطہ قایم کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن مزدوروں کے دن پھرنے کا زمانہ آن پہنچا تھا۔ اور ان کی ترقی اقتضائے وقت تھا۔ معاشی ترقی اور سیاسی آزادی نے مزدوروں کی اہمیت اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ توسیع تعلیم اور اضافہ اجرت سے خود مزدوروں میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا ہو چلا۔ کچھ روز تو آجروں نے انقلاب کی روک تھام کی لیکن کب تک بالآخر مزدوروں نے کروٹ بدلی اور بتدریج قابو یافتہ آجروں کے تسلط سے آزاد ہونے لگے حتیٰ کہ آج ان اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدور آجروں کے بالمقابل مثل ہم پلّہ اپنے فرائض وحقوق بآزادی طے کرتے نظر آتے ہیں۔ جب تک بہت سے غریب مزدور چند دولتمند آجروں سے جدا جدا اپنا معاملہ طے کرتے رہے وہ اپنے حقوق کی نگہداشت سے تقریباً بالکل معذور رہے۔ اور اکثر آجر کی پیش کردہ اجرت قبول کئے بغیر ان کو کوئی چارہ نہ تھا۔ اس بےبسی کا خاص باعث مندرجہ ذیل حالات تھے۔

(ا) آجر تو معدودے چند تھے اور مزدوروں کی از حد کثرت تھی۔ آجر کم و بیش متحد رہ سکتے تھے لیکن مزدوروں میں برائے نام اتفاق بھی وہم و گمان سے باہر تھا نتیجہ یہ کہ آجر کو مزدور ملنے میں کوئی وقت پیش نہیں آتی تھی بلکہ مزدور کو آجر ملنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں مزدور کو آجر سے اُجرت کے متعلق ردّ و قدح کرنے کی کیا جرأت ہو سکتی تھی۔

(ب) دولتمند آجر تو مزدور نہ ملنے کا انتظار برداشت کر سکتا تھا لیکن غریب مزدور میں بیکار رہنے کی سکت کہاں۔ اگر دو روز کام نہ لگے تو فاقہ کی نوبت آجائے لہذا آجر من مانی اُجرت دیتے اور مزدور بخوف بیکاری اس کو غنیمت سمجھتے تھے۔

(ج) جاہل مزدور کاروباری حالت سے بالکل ناواقف اور بے خبر تھے۔ آجر اضافہ منافع کی تو ان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہونے دیتے تھے لیکن تخفیف کا بار اُن کی اُجرت پر ڈالنے کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے قیام سے مذکور الصدر حالات میں کایا پلٹ ہو گئی۔

(ا) مزدوروں میں باہمی اتفاق و اتحاد پیدا ہو گیا جس کی بدولت حسب دلخواہ شرائط پر مزدور ملنے کا موقع آجر کے ہاتھ سے نکل گیا۔

(ب) مشترکہ اندوختہ سے فنڈ قائم کیا گیا تاکہ بحالت بیکاری مزدوروں کی مالی امداد کی جائے گویا اب مزدور آجر پر دباؤ ڈالنے کے لئے بلاخوفِ فاقہ محنت ترک کر سکتے ہیں۔

(ج) انجمنوں کے تعلیم یافتہ اور باخبر منتظمین رکھکر کاروباری حالات پیش نظر رکھتے ہوئے مزدوروں کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں۔

جن جن طریق سے اتحادی انجمنیں مزدور کی بہبودی کے واسطے کوشش کر رہی ہیں

حصہ سوم
باب ۱
بیمہ فنڈ

اُن کی ہم ذیل میں تفصیل کرتے ہیں۔

(۲) اول تو اکثر مزدوروں کی وہی مثل ہوتی ہے کہ روز کنواں کھودنا روز پانی پینا۔ اگر کہیں کام مل گیا تو روزی ورنہ روزہ۔ ان غریبوں کے پاس اندوختہ کہاں جو آڑے وقت کام آئے اور جو اجرت کچھ زیادہ بھی ہوئی تو یہ پس انداز کرنا کم جانتے ہیں۔ "ہرچہ داری بخور امروز غم فردا مخور" ان کا اصول زندگی نظر آتا ہے چنانچہ امریکا میں بھی جہاں مقدار اجرت سب ملکوں سے زیادہ ہے مزدور اکثر خالی جیب رہتا ہے۔ دن بھر میں جو کچھ کماتا ہے شام تک اڑا دیتا ہے ایک لحاظ سے تو یہ بیش خرچی مفید ہے کہ مزدور چیونٹی کی مانند کام سے لگا رہتا ہے لیکن بحالت اندوختہ بیکاری کا شوق پیدا ہونا ممکن ہے۔ بحالت حوادث زندگی اور ناموافقت زمانہ ایسے مزدوروں کی حالت نہایت ابتر اور قابل رحم ہو جانی یقینی ہے۔ لہذا انجمنوں نے یہ طریق نکالا کہ ہر ممبر مزدور سے ماہانہ چندہ لے کر ایک مشترکہ فنڈ جاری کر دیا جس سے ہر ممبر کو جائز مشکلات میں بشرح معین مالی امداد دیجاتی ہے۔ گویا مزدور کو اندوختہ کے کل فوائد بھی بدرجہ اولی حاصل ہو گئے اور شوق بیکاری کا اندیشہ بھی رفع ہو گیا۔ انجمن گویا مزدوروں کے اندوختہ کی امین ہے اور فنڈ ان کا مشترکہ سرمایہ جس کو جس قدر ضرورت پیش آئے بہ پابندی قواعد فنڈ سے لے سکتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں انگلستان کی سو سر آوردہ اتحادی انجمنوں نے جن کی سالانہ آمدنی ۳۱۲۵۰۰۰۰ روپیہ تھی اپنے ممبروں کی حسب ذیل مالی امداد کی۔

(ا) خرچ کفن دفن	۱۵۶۲۵۰۰
(ب) وظیفہ پیری	۳۱۲۵۰۰۰
(ج) وظیفہ علالت	۳۱۲۵۰۰۰
(د) تلافی حوادث مثلاً آتش زدگی غرقابی	۲۱۸۷۵۰۰

حصہ سوم

(د) وظیفہ بیکاریٔ غیر اختیاری ۵

باب ۱۱ میزان ۱۵۰۰۰۰۰

خفظان صحت

(۳) تجارتی اور صنعتی مرکزوں کی آب وہوا اوّل تو یونہی بوجہ گنجانی آبادی و بلندی عمارات خراب ہوتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ کارخانوں میں مزدوروں کا بیحد اژدحام ہوتا ہے۔ انجنوں سے بھاپ اور دھواں نکلتا ہے بعض پیداوار خام مثلاً روئی، سن کے بیشمار باریک باریک ریشے ہوا میں بکثرت مل جاتے ہیں۔ چمڑے اور کاغذ کے کارخانوں میں بعض کام خاص طور پر غلیظ ہوتے ہیں۔ لوہے اور شیشہ کے کارخانوں میں جلنے کا خوف بہت دامنگیر رہتا ہے۔ حد بندی نہ ہونے کی حالت میں کلوں میں پھنس کر جان ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کارخانہ کے اندر یا اس کے محاذات میں کوڑے کچرے سے آب وہوا خراب ہونے کا خطرہ ہوسکتا ہے۔ کان کنی میں تحفظ جان اور صحت کے واسطے اور بھی زیادہ اہتمام اور خاص احتیاط درکار ہے ایسی حالت میں مزدوروں کی صحت پر جتنی توجہ صرف کی جائے کم ہے۔ چنانچہ اوّل تو خود گورنمنٹ نے فیکٹری ایکٹ کے ذریعہ سے کارخانوں پر بہت کچھ اپنی نگرانی قایم کردی ہے۔ دوسرے اتحادی انجمنیں بھی برابر دیکھ بھال رکھتی ہیں اور جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت نظر آتی ہے خواہ گورنمنٹ کو توجہ دلاکر یا اپنے اصرار و اسٹرائک سے آجر کو اسے پورا کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں۔

تخفیف اوقات

(۴) کار برائے زیستن است۔ نہ کہ زیستن برائے کار۔ محنت میں افراط وتفریط دونوں یکساں مضر اور قابل احتراز ہیں۔ آدمی کو محنت ایسے اعتدال پر قائم رکھنی چاہیے کہ اس کو کل جائز ضروریات حاصل ہوسکیں، نہ تنگدستی کا اسیر بنے اور نہ دولت کمانے کی کل۔ ان دونوں حالتوں میں زندگی کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ پیشہ کے علاوہ راحت، آسائش، سیر و تفریح، کُنبہ کی مسرت بخش صحبت اور دوست واحباب کی پُر لطف ملاقات، مُلکی

اور قومی معاملات ضروری کی شرکت جیسے اور کام بھی حسب حال مزدور کی توجہ کے طالب ہیں۔ علاوہ ازیں خود قدرت نے مقدار محنت پر حد لگا دی ہے۔ کچھ دیر کام کرنے کے بعد آدمی تھکنے لگتا ہے حتی کہ تکان اس کو بالکل معذور کر کے آرام لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر مزدور کچھ عرصہ تک ہدایتِ قدرت کی خلاف ورزی کرے تو صحت کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اس کی کارکردگی میں بھی تخفیف ہو جانی یقینی ہے۔ گنوار و مثل ہے "رات بھر پیسا اور چپنی میں اٹھایا"۔ جو لوگ جس قدر حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں اُسیقدر اُن کی محنت کے نتائج بمقدار کمتر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ بعض طالب علموں کے فیل ہو جانے کی وجہ زیادہ مطالعہ ہوتا ہے جو دماغ کو کُند بلکہ معطّل کر دیتا ہے۔ اور جب از حد محنت صحت و کارکردگی کے حقوق میں مضر ثابت ہوئی تو اس سے اُجرت میں تخفیف ہونی بھی ظاہر ہے گویا کثرت سے خود محنت کی غرض و غایت فوت ہو جاتی ہے۔

لہذا اوّل تو فرصت فی نفسہٖ بہت ضروری اور مفید ہے۔ اگر تخفیف اوقات سے اُجرت میں ناقابل برداشت کمی نہ ہو تو اس کو ضرور حاصل کرنا چاہئیے۔ علاوہ ازیں اس کا کارکردگی پر جو مفید اثر پڑے گا وہ ایک حد تک ضرور اُجرت کو گھٹنے سے روکے گا۔ اور تخفیف اوقات سے اُجرت میں اتنی کمی نہ ہوگی جتنا کہ اندیشہ ہے۔ اور اگر سطح کارکردگی بہت اعلیٰ ہو اور نہایت مکمّل کلوں کا استعمال وسیع پیمانہ پر جاری ہو تو باوجود تخفیف اوقات دوسرے مزدوروں سے زیادہ اُجرت حاصل کرنی ممکن ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکا اور انگلستان میں اوقات کار سب سے کم ہیں لیکن بوجوہات بالا یہاں کے مزدور کو تقریباً سب سے زیادہ اُجرت ملتی ہے اور مُلک کی پیداوار بھی دوسرے ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے۔

بحث بالا سے واضح ہوا کہ تخفیف اوقات کی گنجایش اور اس کا اُجرت پر اثر چند دیگر حالات پر منحصر ہے جن کو مختصراً معاشی ترّقی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تلوں ہی میں سے تیل

نکلتا ہی۔ آجر اپنی گرہ سے تو مزدور کو اُجرت دینے سے رہا۔ نقصان اُٹھا کر وہ چند ماہ بھی کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہذا تخفیف اوقات کے ساتھ سابق اُجرت کا بھی مطالبہ کرنا ہر حال میں بجا نہ ہوگا۔ اگر ترقی کارکردگی کی بدولت محنت کی سابق پیداوار بحال رہی تو آجر کو سابق اُجرت دینے میں غالباً کوئی عذر نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہئیے اور اگر پیداوار میں کمی آگئی تو آجر اُجرت میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ اگر آجر کی مقدار منافع غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو آخری صورت میں بھی سابق اُجرت ملنی ممکن ہے۔ گویا آجر اپنے منافع کا ایک حصہ مزدوروں کو بانٹ دینا بمقابلہ اُن کو جُدا کرنے کے گوارا کرے گا اور گو مقدار اُجرت وہی برقرار ہے لیکن تخفیف اوقات کی بدولت شرح اُجرت میں اضافہ ہو جائیگا تخفیف اوقات کا ایک منشا بیکار مزدوروں کو کام سے لگانا بھی قرار دیا جاتا ہے گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہی کہ پیداوار محنت میں کمی آجائے گی۔ پس اگر سوائے چند قابل استثنا حالتوں کے مقدار اُجرت بھی کچھ کم ہو جائے تو کیا عجب ہی لیکن باوجود تقلیل مقدار شرح اُجرت وہی برقرار رہے گی۔ حاصل کلام یہ کہ چند در چند معقول وجوہات سے اکثر تخفیف اوقات ضروری اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ شرح اُجرت میں تخفیف ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں۔ البتہ اگر مقدار اُجرت حسب سابق برقرار رہی تو کیا کہنا ورنہ قابل برداشت کمی کا بھی مضائقہ نہیں۔

اوقات کار کا تعین آجر اور مزدور کی باہمی رضامندی پر نہیں چھوڑا جاسکتا آجر کا تو اسی میں فائدہ ہی کہ مزدور جہاں تک ممکن ہو زیادہ دیر تک کام کرے کیونکہ جسقدر زیادہ مال تیار ہوگا عمارت اور کل جیسے اصل مستقر پر زیادہ سُود حاصل ہوگا۔ رہا مزدور سو اوّل تو وہ اتنا مآل اندیش نہیں کہ اُجرت کے لالچ پر غالب آسکے۔ دوسرے اس کا بس کیا چل سکتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے کی شرط یہ ہی کہ مزدور ٹھیک وقت پر

حصہ سوم
باب ۱۱

سیٹی سنتے ہی آئے اور سیٹی سنکر جائے۔ ہر ایک کا کام باقی ہشیار مزدوروں کے کام سے اسقدر وابستہ ہی کہ وہ تنہا حسب مرضی کام شروع اور ترک نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اوقات کا از حد طویل ہونا کیا تعجب ہی۔ چنانچہ اس معاملہ کی اہمیت دیکھکر اول تو خود گورنمنٹ نے بذریعہ قانون اوقات کی انتہا معین کر دی۔ علاوہ ازیں اتحادی انجمنیں بھی حسب ضرورت تخفیف کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں اوقات کار ۱۲ گھنٹے انگلستان میں ۹ گھنٹے اور امریکا میں صرف ۸ گھنٹے ہیں۔ آٹھ گھنٹے محنت ۸ گھنٹے خواب اور ۸ گھنٹے فرصت بہترین تقسیم اوقات قرار دیجاتی ہی۔ واضح ہو کہ بیش بہا اصل مستقر کی بیکاری سے آجروں کو نقصان پہنچنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں اب وہ بجائے مزدوروں کے ایک گروہ کے دوسرے یکے بعد دیگرے کام لے کر بمقابلہ سابق اور بھی زیادہ دیر تک روزانہ کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں اور اضافۂ پیداوار کے ذریعہ سے اصل مستقر بشرح اعلیٰ سود حاصل کر سکتے ہیں۔

اضافہ اُجرت

(۵) کامیاب اور سرسبز کارخانوں کے مزدور یہ دیکھکر کہ آجر بہت زیادہ منافع پا رہا ہی اور ان کی اُجرت نسبتاً کم ہی۔ اسٹرائک کی دھمکی اور دباؤ سے اضافہ اُجرت کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اب اگر آجر کے کارخانہ میں کوئی اشد ضروری کام ہو رہا ہو جس کو وہ ترک یا ملتوی نہ کر سکے اور بوجہ غلبۂ انجمن اتحاد یا تخصیص طلبی محنت جدید مزدور میسر نہ آ سکیں تو وہ بے بس اور لاچار ہو کر اضافہ اُجرت بشرطیکہ اس کے حق میں سراسر تباہ کُن اور نا قابل برداشت نہ ہو گوارا کرے گا لیکن مزدوروں کی فوری کامیابی کچھ بڑی بات نہیں تحقیق طلب بات تو یہ ہی کہ ایسے اضافہ کے بعید اور دیرپا نتائج کیا ہوں گے وہ حسب حال تین ہو سکتے ہیں۔ اوّل اگر آجر درحقیقت معمول سے زیادہ منافع پا رہا تھا۔ اگرچہ آج کل آزادانہ مقابلہ کے زمانہ میں ایسا ہونا نہایت نادر ہی خود حالات میں ممکن ہے جن کی

اجارہ کے عنوان سے ہم آئندہ تشریح کریں گے۔ تو وہ کاروبار بند کرنے پر منافع کا ایک حصّہ بشکل اضافہ اُجرت مزدوروں کو بانٹ دینا گوارا کرے گا۔ اضافہ اُجرت کی یہ سب سے زیادہ قابل اطمینان صورت ہی لیکن اتنی ہی نایاب بھی ہی۔ آج کل تمام آجر ہر طرف نظر دوڑاتے رہتے ہیں۔ اور اگر کسی کو معمول سے زیادہ منافع ملتے دیکھتے ہیں تو خود بھی اس میں حصّہ بٹانے کی فکر کرتے ہیں۔ اور بالآخر مقابلہ کے اثر سے آخرالذکر آجر کا منافع بھی معمولی سطح پر اُتر آتا ہی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہی کہ اگر آجر معمولی منافع پا رہا ہی تو اضافہ اُجرت کا کیا حشر ہوگا۔ اوّل آجر اپنی چیزوں کی قیمت بڑھانے کی کوشش کرے گا تاکہ اضافہ قیمت سے اضافہ اُجرت کی تلافی ہو سکے لیکن ایسا ہونا بھی خاص حالتوں میں ممکن ہی جن کی بعنوان طلب بالواسطہ ہم آیندہ تفصیل کریں گے۔ فرض کرو کہ قیمت بڑھ جائے تو گویا اضافہ اُجرت چیزوں کے خریداروں کی جیب سے ادا ہوگا لیکن اگر نہ آجر کا منافع غیر معمولی طور پر اعلیٰ ہو نہ اضافۂ قیمت ممکن تو آجر موجودہ کام جس طرح بھی ہو ختم کرا کر اور غالباً آیندہ جلد سے جلد کارخانہ بند کرکے کوئی اور کاروبار جاری کردے گا چونکہ بیش مقدار اصل مستقر کلوں اور عمارت میں پھنسا ہوا ہی ممکن ہی کہ موجودہ کاروبار بند کرنے میں اسکو کچھ وقت لگے لیکن اگر حالات ایسے ہی نامساعد رہی تو جلد سے جلد بند ضرور کردے گا اور اگر موجودہ کلوں میں تھوڑی تبدیلی کرنے سے دوسرا کام لیا جانا ممکن ہوا جیساکہ اکثر ہوتا ہے تو موجودہ کام ترک کرنے میں اس کو اور بھی کم دیر لگے گی۔۔۔۔

علاوہ ازیں اور لوگ جو یہی کام جاری کرنے کا قصد کر رہے تھے حالات دیکھکر اپنی رائے بدل دیں گے۔ اور کوئی دوسرا کام شروع کریں گے۔ اس طرح پر تبدیج کاروبار زیر بحث گھٹتا چلا جائے گا اور اس بنا۔ روزہ اضافہ اُجرت کا نتیجہ مزدوروں کی تباہی ہوگا۔ اگر کاروبار کی تباہی سے قبل مزدور رنگ بدلتا دیکھکر اضافہ کا مطالبہ

ترک بھی کر دیں تو بھی آجروں کے دل میں جو اندیشہ اور وحشت پیدا ہو چکی ہوگی وہ بدقت اور بدیر رفع ہوگی اور مزدوروں کو کاروبار کے زوال سے کم وبیش نقصان ضرور اُٹھانا پڑے گا۔

بحث بالا سے یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی طرف سے اضافہ اُجرت کا مطالبہ اکثر بیجا اور ناکامیاب ہوتا ہے اور اس سے خود ان کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ بحث بالا میں صرف کسی ایک خاص شعبہ صنعت وحرفت میں اضافہ اُجرت فرض کیا گیا ہے اور ایسی حالت میں اضافہ اُجرت کے بیشک وہی نتائج ہوں گے جو بیان کئے گئے۔ لیکن جیساکہ رواج بڑھ رہا ہے اگر ہر پیشہ وحرفہ والے اضافہ کا مطالبہ شروع کر دیں تو قوانین اُجرت کے تحت میں مذکور الصدر پیداوار مختتم کی بحث اور آئندہ منافع خالص کی تشریح سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ ابھی تک منافع خالص ہی میں سے کم وبیش اُجرت کا اضافہ ممکن بھی ہے اور قرین انصاف ومصلحت بھی نیز واضح ہو کہ معمول شرح اور مقدار شرح دو جداگانہ چیزیں ہیں معمول سے مُراد شرح کی مساوات ہے۔ اور مقدار سے مراد شرح کی زیادتی وکمی۔ پس جبکہ ہر صنعت وحرفت میں اضافہ اُجرت کا یکساں مطالبہ ہوگا تو بحالت مقابلہ شرح منافع اب بھی معمولی رہیگی۔ صرف مقدار میں ہموار تخفیف ہو جاوے گی اور منافع میں ایک حد تک ابھی ایسی تخفیف کی گنجایش ضرور موجود ہے۔ بالفاظ مختصر اگر مزدور آجر کے منافع میں سے کچھ حصّہ مانگیں تو بحالت موجودہ بیجا نہیں اور اگر مطالبہ میں سب متفق ہو سکیں تو کامیابی زیادہ دُشوار نہیں۔ چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جب سے بشکل اسٹرائک مطالبہ اضافہ کا رواج پھیلا۔ شرح اُجرت بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اسٹرائک کا مسئلہ فی نفسہٖ اس قدر توجہ طلب ہے کہ ہم اس سے ذیل میں جُداگانہ بحث کرتے ہیں۔

(۶) جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہی۔ ہرتال سے مُراد مزدوروں کی کسی جماعت کا آجر پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات پورے کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام ترک کرنا ہی۔ جب سے اتحادی انجمنوں نے مزدوروں میں اتفاق وسیع اور مستحکم کر دیا ہے ہرتال کا اثر بھی بڑھ گیا ہی۔ جب کسی کارخانہ کے مزدور کام چھوڑ بیٹھیں تو ان کے جانشین ملنے بہت دشوار ہوتے ہیں حتیٰ کہ جو مزدور اتحادی انجمن کے ممبر بھی نہ ہوں وہ بھی اپنے ہم پیشوں کے اخلاقی دباؤ اور ناراضی کے خوف سے ایسے کارخانہ میں کام کرنے کی جرأت کم کرتے ہیں۔ اور اگر ایسے موقع پر فائدہ اُٹھاتے ہیں تو بعد کو جلد ہی باقی ہم پیشہ اُن کی حالت طرح طرح سے ناقابل برداشت حدتک ناخوشگوار بنا کر آئندہ کے واسطے عبرت دلا دیتے ہیں۔ مزدور موقع دیکھکر اکثر ایسے وقت پر ہرتال کرتے ہیں کہ آجر کا بہت زیادہ نقصان ہو۔ تاکہ دباؤ خوب پڑے اور آجر کو مزدوروں کے مطالبات پورے کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ ہو لیکن واضح ہو کہ کاروباری دُنیا میں اسٹرائک کی حالت بعینہٖ اس پتھر کی سی ہی جو تالاب میں کہیں گر کر پانی کی کل سطح پر قطار در قطار لہریں پھیلا دے۔ یوں تو تمام پیشے کم وبیش ایک دوسرے سے متعلق ہیں لیکن بعض کا بالخصوص دوسروں سے نہایت قریبی تعلق پایا جاتا ہے مثلاً کوئلہ، یا مٹی کا تیل نکالنے والے۔ یا ریلوے اور جہازوں پر کام کرنے والے اگر ہرتال کر دیں تو ناممکن ہے کہ کوئی کاروبار اور کوئی پیشہ کم وبیش اس سے متاثر نہ ہو۔ ایسے اسٹرائک سے علاوہ آجر کے عوام کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے نُقصان اور تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن بعض نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہی کہ خود مزدوروں کو ہرتال سے جسقدر مالی نُقصان پہنچتا ہی بحالت اضافہ اُجرت بھی اس کی تلافی ہونی دشوار ہے۔ اور مزید نفع کا تو ذکر ہی کیا ہی۔ اس واقعہ کی یوں تشریح کی جاتی ہے گو ایسا کمتر

حصہ سوم
باب ۱۱

ممکن ہے لیکن فرض کرو کہ مزدور برابر کام سے لگا رہتا ہے اور اس کے کام کا اوسط ۵۰ ہفتہ فی سال ہے گویا ایک ہفتہ سال کے $\frac{1}{50}$ یا ۲ ہفتہ کے برابر ہے اور علیٰ ہذا ایک ہفتہ کی اُجرت بھی کل سالانہ مقدار اُجرت کی ۲ فی صدی ہے۔ اب اگر چار (۴) فی صدی اضافہ اُجرت کی ہڑتال دو ہفتہ جاری رہے تو صاف ظاہر ہے کہ دوران ہڑتال میں مزدوروں کا بقدر ۴ فی صدی سالانہ اُجرت نقصان ہو چکے گا۔ اور ۴ فیصدی زیادہ جدید شرح اُجرت سے بھی کہیں سال بھر میں اس نقصان کی تلافی ہو سکے گی۔ اسی طرح پر اگر ۸ فی صدی اضافہ اُجرت کی ہڑتال ایک ماہ جاری رہے تو ایک سال تک مزدوروں کو اضافہ سے کوئی نفع حاصل نہ ہو سکے گا اور اغلب یہ ہے کہ مزدوروں کی کثرت اور مقابلہ کی بدولت شرح اُجرت جلد گر کر سابق سطح پر آ رہے گی۔ اور اضافہ بطور دفع الوقتی چند روزہ ثابت ہوگا۔ گو ہڑتال حسب دلخواہ کامیاب بھی ہو جائے تب بھی مزدوروں کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ قوی ہے اور اگر ہڑتال کی کثیر الوقوع ناکامیابیاں اور کاروبار کے دوسرے شعبوں کا نقصان بھی پیش نظر رکھا جائے تو بحیثیت مجموعی مزدوروں اور عوام کو اسٹرائک سے سوائے مالی نقصان کے کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا۔ واضح ہو کہ اس بحث میں بھی یہ فرض کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی ایک مختصر سی جماعت کسی خاص شعبہ میں ہڑتال کرتی ہے ایسی حالت میں تو بیشک اضافہ محض چند روزہ ہوگا لیکن جبکہ ہر شعبہ کے مزدور اضافہ کا مطالبہ کریں تو شرح اُجرت کا سابق سطح تک دوبارہ اُترنا دشوار ہوگا۔ اور اضافہ اُجرت ضرور دیرپا بلکہ مستقبل ہوگا۔ اور چونکہ عام بیداری اور اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدوروں کے تقریباً کل طبقوں میں مطالبہ اضافہ کا خیال پیدا ہو رہا ہے نتیجہ آخر الذکر زیادہ قرین وقوع ہے۔

گو اکثر حالتوں میں آجروں کے موجودہ منافع میں تخفیف کرکے اور بعض صورتوں میں قیمت مصنوعات زیادہ کرکے اُجرت بڑھانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن اس کی بھی ایک حد ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو کہ مزدور ہڑتال کرکے حسب دلخواہ اضافہ کراتے رہیں۔ اگر مطالبات حد مناسب سے تجاوز کریں تو نتیجہ یقیناً کاروبار کی تباہی اور آجر و مزدوروں کی بربادی کا ہوگا۔ اگر مزدوروں سے کبھی ایسی غلطی سرزد ہوگی تو تجربہ جلد اس کی اصلاح اور آیندہ کے واسطے تنبیہ کردے گا۔ رہا نقصان و تکلیف جو عوام کو ہڑتال سے پہنچتی ہے اس کے بیجا ہونے میں کلام نہیں لیکن آجر اور مزدوروں میں جو فریق برسر حق ہے وہ بری الذمہ ہے اور اس کا الزام فریق ثانی کے سر رہنا چاہئے جو گویا ہڑتال کا اصلی باعث ہے۔ گو بعض کا خیال اس کے برعکس ہے لیکن انسانی فطرت قدیم تجربہ اور نیز موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے غیر اغلب معلوم ہوتا ہے کہ ہڑتال کے دباؤ بغیر بھی آجر بخوشی اُجرت میں اتنا اضافہ گوارا کرلے جتنا کہ مزدوروں نے لڑ جھگڑ کے کرالیا ہے اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ شرح اُجرت معاشی قوانین کے تابع ہے لیکن مزدوروں کی کثرت تہیدستی، کم علمی، قدیم رسم و رواج۔ آجر کا اقتدار جیسے مخالف حالات اُن کے آزادانہ عملدرآمد کے مانع ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اور پس ماندہ ممالک میں ابتک بھی رُو رعایت اور مروت کا رواج پایا جاتا ہے لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جائز سے جائز حقوق کے واسطے پُرزور مطالبہ شرط ہو حتیٰ کہ اکثر مطالبہ کی قوت اور کمزوری کے مطابق حق کا جواز و عدم جواز قرار پاتا ہے۔ پھر بھی اکثر ہڑتال عوام کے حق میں بیحد نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے اور جب تک حصول مطالبات کی دوسری کُل تدابیر ناکام ثابت نہ ہوچکیں۔ مزدوروں کو یہ خوفناک آلہ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ مزدوروں کا اعتدال اور آجروں کی فراخدلی۔ ہڑتال کو بہت کچھ روک سکتے ہیں۔ اگر اجرت

حصہ سوم
باب ۱۱

میں اضافہ کرانا منظور ہو تو بجائے ہڑتال کے یہ معاملہ مزدوروں کے نمایندوں اور آجر کے روبرو پیش ہوکر باہمی پنچایت کے تصفیہ سے طے ہونا ہزار درجہ بہتر ہوگا۔ اور اب بھی یہی طریق رواج پارہا ہے۔

شرکت منافع

(۷) بطریق موجودہ آجر اور مزدوروں کے مفاد میں مخالفت نظر آتی ہے۔ منافع اور اُجرت سے کسی ایک کی بیشی دوسرے کی کمی کا باعث معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آپس کے سب شبہات اور جھگڑے مٹ جائیں اگر جس طرح اُجرت کی شرح معیّن ہو آجر بھی اپنے منافع کی مناسب شرح مقرر کرلیں اور اُجرت و منافع منہا کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے تو آجر و مزدور اس کو آپس میں بانٹ لیں۔ پھر مزدور کو آجر سے کوئی شکایت بھی نہ رہے۔ کاروبار کی کامیابی کے واسطے مزدور دل لگاکر کوشش کریں اور آجر و مزدور کو برابر نفع پہنچے۔ چنانچہ بعض معاملہ فہم اور روشن خیال کارخانے شرکت منافع کا طریق جاری کرکے نمایاں کامیابی اور سرسبزی حاصل کررہے ہیں اور امید ہے کہ شرکت منافع کے رواج سے اسٹرائک کا وبال دفع ہوجائے گا اور کاروبار زیادہ ترقی کرے گا اور مزدور بھی زیادہ خوشحال ہوجائینگے اعتراض کیا جاتا ہے کہ شرکت نقصان بھی شرکت منافع کا لازمی جزو ہونا چاہیئے اور اگر منافع کی شرح معیّن میں کمی پڑے تو وہ کمی نہ صرف آجر بلکہ مزدوروں کو بھی حصہ رسد برداشت کرنی چاہیئے۔ ورنہ مزدوروں کی وہی مثل ہوگی کہ میٹھا میٹھا ہپ ہپ اور کڑوا کڑوا تھو تھو۔ لیکن مزدوروں کو تو اُجرت منافع حاصل ہونے سے قبل ہی مل چکتی ہے۔ پھر شرکت نقصان کیونکر ممکن ہے۔ واضح ہو کہ اوّل تو منافع میں سال بسال بڑے بڑے تغیّرات نہیں ہوتے دوسرے صاف ظاہر ہے کہ اگر منافع میں مستقل کمی پیدا ہوجائے تو اُجرت

پر بھی ضرور ناموافق اثر پڑے گا - اور نُقصان کا بار مزدور کو بھی خواہ مخواہ برداشت کرنا ہوگا -

ترقیات مزدوران کی ایک خاص صورت آیندہ بعُنوان امداد باہمی سولھویں باب میں مذکور رہی -

حصہ سوم
باب ۱۲

باب بارہ

سُود

تجزیہ (۱) بحث سُود کی قدامت وقت (۲) سُود کی سرگزشت (۳) اصل کا مفہوم (۴) شغل اصل (۵) مسائلِ سُود (۶) انتظار کشی (۷) پیدا آوری (۸) شرح سُود (۹) اقسام سُود (۱۰) زر و سُود کا تعلق (۱۱) سُود کا حاضر و مستقبل

سُود کی قدامت و وقت

(۱) علم المعیشت میں کوئی دوسرا بحث اسقدر قدیم، دقیق، پیچیدہ اور معرکتہ الآرا نہیں جتنا کہ سُود۔ اکثر معاشی مسائل نے تو گزشتہ دو تین صدی میں جنم لیا لیکن سُود کے بحث مباحث کا اس قدیم ترین زمانہ تک پتہ چلتا ہی جس کا جدید تحقیقات سے ہم کو کافی تاریخی حال معلوم ہو سکا ہی۔ مصر، یونان، روم اور ہندوستان جیسے تہذیب والے ممالک میں عہد عیسوی سے بھی مدتوں پہلے سُود کے متعلق قواعد و قوانین جاری تھے، وید، توریت، انجیل اور قرآن جیسی مشہور مذہبی کتابوں میں سُود کے متعلق تاکیدی احکام موجود ہیں۔ افلاطون و ارسطو جیسے قدیم حکماء کی تصانیف میں بھی تحقیق سود کی جھلک صاف نظر آتی ہی۔ سُود کا تاریخی حال ہم ابھی بیان کریں گے جس سے واضح ہوگا کہ بمعاونت اقتضائے وقت مقبولیت سود نے اس کی مخالفت پر یورپ میں کیونکر غلبہ پایا۔ مذہبی رد و قدح سے آزاد ہو کر مسئلہ سُود جب سے علمی تحقیقات کے تحت میں آیا معاشیین کی سب سے بڑی اور قابل ترین جماعت اس پر دماغ سوزی کر رہی ہی حتیٰ کہ بعض تو اس کے مطالعہ اور تحقیق کے واسطے اپنی بیش بہا زندگی وقف کر چکے ہیں لیکن منزل مقصود تک پہنچنا ابھی کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ سود کی

حصہ سوم
باب ۱۲

معاشری مضرت اور معاشی ضرورت پر تو بہت کچھ بجا اور درست لکھا جا چکا ہی لیکن اس کی ماہیت ابھی تک قابل اطمینان اور تشفی بخش طور پر کوئی بھی واضح نہیں کرسکا۔ سود کیا ہی کس طرح پیدا ہو کر کس اصول کے مطابق تقسیم پاتا ہے۔ یہ سوالات سود کی علمی بحث میں جسقدر اہم ہیں اُتنے ہی دُشوار بھی ہیں۔ یوں تو جزواً جزواً بہت کچھ صحیح معلومات بہم ہوچکی ہے۔ لیکن ابتک کوئی دماغ ایسا حاوی نہیں ہوا کہ منتشر اور متفرق اجزاء کو اس طرح پر ترتیب دے سکتا کہ ان سے ایک باقاعدہ اور مکمل مسئلہ مرتب ہو جاتا۔ منجملہ بہت سی متفرق تحقیقات کے اکثر تو صحیح مگر ادھوری ہی اور بعض کم و بیش غلط و غیر متعلق۔ اس کی جداگانہ تفصیل سے حیرانی افزا طوالت کا اندیشہ ہی۔ علاوہ ازیں کتاب ہذا میں ایسی تفصیل بیجا معلوم ہوتی ہی۔ لہذا ہم سُود کے کل مروّجہ مسائل زیادہ ردوقدح کے بغیر مختصراً بیان کرنے اور صرف بدیہی خامیاں جتانے پر اکتفا کریں گے۔ مفصل اور دقیق بحث مباحثہ کے واسطے ایک جداگانہ کتاب زیادہ موزوں ہوگی۔

اکثر ناواقف اُردو خواں ناظرین کے سامنے سُود جیسا دشوار بحث پیش کرنے میں جن دقتوں کا سامنا لابُد ہی وہ محتاج تشریح نہیں چنانچہ کتاب کے اسی حصّہ میں ہم کو خاص طور سے مطالعہ اور غور و خوض کی ضرورت پیش آئی۔ مُستند انگریزی کتابوں سے مقابلہ کرنے پر اندازہ ہو سکے گا کہ اس بحث کو سُلجھانے میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔

سود کی سرگزشت

(۲) سود نے جس آہستگی اور ثابت قدمی سے مقبولیت حاصل کی وہ اس امر کی بدیہی مثال ہے کہ اقتضائے وقت کے مقابل سخت سے سخت مخالفت کو بالآخر پسپا ہونا ہی پڑتا ہی۔ یورپ میں سُود مدّتوں مذہباً حرام اور قانوناً ممنوع رہا۔ اور ایسا ہونا کچھ عجب و بیجا بھی نہ تھا جس زمانہ کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اس میں صرف ایک خاص قسم کا لین دین مُروّج تھا۔ دولتمندوں کا ایک مختصر گروہ تھا جن کے پاس زرنقد کے بڑے بڑے ذخیرے بیکار

حصہ سوم
باب ۱۲

پڑے تھے۔ معاشی پس ماندگی کی وجہ سے اس زمانہ میں ایسے فاضل اندوختوں سے بطور اصل عمل پیدایش میں مدد دینے کا بہت کم موقع حاصل تھا۔ ایسے زرِ نقد کا اگر کوئی مصرف تھا تو بس یہ کہ غریب آفت زدہ اور حاجتمندوں۔ یا نا عاقبت اندیش عشرت پرستوں کو سود پر قرض دیا جاتا تھا بہر صورت ایسے قرضوں سے بطور دولت احتیاجات رفع کی جاتی تھیں عملی پیدایش دولت میں بطور اصل ان سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گویا قرض دہندے اور قرض گیر دونوں کے ہاتھوں میں زرِ قرض محض دولت تھا جو احتیاجات رفع کرنے کے کام آتا تھا۔ وہ کسی جانب بھی اصل شمار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس میں ہر دو جانب صفت پیدا آوری مفقود تھی۔ چنانچہ ارسطو کا مقولہ کہ زرِ نقد بچے نہیں دیتا۔ اسی غیر پیدا آوری پر زور دیتا ہے۔ ایسے قرض پر جو سُود دیا جاتا تھا وہ دراصل غریب قرضدار کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوتی تھی۔ زرِ قرض سے نہ اصل کا کام لیا جاتا تھا نہ رقم سُود اس کی پیداوار ہوتی تھی۔ ایسے غیر پیدا آور قرضوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند دولتمندوں سے جن کے پاس فاضل دولت کا کوئی اور مصرف نہ تھا۔ بشمار غریب لوگ بحالت مجبوری و ناچاری تھوڑا سا قرض لیکر جس کو وہ جلد با احتیاج زندگی میں صرف کر دیتے تھے ہمیشہ کے واسطے ان کے پنجے میں گرفتار ہو جاتے تھے۔ قرض ادا کرنے کا تو ذکر کیا ہے۔ سُود ہی ادا کرتے کرتے عمر گزر جاتی تھی۔ دولتمند غریبوں کی چھوٹی چھوٹی کمائیوں کے شریک غالب بن کر جونک کی مانند ان کا خون چوستے رہتے تھے حتیٰ کہ بعض ممالک میں تو جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ از روئے قانون قرض دہندوں کے غلام قرار دیدیے جاتے تھے۔ بنی نوع انسان کی تباہی کا سُود سے زیادہ خوفناک آلہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر وہ قطعاً حرام و ممنوع تھا تو عجب کیا تھا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ باوجود ہزارہا بندشوں کے سُود کا رواج برابر جاری رہا۔ البتہ مذہبی عقوبت اور قانونی سزا

سے بچنے کے لیے اس کی شکل سو سو طرح سے بدلتی رہی۔ حاجتمندوں کو قرض لیے بغیر تو چارہ نہ تھا۔ اور بلا سود قرض دینے والے فیاض نایاب تھے۔ اور سود لینا حرام تھا۔ بالآخر مجبوراً یہودیوں کو سود سے قانوناً مستثنیٰ کردیا گیا تھا کہ قرض بھی میسر آسکے اور عیسائی سود خواری کے گناہ سے بچے رہیں۔ لیکن اپنے مقابل یہودیوں کو سود لیتے دیکھ کر بھلا عیسائی کب رکنے والے تھے انھوں نے بھی قرض داروں سے بشکل تحفہ تحائف سود وصول کرنا شروع کردیا۔ ازروئے قانون بحالت رہن بالقبض شئ مرہونہ کی آمدنی ادائگی قرض میں شمار ہونی چاہیے تھی لیکن قانوناً مالک کسی چیز کا حق استعمال یا پیداوار دوسرے کو منتقل کرسکتا تھا۔ پس قرضدار بھی شئ مرہونہ کی آمدنی قرض دہندہ کو ہبہ کرکے بلا قانونی روک ٹوک سود ادا کردیتے تھے۔ نو نقد نہ تیرہ اُدھار کی ضرب المثل فطرت انسانی کے ایک نہایت نتیجہ خیز خاصہ کا پتہ دیتی ہی جس کا معاشی اثر سود کی بحث میں خاص طور پر قابل لحاظ ہی۔ چنانچہ اُس زمانہ میں بھی جب کہ سود ممنوع تھا بمقابلہ نقد کے اُدھار قیمت زیادہ طلب کرنی جائز مانی جاتی تھی۔ اس اُصول کو بھی توڑ مروڑ کر حصول سود کا ایک طریق ایجاد کرلیا گیا۔ کوئی چیز فرضی طور پر قرض گیر کے ہاتھ اُدھار فروخت کی جاتی تھی اور قرض دہندہ پھر اس کو کمتر نقد قیمت پر خرید لیتا تھا۔ اس طرح پر جو قرض بشکل قیمت نقد دیا جاتا تھا وہ مع سود بشکل قیمت اُدھار وصول ہوجاتا تھا۔ علاوہ ازیں مذہبی عقوبت اور قانونی گرفت سے بچ کر سود لینے کے اور بھی چند عجیب و غریب طویل و پیچیدہ طریق ایجاد کرلیے گئے تھے۔ اور بالآخر سود خوری نہ رکنی تھی نہ رکی۔

قرض کی دو قسمیں قرار دی گئی تھیں ایک تو ایسی چیزوں کا قرض کہ جو دوران استعمال میں ضائع نہ ہوں اور کچھ عرصہ بعد فی نفسہ واپس کی جاویں گویا دیرپا چیزیں جو مدت تک کام آتی رہیں جو ایک شخص کی ملکیت قائم رہ کر دوسرے کے استعمال میں آسکیں اور جن کا استعمال

حصہ سوم ان کی ذات سے جُدا گانہ شمار ہو کر فروخت کیا جا سکے مثلاً مکان گھوڑا یا گاڑی، ایسی
باب ۱۲ چیزوں کا کرایہ جس میں مطالبات فرسودگی اور معاوضہ استعمال شامل ہیں دینا جائز تھا
دوسرے ایسی چیزوں کا قرض کہ جو دوران استعمال میں خود تو ضائع ہو جاویں اور ان کی
ہمجنس چیزیں واپس کی جاویں بالفاظ دیگر جو خود ضائع ہوئے بغیر کام نہ دے سکیں
اور جو استعمال ہوتے ہیں ضائع ہو کر احاطۂ ملک سے خارج ہو جاویں جن کا استعمال ان کی
ذات سے لاینفک ہونے کی وجہ سے جُدا گانہ فروخت نہ ہو سکے۔ مثلاً پھل پھول یا شیرینی۔
زر نقد بھی قسم دوم میں شمار ہونے کے قابل مانا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک
وہ بطور دولت صرف رفع احتیاجات میں کام آتا تھا۔ گویا اس کے استعمال سے مراد
اس کو بہم رسانی ضروریات میں خرچ کر ڈالنا تھا۔ اصل کے طور پر بشکل آلات و پیداوار
خام اس سے پیدائش دولت میں کوئی ایسا کام نہیں لیا جاتا تھا کہ باوجود استعمال وہ
باقی و قائم رہتا اور اس کی ذات سے اس کا استعمال جُدا گانہ شمار ہو سکتا آخر الذکر
قسم کی چیزوں کے قرض میں صرف ان کے مساوی ہمجنس چیزیں لی جا سکتی تھیں اسی
وجہ سے زر نقد کے قرض کا سود بھی جائز نہ تھا قرض کی مذکورۂ بالا تقسیم سے بھی صاف
طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت تک لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی غرض سے
قرض لیا کرتے تھے۔ زر مستعار سے کاروبار چلا کر پیدائش دولت میں مدد لینے کا طریق
اب تک غیر مروج تھا جب کہ قرض کا روپیہ صریحاً غیر پیدا آور تھا۔ اور اکثر غریب و
حاجت مند لوگوں کے ہاتھ میں جاتا تھا تو دولت مندوں کا ان سے سود طلب کرنا
کیوں ظلم و جبر منظر نہ آتا۔ اور کیوں ایسی آمدنی ناجائز قرار نہ دی جاتی۔

لیکن اس واقعہ کو نظر انداز کرنا بھی دشوار تھا کہ بعض قرض مارے جاتے تھے
اور قرض دہندہ کو کچھ وصول نہ ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ نفع کی کوئی صورت نہ ہو اور

نقصان کا اندیشہ موجود ہو۔ بھلا کون قرض دینے پر رضامند ہو سکتا تھا۔ لہٰذا زرِ رہن پر تو

سود ناجائز رہا۔ لیکن جو قرض محض ذاتی اعتبار پر دیا جاتا تھا اور جس کی وصولیابی میں کچھ بھی وقت نظر آتی تھی اس پر بطور مطالبات خطر کچھ سود لیا جا سکتا تھا۔

اس وقت تک سود بہر صورت غیر واجب اور سخت مضر خیال کیا جاتا تھا۔ بعض خاص حالتوں میں جو درپردہ سود خوری کی اجازت بھی تھی تو گویا وہ فطرت انسانی کی ناقابلِ اصلاح کمزوریوں کی ناپسندیدہ رعایت تھی۔ سود فی نفسہٖ کبھی بجا نہیں سمجھا گیا۔ یہاں سود کا دورِ اوّل ختم ہوتا ہے۔

یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے ساتھ ساتھ سود کے دورِ ثانی کی ابتدا ہوئی۔ مذہبی ردّ و قدح کے حلقہ سے نکل کر مسئلہ سود علمی تحقیقات کے میدان میں داخل ہوا۔ اور معاشی انقلابات کی بدولت رفتہ رفتہ سود علانیہ بجا اور درست مانا جانے لگا۔ اس سے قبل تو قرض بالعموم رفع احتیاجات کے واسطے محض بطور دولت استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جب عام بیداری اور ایجادات کی بدولت صنعت و حرفت نے فروغ پایا اور تجارت کا عروج شروع ہوا تو حوصلہ مند کارگزاروں نے بیکار اندوختے قرض لے کر کاروبار جاری کر دیئے اور ماحصل زائد میں سے کچھ قرض دہندوں کو بہ مد سود ادا کیا اور باقی بطور منافع خود ہنگوایا۔ جب زرِ مستعار سے بطور اصل کا لیا جانا شروع ہوا تو اس کی پیدا آوری سب پر بخوبی روشن ہو گئی کہ سود ادا کرنے پر بھی قرضدار کو منافع بچنے لگا۔ لہٰذا کسی کاروبار میں صرف زرِ نقد سے شریک ہو کر منافع میں حصہ بانٹنا جائز قرار پایا اور موجودہ انجمن سرمایۂ مشترک کی بنا پڑی۔ واضح ہو کہ اوّل اوّل ایسے حصہ دار لازماً نفع نقصان دونوں میں یکساں شریک تھے۔ لیکن ایک عجیب ترکیب سے حدودِ مذہب و قانون کے اندر ہی اندر رہ کر شرکتِ نقصان سے انھوں نے بریت حاصل کر لی۔ وہ اس طرح پر

حصہ سوم
باب ۱۲

کہ زرِ نقد دے کر کاروبار کے نفع نقصان میں شریک بن جانا تو علانیہ جائز تھا۔ اب طریق ضمانت کے مطابق جس کا رواج آج کل بکثرت پھیلا ہوا ہے اوّل تو انھوں نے تخمیناً کمتر منافع قبول کرنے کے معاوضہ میں اپنے زرِ نقد کی جو مستعار دیا تھا ضمانت کرالی گویا اس کے ضائع ہونے کا اندیشہ جاتا رہا۔ دوسرے اسی طریق سے ایک کمتر مستقل منافع کی بھی ضمانت کرالی۔ گویا آپس میں تین جداگانہ معاہدوں کی مدد سے قرض پر شرح سود بھی مقرر کر لی جاتی تھی اور قرض دہندہ کو شرکت نقصان سے بھی نجات حاصل ہو جاتی تھی اس ترکیب کو معاہدہ ثلاثہ سے تعبیر کرنا ناموزوں نہ ہوگا۔

جبکہ بیکار اندوختوں میں خاصیت پیدا آوری نمایاں ہوگئی اور کاروبار میں صرف زرِ نقد سے شریک ہو کر نفع اُٹھانے کی صورت نکل آئی تو ایک حالت میں قدیم طرز کے غیر پیدا آور قرضوں پر بھی سود جائز قرار پایا گیا۔ فی نفسہ ایسے قرضوں پر سود لینا تو اب تک حرام و ممنوع تھا۔ لیکن اگر قرضدار وقت معینہ پر قرض ادا نہ کرے تو دوران تاخیر میں قرض بر وقت ادا نہ ہونے سے قرض دہندہ کو جو نقصان پہنچے یا جس منافع سے محروم ہونا پڑے وہ قرضدار کو بطور ہرجانہ ادا کرنا لازم تھا۔ کہنے کو تو یہ ہرجانہ بدل منافع یا تلافی نقصان تھا لیکن اس نے باآسانی سود کا ڈھنگ اختیار کر لیا۔ ترکیب یہ تھی کہ قرض برائے نام نہایت مختصر زمانے مثلاً ایک دو ہفتہ یا مہینے کے واسطے دیا جاتا تھا لیکن اصلی منشا چند سال ہوتے تھے اور عدم ادائگی قرض کے بہانہ سے اصول بدل منافع یا تلافی نقصان کے مطابق بلا روک ٹوک ہر قسم کے قرضوں پر سود لیا جانا شروع ہوا۔

کچھ روز تو یہ قاعدہ رہا کہ چونکہ منافع یا نقصان کا پہلے سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا لہٰذا بحالت تاخیر صرف ادائگی قرض کے وقت ہرجانہ قرار پا سکتا تھا۔ لیکن چند ہی روز میں ایسے ہرجانہ کا پہلے ہی سے تعین کر لینا بھی جائز قرار پایا گیا اور اب سود کے راستہ

میں کوئی قابل لحاظ رکاوٹ باقی نہیں۔ ہنڈی پر جو بٹہ کاٹا جاتا تھا اور جو سود قرضوں پر بنک لیتے تھے محنت کاروبار کا معاوضہ یا بدل منافع و تلافی نقصان شمار ہو کر جائز قرار پا گیا۔ جو لوگ بنک میں روپیہ داخل کرتے تھے ان کو بھی اصول ہرجانہ کے مطابق زر داخل شدہ پر کچھ سود دیا جانے لگا۔ المختصر سولھویں صدی کے آخر تک سود نے اچھی طرح پر قدم جمائے اور عدم جواز سود کے مذہبی و قانونی احکام بالکل بے جان ہو کر محض معاشی پس ماندگی کے یادگار رہ گئے۔

عدم جواز کی قید سے تو کسی نہ کسی طرح سود تقریباً بالکل رہا ہو گیا۔ لیکن شرح سود کا تعین قانون نے پھر بھی اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا ضروری سمجھا۔ تعین شرح کی دو غرضیں تھیں اوّل یہ کہ عدالتوں کو سود کے مقدمات فیصل کرنے میں سہولت ہو۔ دوسرے یہ کہ غریب یا ناعاقبت اندیش لوگ بیحد اعلیٰ شرح سود دینے پر مجبور ہو کر تباہ و برباد نہ ہو جاویں۔ اس وقت تک معاشی اسباب کا اثر اس قدر وسیع اور قوی نہیں تھا کہ بلا مداخلت قانون کوئی مناسب شرح قرار پا سکتی۔ اور زیادتی شرح کا اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اوّل اوّل قانونی شرح بھی ۱۰ فیصدی سے کم قرار نہ پا سکی۔ چنانچہ اسی وجہ سے قانونی شرح معیّن نے کچھ عرصہ تک قرضداروں کو قرض دہندوں کے دست بُرد سے بہت قابل قدر حد تک محفوظ رکھا۔ علاوہ ازیں سود بھی ممنوع تھا اور ازروئے قانون مقدار قرض سے زیادہ سود کا کسی حالت میں مطالبہ جائز نہ تھا۔

آخر الذکر قاعدہ اہل ہنود میں بھی دمدپت کے نام سے رائج تھا اس کے متعلق اس امر پر بہت اختلاف رائے پھیلا کہ آیا مقدار سود کے قرض سے تجاوز نہ کرنے کی شرط صرف اس سود سے متعلق ہے کہ جس کا کسی وقت مطالبہ کیا جائے یا سود کی سابق ادا شدہ رقمیں بھی اس مقدار میں شمار ہونی چاہئیں مثلاً دمدپت کی رو سے پانسو روپیہ کے

حصہ سوم قرض پر فی الجملہ پانسو روپیہ سے زیادہ رقم بطور سود نہیں لی جا سکتی۔ فرض کرو کہ تین
باب ۱۲ سو ادا ہو چکا ہی۔ سوال یہ ہی کہ آیا ادا شدہ سود ۳۰۰ روپیہ اصل کی مساوی رقم پانسو
میں سے منہا کر کے آیندہ زیادہ سے زیادہ صرف باقی دوسو روپیہ بطور سود طلب کیے جا سکتے
ہیں یا سود کی ادا شدہ رقم منہا نہ کر کے زیادہ سے زیادہ اصل کی برابر ۵۰۰ روپیہ سود
بعد کو کسی موقع پر یکمشت لیا جا سکتا ہی المختصر یہ کہ دمدپت کی بنا پر اصل کی مساوی رقم
بطور سود طلب کرنے کے وقت سود کی سابق ادا شدہ رقمیں شمار کی جائیں گی یا نہیں۔
تعجب ہی کہ جن ہندوستانی عدالتوں میں دمدپت کا قاعدہ مُروّج ہی وہاں آخر الذکر مفہوم
پر عملدرآمد ہو رہا ہی۔ یعنی سابق ادا شدہ سود کی رقمیں منہا نہیں کی جاتیں حالانکہ
اوّل الذکر مفہوم صریحاً زیادہ قرین عقل و مصلحت ہی۔

مذہبی نقطۂ نظر سے تو مروّجہ سود کا جواز بھی اب تک قطعی طور پر فیصل شدہ نہیں مانا جاتا
لیکن عملی تجربہ اور علمی تحقیقات سے وہ بہت بڑی حد تک بجا اور درست ثابت ہو چکا ہی تاہم
مضرت و منفعت رسانی کے اصول پر سود کی اُسی زمانہ میں دو قسمیں قرار پا گئیں۔ اوّل
جو سود خاص طور سے قدیم طرز کے تغیر پیدا آور قرضوں پر بشرح اعلیٰ وصول کیا جائے دوم
جو جدید وضع کے پیدا آور قرضوں پر بشرح مناسب حاصل ہو۔ ان دو قسموں کے نام
بھی جدا جدا قرار پا گئے اور ہم بھی ان کو حسب ترتیب ربا اور سود سے تعبیر کریں گے۔ اگر
یہ دونوں اصطلاحیں مترادف بھی ہوں اور اختلاف زبان کے سوائے ان میں کوئی
فرق نہ ہو۔ تاہم بغرض امتیاز و سہولتِ حوالہ اوّل جتا کر ان کو مذکورۂ بالا جُدا گانہ
معنوں میں استعمال کرنا مفید و ضروری معلوم ہوتا ہی۔

ربا اب بھی بجا مذموم اور تباہ کن مانا جاتا ہی اور بذریعہ قانون اس کو روکنے
کی کوشش میں پھر سرگرمی بڑھ رہی ہی۔ اسی واقعہ سے ہم آیندہ بعنوان سود کا حاضر و مستقبل

مفصل بحث کریں گے (۱۱/۱۲) آگے چل کر شرح سود کی بحث میں واضح ہو گا کہ معاشی ترقیات حصہ سوم
کی بدولت شرح سود کیونکر خود بخود سطح اعتدال پر اُتر آئی اور کاروبار میں قانونی شرح غیر باب ۱۲
ضروری و متروک ہو گئی (۵/۱۲) البتہ عدالتوں میں بغرض سہولت فیصلہ قانونی شرح اب تک جاری ہے۔

۴- پیدائش اصل کے تاریخی حال (۵-۴/۳) افزونی اصل کے اسباب (۳-۲/۴) اور فرق دولت و اصل کی بحث میں اصل کا سیدھا سادہ مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی مفہوم کی ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں۔

اصل کے معنوں کا اختلاف اس کے استعمال کی تاریخ میں مضمر ہے۔ اوّل اوّل اصل سے مراد وہ رقم تھی جو سود پر قرض دی جاتی تھی۔ چونکہ مذہب عیسوی کے مطابق بھی سود پر روپیہ چلانا حرام اور قانوناً ممنوع تھا طرح طرح پر لین دین کی ظاہری شکل بدلنے کی کوشش کی گئی تاکہ مذہبی گرفت اور قانونی سزا سے اماں ملے۔ مثلاً براہ راست قرض دینے کے بجائے یہ طول طریقہ ایجاد کیا گیا کہ کوئی چیز قرض خواہ کے ساتھ اُدھار فروخت کی اور بعدہٗ پہلے سے مقرر کی ہوئی کم قیمت پر اس سے واپس خرید لی۔ گویا قرض بشکل قیمت نقد دے کر اصل مع سود بشکل قیمت اُدھار وصول کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں جو چیزیں عاریتاً دی جاتی تھیں ان کی ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی کے بہانے سے کچھ مزید معاوضہ لیا جانا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اصل کے معنی میں بھی توسیع شروع ہوئی اور زرِ نقد کے علاوہ دیگر اشیا و سامان بھی اصل میں شمار ہونے لگا۔ اس وقت تک اصل کی خصوصیت امتیازی یہی مزید معاوضہ کی آورد تھی۔ گویا اصل سے مُراد دولت کا وہ حصّہ تھا جو مستعار دیا جائے اور جس سے کچھ آمدنی غیر مکتسب بطور سود حاصل ہو۔

واضح ہو کہ اس دَور اوّل میں صرف حاجت مند لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی

حصہ سوم غرض سے زرِ نقد یا سامان قرض لیتے تھے۔ کاروباری اغراض سے اصل قرض لینے کا
باب ۱۲ رواج ابھی جاری نہیں ہوا تھا اور نہ کم قیمت اور سیدھے سادھے آلات سے بڑھ کر
اصل کو صنعت و حرفت میں کچھ دخل تھا۔

صاف ظاہر ہے جیسا کہ ارسطو کا قول ہے کہ زرِ نقد انڈے بچے نہیں دیتا۔ علیٰ ہذا سرمایہ اشیا بھی رکھے رکھے خود بخود نہیں بڑھ سکتا۔ البتہ اصل سے اس طور پر کام لینا ممکن ہے کہ مزید دولت پیدا ہو سکے۔ اور اگر اصل سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام نہ لیا جاتا تو کیونکر ممکن تھا کہ ہر ملک میں صدیوں اصل بھی بڑھتا اور سود بھی ادا ہوتا رہتا۔ اگر مثل دولت محض احتیاجات رفع کرنے میں کام آتا تو افزونی کا تو ذکر کیا گنج قارون بھی چند روز میں ختم ہو جاتا اور حاجتمند قرضداروں کو سود ادا کرنا محال تھا۔ چنانچہ اصل پیدائش دولت کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے۔ اور اس کی کارگزاری ہر طرف صنعت و حرفت میں اظہر من الشمس ہے۔ اصل کے پیدا آوری کے متعلق ہم اس سے قبل بھی کافی بحث کر چکے ہیں (د ۵/۳ و ۱/۴) یہاں اس کے اعادہ سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اصل کے سابق مفہوم میں کیونکر تغیر ہوا اور سمل کے زمانہ میں اصل سے دولت کا وہ حصہ مُراد لیا گیا کہ جو آیندہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے پس انداز کیا جاوے۔ آوردِ آمدنی غیر مکتسب کے بجائے پیدائش دولت اصل کی خصوصیت امتیازی قرار پائی۔ اور پیدا آوری کا خیال اصل کے معنی میں جذب ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فوری احتیاجات رفع کرنے کے بجائے تجارت اور کارخانے چلانے کی غرض سے لوگ زرِ نقد یا سامان قرض لینے لگے۔ اور بیش بہا انجنوں اور مشینوں اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بدولت عمل پیدائش و دولت میں اصل نمایاں کام کرنے لگا۔

المختصر اصل کی دو خصائص امتیازی تحقیق ہوئے۔ اول وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ قرار پایا دوم پیدائش دولت کا ایک ناگزیر عامل تسلیم کیا گیا اور یہ دونوں خصائص اپنی اپنی

جگہ اہم اور قابل توجہ ہیں۔ چنانچہ پیدائش کی بحث میں اصل کی خصوصیت دوم پر بہت زور دیا جاتا ہے اور تقسیم دولت کے بیان میں خصوصیت اول پر بے حد توجہ طلب کی جاتی ہے۔ حصہ سوم باب ۱۲

مفہوم اصل کی بحث میں اور بھی بہت کچھ بال کی کھال نکالی گئی ہے جس کی پیچیدہ تفصیل بخوف پراگندگی و حیرانی نظر انداز کرنا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔

شغل اصل

۴۔ پیدائش دولت کے میدان میں اس وقت اصل باقی ہر دو عامل (یعنی زمین و محنت) پر حکمراں نظر آتا ہے۔ جیسا کہ ہم ایک موقع پر پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عہد قدیم میں پیدائش دولت کا دارومدار بیشتر زمین پر تھا۔ ازمنۂ متوسط میں محنت کا دخل بڑھا اور عہد جدید میں اصل کا دور دورہ ہے۔ چنانچہ معاشی زبان میں موجودہ زمانے کو **عہد اصل** کہتے ہیں۔ اصل کا عروج بھی تہذیب جدید کا ایک لازمہ ہے۔ بعض نے تو اصل کو موجودہ تہذیب کا **خون حیات** قرار دیا ہے اور اس میں کچھ مبالغہ بھی نہیں کیونکہ قلم اور عَلَم دونوں اسی کے متوسل نظر آتے ہیں۔ اور آج کل ممالک کی پس ماندگی و ترقی کا باعث اسی اصل کی قلت و افراط میں مضمر ہے۔ مشینوں اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے بیان سے اصل کی قوت پیدا آوری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے (۴-۵-۷-۸ / ۲) افزونی اصل کے اسباب بھی واضح ہو چکے ہیں (۲-۳ / ۴) یہاں ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمانہ میں اصل سے کام لینا جس کو اصطلاحاً **شغل اصل** کہتے ہیں کس قدر مروّج اہم اور آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو عمل اصل کے واسطے نہایت وسیع میدان نکل آیا۔ دوسری طرف قانونی تسلط اور کاروباری خوش معاملگی کی بدولت اصل کو وہ امن و اماں میسر ہے کہ بلا خوف و خطر چار دانگ عالم میں چکر لگا رہا ہے، دنیا کا کونسا آباد حصہ ہے جہاں انگلستان کا تھوڑا بہت اصل کام نہیں کر رہا ہے یہی اصل تو دنیا کے ہر گوشہ سے دولت سمیٹ سمیٹ کر یورپ اور امریکہ لیئے جا رہا ہے۔ وہاں کے اصل دار نہ صرف اپنے ملک کی صنعت و

حصہ سوم
باب ۱۲

حرفت بلکہ نہایت دُور دست ممالک کی ریل۔ معدنیات۔ اور جنگلات جیسی معاشی شعبوں میں بلا پس و پیش اور نہایت دریا دلی سے اصل لگا لگا کر غیروں کی خداداد نعمتوں سے گھر بیٹھے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں ان کی زبردست اور ذی اقتدار حکومتیں ان کے بیرونی کاروبار اور اصل کی پوری پوری حفاظت اور نگہداشت کرتی ہیں اور موجودہ بیدار قومیں دیگر ممالک میں اپنی معاشی فوائد کی ترقی۔ ملک گیری سے بھی زیادہ اہم اور قابل توجہ سمجھتی ہیں حتیٰ کہ کچھ عرصہ سے ملکی فتوحات کے بجائے معاشی تسلط کی خواہش جنگ کی محرک ہونے لگی ہے اور بعدہٗ یہی تسلط بلا در دسر ملکوں پر قبضہ بھی کرا دیتا ہے۔ آجکل تو آگے کھٹیا پیچھے لٹھیا ملک گیری کا عام اصول بنا رکھا ہے۔ ہندوستان سے لے کر مراکش مصر اور فارس تک معاشی تسلط کا یہی جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

اب ذرا شغل اصل کی آسانیوں کا حال سنئے۔ اوّل تو صدہا بنک ہیں جو اصل کے بیشمار چھوٹے چھوٹے اجزا سے نہایت کثیر مقدار فراہم کر کے کاروبار میں بڑی بڑی رقمیں لگاتے ہیں۔ یہ بنک گویا ایسے تالاب ہیں جن میں بیشمار چھوٹے چھوٹے گڑہوں کا پانی فراہم ہو کر کھیت اور باغات کو سیراب و شاداب کرے۔ ہر شخص کو اتنی مہلت کہاں کہ اپنے اندوختہ سے خود کام لے سکے اور نہ چھوٹی چھوٹی رقموں سے آجکل کام چل سکتا ہے۔ پس اس سے بہتر کیا ہوگا کہ عدیم الفرصت اور چھوٹے چھوٹے اصل دار اپنا اندوختہ کسی بنک میں داخل کر کے نہ صرف اس کی حفاظت سے سُبکدوش ہوں بلکہ کچھ سود بھی بطور معاوضہ پائیں اور بنک ایسی بے شمار اندوختوں کی بڑی بڑی مقدار اپنے اہتمام اور ذمہ داری پر تاجر اور کارخانہ داروں کو سود پر قرض دیں اور داخل کنندوں کو بشرح کمتر سود دے کر فرق میں سے مصارف کاروبار اور منافع نکالیں اور چونکہ اصولاً اکثر ایسی ضرورتوں کے واسطے روپیہ قرض دیتے ہیں کہ جن میں اصل کی

قوّت پیدا آوری سے کام لے کر قرض گیر مزید دولت پیدا کر سکے۔ بنک کے قرضداروں پر سود کچھ گراں بھی نہیں گزرتا بلکہ اصل مستعار کے توسّل سے وہ خود بھی منافع اُٹھا لیتے ہیں۔ گویا ایک ہی اصل اپنے مالک، بنک اور قرض گیر تین طبقوں سے گزر کر پیدائش کے میدان میں داخل ہوتا ہے۔

بنک میں اندوختہ جمع کرنے کے علاوہ شغل اصل کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ یہاں پر چند کاروباری اصطلاحات کی تشریح کرتے ہیں جس سے خودبخود واضح ہو جائیگا کہ کاروبار میں روپیہ لگانے کے آج کل کیا کیا طریق رائج ہیں۔

"انجمن سرمایہ مشترک" سے کوئی ایسا کارخانہ یا دُکان مُراد ہے جس کو متعدد لوگوں نے مل کر جاری کیا ہو۔ کاروبار میں سب نے مل کر اپنی اپنی گرہ سے روپیہ لگایا ہو۔ اور بحالت ضرورت اپنی مجموعی ذمہ داری اور ضمانت پر دوسروں سے قرض لے کر کاروبار کو فروغ دیا ہو۔ انجمن کا انتظام وغیرہ تنخواہ دار منیجر اور ملازموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ البتہ شرکار کی ایک کمیٹی عام نگرانی رکھتی ہے۔ قانون نے ایسی انجمنوں میں دو بڑی خوبیاں پیدا کر دی ہیں۔ اوّل تو سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر ششماہی یا سالانہ حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کر عام اطلاع کے واسطے کاروبار کی رپورٹ شائع کرانی قانوناً لازم ہے گویا انجمن کے حسابات میں ردوبدل کرنا بہت دشوار ہے۔ مزید براں ایسی انجمنیں محدود بھی ہو سکتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی مشترک سرمایہ دار محدود انجمن کو خسارہ آئے تو شرکار سے زیادہ سے زیادہ اس قدر رقم وصول کی جا سکتی ہے جس قدر کہ اُنھوں نے اپنی گرہ سے کاروبار میں لگا رکھی ہے۔ گویا بار کفالت صرف اسی رقم تک محدود ہے۔ مطالبہ داروں کو اس کے علاوہ شرکار کے دیگر مال و جائداد پر کچھ دعویٰ نہ ہو گا۔ مثلاً کسی محدود انجمن میں دس ہزار روپیہ شرکار کی طرف سے لگا ہوا ہو اور بارہ ہزار روپیہ

حصہ سوم
باب ۱۲

واجب الادا ہو۔ مطالبہ دار زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپیہ جو شرکا نے اپنی انجمن میں لگا رکھا ہے وصول کر سکتے ہیں۔ ان کے مطالبہ کا بار کفالت شرکا کے دیگر مال و جائداد پر عائد نہیں ہوتا وہ تو بس انجمن کی رقم تک محدود ہے۔ ایسی کاروباری انجمنوں میں شریک ہونے میں لوگوں کو زیادہ پس و پیش نہیں ہوتا۔ وجہ جاں فشانی ہے۔ چنانچہ مشترک سرمایہ دار محدود انجمنیں ترقی یافتہ ممالک میں بکثرت جاری ہیں۔ اور بیشتر کاروبار انھیں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔

بونڈ اور ڈبنچر میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ اگر کسی کمپنی کو عوام سے روپیہ قرض لینا منظور ہو تو وہ بونڈ یا ڈبنچر فروخت کرکے روپیہ فراہم کر لیتی ہے۔ اور بونڈ کے مالکوں کو بشرح مُعین سود ادا کرتی رہتی ہے۔ مثلاً سو سو روپیہ کے بونڈ جاری ہوں اور فی بونڈ چار روپیہ سالانہ سود دیا جائے۔ گویا کمپنی نے چار فی صدی سود کے حساب سے قرض لیا اور قرض دہندوں کو بونڈ بطور تمسک دے دیا تاکہ اس کے ذریعہ سے وہ سود پاتے رہیں۔ اور جب چاہے اس کو فروخت کرکے کم و بیش روپیہ نکالیں یا بروقت مُعینہ کمپنی سے اصلی رقم وصول کریں۔ واضح ہو کہ بونڈ یا تمسک کی حالت بعینہ جائداد کی سی ہے۔ اس سے مستقل آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ بلا تکلف اس کو خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں۔ بونڈ کے سود کی مقدار مُعین ہوتی ہے۔ مثلاً سو سو روپیہ کے بونڈ کا سود فی بونڈ چار روپیہ سالانہ ہو۔ بازاری شرح سود کے حساب سے عام خرید و فروخت میں اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہے گی۔ اگر بازاری شرح سود تین فیصدی ہو تو مذکورۂ بالا سو روپیہ والے بونڈ کی قیمت جس سے چار روپیہ سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ سو کے بجائے ایک سو تیس کے قریب ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر بازاری شرح پانچ فیصدی ہو تو اس کی قیمت گھٹ کر اسی روپیہ کے قریب آ رہے گی۔ جو قیمت کمپنی کی طرف سے بونڈ پر درج ہو وہ قیمت متعارفہ کہلاتی ہے۔ اور جو قیمت بازار میں وصول ہو اس کو قیمت صحیحہ کہتے ہیں

مثلاً بونڈ مذکورۂ بالا کی قیمت متعارفہ سو روپیہ ہے۔ لیکن اس کی قیمت صحیحہ ایک وقت ایک سو تیس روپیہ کے قریب ہے اور دوسرے وقت صرف اسی روپیہ۔ اور اسی طرح وہ اکثر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

بونڈ کی کئی قسمیں قرار پاتی ہیں۔ **انسکرٹیڈ بونڈ یا رجسٹرڈ بونڈ کو درج شدہ تمسک یا رجسٹری شدہ تمسک** سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مُراد یہ ہے کہ ان کے مالکوں کے نام کمپنی کے رجسٹروں میں باقاعدہ درج رہتے ہیں۔ اگر ایسا تمسک گم ہو یا چوری جائے تو کمپنی کے رجسٹروں میں اس کے ملک کا ثبوت محفوظ رہتا ہے۔ اس قدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ خود مالک یا اس کے مختار کے سوا کوئی اور سود بھی وصول نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس **بیدر بونڈ یا دست گرداں تمسک** یونہیں ہاتھوں ہاتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں کمپنی کے رجسٹروں میں مالکوں کا نام درج نہیں رہتا۔ القبض دلیل الملک کے اصول پر عمل ہوتا ہے۔ جو کوئی ایسا بونڈ یا تمسک کمپنی کے ہاں پیش کرے سود وصول کرلے۔ اسی طرح اگر بیدر بونڈ گم ہو یا چوری جائے تو مالک کو ثبوت پیش کرنے میں وقت کا سامنا ہوگا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام خطروں کے ہوتے ہوئے لوگ ایسے بونڈ کیوں خریدتے ہیں۔ اس کی وجہ ذیل میں بیان ہوگی۔

کمپنیوں کے اکثر بونڈ میعادی ہوتے ہیں۔ یعنی کمپنی وقت مُعینہ مثلاً دسی رنیڈ دو سال کے اندر اندر یا اختتام پر اصلی رقم یعنی متعارفہ کے حساب سے بونڈ واپس لے کر قرض ادا کرنے کا ذمہ لے لیتی ہے۔ اس اصول پر میونسپلٹیاں بھی سڑکوں روشنی اور واٹر ورکس میں ذرائع آب رسانی کے واسطے عوام سے قرض لے کر چلاتی ہیں۔ اور کمپنیوں کی طرح ان کو بھی سود ادا کرنے پر کچھ منافع بچ رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی سلطنت قرض لیتی ہے اور سلطنتوں میں قرض ستانی کا رواج بہت بڑھ رہا ہے۔ تو وہ اکثر دائمی بونڈ یا تمسک فروخت کرتی ہے۔ یعنی بونڈ واپس لینے اور قرضہ ادا کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کرتی۔ البتہ

مالکان تمسک کو مستقل طور پر سود دیتے رہنے کا پورا ذمہ کرلیتی ہی جب تک بونڈ اپنے پاس ہو۔ سرکار سے سود ملتا رہے گا۔ اور جب روپیہ نکالنا چاہے بونڈ کسی کے ہاتھ بہ نرخ بازار فروخت کردے۔ بونڈ کے خریدار ملنے میں وقت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ دوسری بات ہی کہ بازاری شرح سود کے مطابق بونڈ کی قیمت کم اُٹھے یا زیادہ، ایسے سرکاری بونڈ کو پرومیسری نوٹ یا گورنمنٹ اسٹاک یعنی سرکاری تمسک بھی کہتے ہیں۔ اسٹاک کا ایک خاص مفہوم اور بھی ہی جو ابھی بیان ہوگا۔

اگر سلطنت زر قرض کو کاروبار میں لگا دے۔ نہریں کھدوائے۔ ریلیں نکالے تو سلطنت پر سود کا کوئی بار نہیں پڑتا۔ بلکہ ایسی چیزوں کی آمدنی میں سے سود اور مصارف منہا کرنے کے بعد اُلٹا منافع بچ رہتا ہی۔ چنانچہ سرکار ہند کا بیشتر قرضہ پیدا آور ہی۔ یعنی اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہی۔ لیکن کبھی کبھی سلطنتوں کو بحالت مجبوری غیر پیدا آور کاموں کے واسطے بھی قرض لینا بھی پڑتا ہی۔ مثلاً مصارف تاوان جنگ یا امداد قحط کے واسطے یا بصورت قلت محاصل معمولی مصارف کے واسطے ایسی سلطنت کی حالت بعینہ کسی خستہ حال اور مقروض رئیس کی سی ہوگی۔ غیر پیدا آور قرض اور اس کا سود محاصل سلطنت پر سراسر بار ہوگا۔ اور ملک کی ترقیات میں جس قدر ہارج ہو کم ہی۔

چونکہ اکثر ترقی یافتہ ممالک میں آئینی اور نیابتی حکومتیں قائم ہیں۔ سرکاری قرضہ پبلک لون یا قرض عامہ کہلاتا ہی۔ فنانس یعنی مالیات کی ضخیم کتابوں میں قرض عامہ کی پیچیدہ مگر دلچسپ بحث خاص توجہ اور غور سے مطالعہ کی جاتی ہی۔ جنگ یورپ کی بدولت قرض عامہ کا جال اس قدر پھیل گیا ہی کہ گھر گھر اس کے اصول و قواعد سمجھنے کی ضرورت پیش آرہی ہی۔ لیکن مفصل بیان کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہی۔

جو لوگ اسٹاک یا شیئر یعنی حصے خریدتے ہیں وہ کمپنی کو روپیہ قرض نہیں دیتے

بلکہ مالکان کمپنی کی جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یعنی قرض خواہ کے بجائے وہ کمپنی کے مالک شمار ہوتے ہیں۔ ان کو بشرح معین سود نہیں ملتا بلکہ منافع میں سے حصہ ملتا ہی جس کو اصطلاحاً مقسوم کہتے ہیں۔ کاروبار کی اچھی یا بُری حالت کے لحاظ سے مقسوم کی شرح بڑھتی گھٹتی رہتی ہی۔ مثلاً کسی سال سو سو روپیہ کے حصوں پر چھ روپیہ فی حصہ مقسوم ملے۔ اور کسی سال ممکن ہی کہ صرف تین روپیہ فی حصہ ملے۔ اسٹاک اور شیر میں تھوڑا سا فرق ہی۔ اوّل تو اسٹاک بالعموم درج شدہ ہوتا ہی۔ حالانکہ شیر کا درج شدہ ہونا ضروری نہیں بلکہ اکثر شیر دست گرداں ہوتے ہیں۔ دوم کمپنی سے اسٹاک خریدتے وقت رقم کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ کوئی چاہے تو شکستہ رقمیں مثلاً ۹۳-۲۱۱-۵۲۳ روپیہ کمپنی میں داخل کر کے اسی قدر رقم کا اسٹاک خرید لے۔ اس کے برعکس کمپنی سے خریدتے وقت شیر کی رقم معین اور بالعموم بستہ ہوتی ہی۔ مثلاً پچاس یا سو روپیہ۔ یا نسو یا ہزار روپیہ کا ایک حصہ۔ حصّے بھی مذکورۂ بالا تمسکوں کی مانند خرید و فروخت ہوتے ہیں جصّوں کی مقدار مقسوم تمسکوں کی مقدار سود کی طرح مُعین تو ہوتی نہیں۔ کمپنی کی موجودہ کاروباری حالت اور دو ایک گزشتہ سالوں کے مقسوم سے حصول کی آمدنی کا اندازہ کر لیا جاتا ہی مثلاً کسی کمپنی نے سو روپیہ کے شیر پر سال گزشتہ چھ روپیہ مقسوم نکالا۔ اور اس کا کاروبار اب بھی سرسبز ہی۔ اگر موجودہ بازاری شرح سود چار فیصدی ہو تو اس کمپنی کا سو روپیہ والا شیر آج کل ایک سو پچاس روپیہ کے قریب فروخت ہوگا۔ شکستہ رقموں کے حساب کرنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہی۔ مثلاً مذکورۂ بالا کمپنی کا ایک اسٹاک ہی جس کی اصلی رقم ۲۵۷ روپیہ ہی۔ گویا کسی نے کمپنی میں یہ شکستہ رقم داخل کر کے ایک اسٹاک لے لیا۔ اب اگر کمپنی سو روپیہ کے شیر پر چھ روپیہ سالانہ مقسوم نکالتی ہی۔ یا بالفاظ دیگر اسٹاک پر بشرح ۵ فیصدی مقسوم دیتی ہی۔ تو اسی حساب سے اس اسٹاک پر اکیس روپیہ

چھ آنہ آٹھ پائی سے کچھ زیادہ مقسوم ملے گا۔ اور اگر بازاری شرح سود چار فیصدی ہو تو اسٹاک مذکورہ کی قیمت ۵۳۵ روپیہ آٹھ آنہ ہو گی۔ اور اگر شرح ۵ فیصدی ہو قیمت ۴۶۴ روپیہ چار آنہ ہو گی اور اگر شرح پونے پانچ فیصدی ہو تو اسٹاک کی قیمت میں پائیاں تک شامل ہو جاتی ہیں۔ صاف ظاہر ہی کہ بستہ رقوم کے مقابل ایسی شکستہ رقموں کے حساب اور لین دین میں کس قدر طوالت اور دقت ہو گی۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ جو لوگ بونڈ یا ڈبنچر یعنی تمسک خریدیں وہ کمپنی کو روپیہ قرض دے کر اس کے قرض خواہ بن جاتے ہیں۔ اور تا ادائگی قرض بشرح مُعین سود پاتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اسٹاک یا شیر یعنی حصے خریدتے ہیں وہ کمپنی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر اس کے مالک شمار ہونے لگتے ہیں۔ اور منافع میں سے حصہ رسد مقسوم پاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کمپنی کو خسارہ پہنچے یا اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو اوّل زرِ تمسکات اور اس کے سود کی ادائگی لازم ہی۔ اس کے بعد اگر کچھ بچے تو وہ حصہ داروں کا حق ہی۔ گویا تمسک والوں کا مطالبہ حصہ داروں کے حق پر مقدم ہی۔ چنانچہ یہی وجہ ہی کہ حصوں کے مقسوم کی شرح تمسک کے سود کی شرح سے بالعموم بڑھی رہتی ہی۔ مثلاً اگر سو روپیہ کے تمسک پر چار فیصدی سود ملے تو روپیہ کے حصے پر پانچ روپیہ مقسوم کی توقع کی جائے گی۔ اس بیشی کو مطالبات خطر سمجھنا چاہیے۔ یوں کہنے کو تو تمسک حصہ سے زیادہ محفوظ ہی۔ تاہم کسی متزلزل کمپنی کے تمسک سے مستحکم کمپنی کا حصہ ہزار درجہ محفوظ ہی۔

جو لوگ چاہیں کہ ان کا اندوختہ کہیں ٹھکانے لگ جائے اور محفوظ بھی رہے اور اس سے کچھ مستقل آمدنی بھی حاصل ہو۔ ان کے واسطے کسی عمدہ کمپنی یا سلطنت کے بونڈ خریدنا بہت مناسب حال ہی۔ ان کی آمدنی مستقل ہوتی ہی۔ اور اگر درج شدہ ہوں تو

پھر گم ہونے یا چوری جانے سے نقصان پہنچنے کا ظن بھی کم رہ جاتا ہے۔ بوڑھوں، عورتوں اور نابالغوں اور ملازمت پیشہ لوگوں کے واسطے شغل اصل کا یہی طریق سب سے بہتر ہے۔

جن کو مستقل آمدنی اس قدر مطلوب نہ ہو بلکہ اضافہٗ اصل کی زیادہ خواہش ہو ان کے واسطے دست گرداں شیر خاص طور پر موزوں ہیں۔ چونکہ مقسوم میں نہیں ہوتا ان کی قیمتوں میں اکثر خاص تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کی خرید و فروخت میں بھی کوئی طوالت اور دقت نہیں۔ اگر کسی کو اس قسم کے کاروبار میں دسترس ہو تو کم قیمت پر حصے خریدے اور زیادہ قیمت پر فروخت کرتا رہے۔ چنانچہ لوگ اس طرح پر حصوں وغیرہ کی اُلٹ پھیر کر کے لاکھوں روپیہ کما لیتے ہیں۔ روپیہ کا ایسا کاروبار شغل اصل کے بجائے تخمین سے تعبیر ہوتا ہے۔

مندرجۂ بالا از حد سادہ اور مختصر خاکہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اصل کا کاروبار بھی کیسا وسیع اور دشوار فن ہے۔ چنانچہ شغل اصل کے متعلق انگریزی میں متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی شائع ہوتی ہیں۔ بھلی بُری کمپنیوں میں تمیز کرنا تمسکوں اور حصوں کی خوبیاں اور نقص سمجھنا۔ موقع اور محل پہچاننا یہ سب کچھ کیا آسان کام ہے؟ لوگ عمریں صرف کر کے یہ مہارت حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ تمسک اور حصوں وغیرہ کی خرید و فروخت بالعموم دلالوں کی معرفت ہوتی ہے جو اس کام میں بڑے تجربہ کار مُبصر اور ماہر ہوتے ہیں۔ دلالوں کی خیر طلبی اور خوش معاملگی ضرب المثل ہے۔ یہ اپنے موکلوں کو پوری نیک نیتی سے بہترین رائے اور مشورہ دیتے ہیں۔ اگر یہ خوبی نہ ہو تو لوگ اپنے لاکھوں روپیہ کے معاملات انکے ہاتھ میں کیوں دے ڈالیں؟ اور ان کے کاروبار کیونکر فروغ پائیں۔ ایمانداری ہی ان کی ترقی کا حقیقی راز ہے۔

حصہ سوم اپنا اندوختہ دوسروں کے سپرد کرنے کی جدید مفید صورتیں اوپر بیان ہوئیں اب
باب ۱۲ رہا لین دین کا قدیم طریق جس کا ہندوستان میں اب تک بہت رواج ہی یعنی ایسے
لوگوں کو سود پر روپیہ قرض دینا جو اس کو غیر پیدا آور کاموں میں صرف کریں اور
عمل پیدائش میں اس سے مدد نہ لیں۔ بالفاظ دیگر جو کہ زرِ مستعار کو بطور دولت صرف
کریں نہ کہ بطور اصل جیسا کہ قرض لے کر شادی، غمی یا عشرت پرستی میں روپیہ صرف
کیا جاتا ہی۔ اگرچہ قرض دہندہ کے نقطہ نظر سے یہ بھی شغل اصل ہی کیونکہ اس کو سود
ملتا ہی۔ لیکن معاشی، معاشرتی، اخلاقی، اور مذہبی غرضکہ چند در چند لحاظ سے ایسا شغل بیحد
ناجائز و معیوب ہی۔ اور بذریعہ قانون اس کو روکنے کی پھر کوشش ہو رہی ہی، ایسے لین
دین کا سود بدرجۂ اتم ربا ہوتا۔ سود و ربا کا علمی فرق سود کی سرگزشت میں اوپر بیان
ہو چکا ہی۔ ربا کی خرابیوں سے ہم آیندہ بعنوان "سود کا حاضر و مستقبل" مفصل بحث کریں گے۔

شغل اصل کی ایک قدیم اور مفید صورت یہ بھی ہی کہ اپنے اصل سے خود ہی کاروبار
جاری کر دے۔ یہ طریق اس قدر عام ہی کہ محض نظر انداز ہو جانے کے خوف سے اس کا
حوالہ ضروری سمجھا گیا۔ اس حالت میں کاروبار سے جو منافع حاصل ہوگا اس کا ایک جزو
اپنے اصل کا سود ہوگا۔ چنانچہ تیرھویں باب میں بعنوان منافع اس کی تفصیل موجود ہی۔

۵۔ سود کیا ہی؟ کس طرح پیدا ہو کر کس اصول کے مطابق تقسیم ہوتا ہی؟ ماہیت سود
کے متعلق ان سوالات پر بیحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہی جس کی تفصیل کے واسطے ایک
جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہی اور جس کے سمجھنے کے لئے معاشیات کی وسیع معلومات شرط
اوّل ہی۔ سود کے متعلق جو متعدد مسائل نکالے گئے ہیں وہ چند انواع میں مرتب ہو سکتے
ہیں۔ ایسے کل انواع کا مختصر بیان اور مسئلہ مقابلۃً صحیح ترین تسلیم ہو چکا ہی اس کی
مفصل بحث اس کتاب میں نہایت موزوں ہوگی۔

(ا) مسئلہ غصب۔ جس طرح کسی زمانہ میں صرف زمین عامل پیدائش دولت خیال کی جاتی تھی آجکل بھی بعض لوگ صرف محنت کو عامل پیدائش مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اصل دار غریب مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھینتا ہے جس کو سود کہتے ہیں۔ گویا سود محض ان نامساعد حالات کا نتیجہ ہے کہ مزدور بالعموم غریب ہوتے ہیں اور دولتمندوں کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنے کے سوائے ان کو کوئی چارہ نہیں۔ مزدوروں کو جو اُجرت ملتی ہے وہ ان کی مایحتاج زندگی سے بمشکل زاید ہو سکتی ہے اور محنت کی پیداوار سے یقیناً کم ہوتی ہے۔ پیداوار محنت اور اُجرت کا فرق بشکل سود اصل دار کی جیب میں جاتا ہے گویا اصل مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھیننے کا آلہ ہے۔ علمی تحقیقات سے یہ مسئلہ محض وہمی اور بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ کسی زمانہ میں اس مسئلہ کا بہت زور شور تھا لیکن اس کے حامیوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ بہرحال صرف یہی مسئلہ سود کا مخالف ہے۔ اس کے علاوہ باقی کل مسائل بالاتفاق سود کے موافق ہیں۔ اور صرف تشریح و توجیہ سود میں اختلاف کرتے ہیں۔

(ب) مسئلہ پیدا آوری۔ سود اصل کی اُن خدمات کا معاوضہ ہے جو پیدائش دولت میں وہ سر انجام دیتا ہے۔ عمل پیدائش دولت میں سود کا حصہ مسلم ہے۔ چنانچہ وہ عامل پیدائش مانا جاتا ہے۔ اور جس طرح کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ اُجرت کہلاتا ہے اصل کی خدمات کے معاوضہ کو سود کہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مسئلہ نہایت صاف اور صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن نظر غائر ڈالنے سے اس میں چند دقیق مگر اہم خامیاں نمایاں ہوں گی جن کی تشریح سے ہم یہاں معذور ہیں۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ سراسر غلط تو ہے نہیں مگر ادھورا اور غیر تشفی بخش ضرور ہے۔

(ج) مسئلہ اجتناب۔ انسانی خاصہ ہے کہ کسی چیز سے بوقت موجودہ لطف اُٹھانے

کو بمقابلہ مستقبل کے زیادہ دل چاہتا ہے۔ اور التوا لطف بہت گراں گزرتا ہے۔ اول تو پیدایش اصل کے واسطے پس اندازی۔ یعنی بعض موجودہ ضروریات ترک کرکے مستقبل ضروریات کے خیال سے کچھ بچانا شرط لابد ہے دوسرے اندوختہ سے بجائے دولت کے بطور اصل کام لینا۔ یعنی اس سے فوری احتیاجات رفع نہ کرکے مزید دولت پیدا کرنا گویا اس کی لطف اندوزی کو ملتوی کرنا ہے۔ پس پیدایش اور شغل اصل دونوں میں اجتناب مضمر ہے اور اجتناب کیا ہے۔ لطف اندوزی کے کام سے باز رہنا جیسے ہم مقدمہ میں واضح کرچکے ہیں یہ خدمت کی ایک شکل ہے اور ہر طرح پر دولت کہلانے کی مستحق پس سود معاوضہ ہے اسی خدمت اجتناب کا یعنی موجودہ خرچ سے کچھ بچانے کا اور اندوختہ کو فوری احتیاجات پر صرف کرنے کے بجائے اس سے مستقبل دولت پیدا کرنے کا۔ صریح واقعہ ہے کہ جب تک اندوختہ سے کچھ آمدنی کی اُمید نہ ہو بہت کم پس انداز کیا جاتا ہے اور منافع کی اُمید بغیر اندوختہ کاروبار میں لگانا یا کسی کو قرض دینا تو محال ہے۔ البتہ جو قرض براہ ہمدردی بلا سود دیا جاتا ہے وہ خارج از بحث ہے۔ لیکن ایسی مستثنیات بحد نایاب اور ناقابل لحاظ ہیں، حاصل کلام یہ کہ جو شخص کچھ روپیہ بچا کر کاروبار میں لگاتا ہے وہ فوری احتیاجات پر یہ روپیہ صرف کرنے سے باز رہنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے اور سود اسی خدمت اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اس مسئلہ کی رو سے پیدایش اصل بہت کچھ اور شغل اصل سراسر سود پر منحصر ہے۔ اور چونکہ پیدایش دولت میں اصل اس قدر معاون ہے سود دینا لابد اور درست ہے۔

اس واقعہ سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ ہر ایک شخص مقابلۃً موجودہ مساوی لطف اندوزی کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیتا ہے اور پیدایش و شغل اصل میں اجتناب مضمر ہے، لیکن سود کو اس خدمت اجتناب کا معاوضہ قرار دینا علمی حیثیت سے کافی طور پر تشفی بخش

اور قابل تسلیم نہیں۔ اس مسئلہ پر چند دقیق اور مسکت اعتراض عائد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اجتناب کی خدمت غائب ہو جاتی ہے۔

لطف اندوزی حاضر کو مستقبل پر ترجیح دینے کا انسانی خاصہ تو بالکل درست ہے لیکن اس مسئلہ میں اس سے جو توجیہ کی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ بہتر توجیہ ہم آگے چل کر مکمل ترین مسئلہ کے ضمن میں بیان کریں گے۔

(د) مسئلہ محنت۔ بعض نے پس اندازی و شغل اصل کو سیدھے سادھے طور پر محنت قرار دے کر سود کو اصل دار کی اس محنت کا معاوضہ یا اُجرت قرار دے دیا۔ یہ مسئلہ بھی مسئلہ اجتناب سے ملتا جلتا مگر اس سے زیادہ سادہ ہے۔ مذکورہ بالا مسائل سے سود کے بجا اور درست ہونے کی تائید تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان میں سود کی علمی تشریح و توجیہ بالکل ادھوری اور غیر تشفی بخش نظر آتی ہے۔

مذکورۂ بالا مسائل کے علاوہ چند اور مسائل بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض تو قطعاً رد ہو چکے ہیں اور محض تاریخی لحاظ سے سود کی بحث میں ان کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور بعض مذکورۂ بالا مسائل کے عجیب عجیب مُرکّب ہیں جن میں اُن کی خامیاں بھی بدرجہ اولیٰ موجود ہیں۔

اب ہم سود کا وہ آخری مسئلہ ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں جو مقابلتہً مکمل ترین خیال کیا جاتا ہے۔ اور یہ بھی جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ فی نفسہ ابھی خود یہ مسئلہ بھی تکمیل طلب ہے۔ اس مسئلہ کے حامیوں میں بھی باہم اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مسئلہ کی موجودہ شکل بعینہٖ کسی ایک مصنف کی کتاب میں نظر آنی محال ہے مطالعہ اور غور سے پورا پورا کام لے کر اس مسئلہ کے بیان میں ہم نے دع ما کدر خذ ما صفا کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا اگرچہ یہ مسئلہ بعض سے ملتا جلتا لیکن ہر ایک سے جدا نظر آئے

حصہ سوم
باب ۱۲

تو عجب نہیں۔ کتاب ہذا میں یہ طریق ناگزیر معلوم ہو اور نہ مسئلہ سود کی بحث کے واسطے ضخیم کتاب اور اس کے سمجھنے کے واسطے معاشیات میں بہت کچھ وسعت معلوم لابد ہے۔

سود کی سب سے بہتر علمی تشریح و توجیہ اصل کے دو مسلم خواص سے متعلق معلوم ہوتی ہے ایک انتظارکشی جو اصل سے کام لینے میں کم و بیش لاحق ہوتی ہے دوسرے پیدا آوری، جو اصل کا لابد خاصہ ہے اور جس کی بدولت وہ عامل پیدایش شمار کیا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل تفصیل سے واضح ہو گا کہ انتظارکشی سود کا باعث اور پیدا آوری اس کا منبع ہے علیٰ ہذا اصل کی رسد و طلب بھی انھیں خواص سے علی الترتیب متعلق ہے۔

انتظار کشی

۶۔ بعض لوگوں کے پاس تو اس قدر دولت ہوتی ہے کہ اُن سے خرچ کیے بن نہیں پڑتا جبکہ تمام موجودہ ضروریات حاصل ہوں تو باقی ماندہ دولت کو پس انداز کیے بغیر کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ بلکہ بعض زیادہ اہم مستقل احتیاجات رفع کرنے کے خیال سے اگر چند موجودہ ضروریات ترک کر کے بھی لوگ کچھ اندوختہ جمع کریں تو عجب نہیں چنانچہ واقعہ ہے کہ حسب حیثیت لوگ بالعموم علالت و پیری کے خیال سے موجودہ آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اندوختے لوگ خود بخود پس انداز کرتے ہیں ان کو مزید معاوضہ کی ترغیب ضروری نہیں بلکہ ایسے اندوختوں کی نگہداشت کا کوئی معاوضہ وہ اپنی گرہ سے دینے پر بھی رضامند ہو جائیں تو عجب نہیں۔ چنانچہ جبکہ شغل اصل کا میدان نہایت تنگ تھا۔ بنک رقم داخل شدہ کی تحفظ و نگہداشت کا معاوضہ داخل کنندوں سے اُلٹا وصول کرتے تھے۔ اب تک پس اندازی دو حالتوں تک محدود تھی۔ اوّل جبکہ دولت کی اس قدر افراط ہو کہ بمقابلہ چند موجودہ احتیاجات کے آیندہ زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنی یقینی ہوں۔ لیکن معاشی ترقیات کی بدولت جبکہ شغل اصل کے مواقع بحد کثیر اور وسیع ہو گئے ہیں۔ ایک جدید تیسری قسم کی پس اندازی

شروع ہوئی یعنی بلا زیادتی دولت و لحاظ احتیاجات مستقبل محض مزید معاوضہ کے لالچ سے موجودہ احتیاجات دبا دبا کر لوگوں نے پس اندازی شروع کر دی۔ ایک شخص سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ سو روپیہ آج لینا چاہتا ہے یا ایک سال کے بعد۔ اب اگر اس کو اس وقت کوئی احتیاج ہی درپیش نہ ہو یا آیندہ احتیاجات موجودہ سے زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنے کا یقین ہو تو بشرطیکہ اس کو پورا اعتماد بھی ہو وہ رقم مذکورہ سال بھر میں لینا زیادہ پسند کرے گا۔ بلکہ امانت داری کا کچھ معاوضہ بھی اپنی گرہ سے دے تو عجب نہیں۔ لیکن بحالت سوم اگر اس کو موجودہ احتیاجیں دبا رہی ہوں تو اُن کو رفع کرنے کی غرض سے وہ اس رقم کی ادائگی حاضر کو مستقبل پر ضرور ترجیح دے گا۔ البتہ اگر کچھ مناسب اضافہ کا وعدہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ حال کے بجائے ایک سال ہی بعد لینا گوارا کرے۔ اس واقعہ سے ایک عام اصول واضح ہوتا ہے کہ بحالت احتیاج کسی چیز کے ملنے کے وقت میں جس قدر بُعد ہو گا اسی قدر موجودہ معیار کے مطابق اس کی قدر گھٹ جاوے گی۔ اسی کو خاصۂ انتظارکشی کہتے ہیں۔ اگر شخص مذکور اس وقت سو روپیہ یا ایک سال بعد ۱۰۵ روپیہ لینے پر یکساں رضامند ہو تو گویا اس وقت ایک سال بعد ملنے والے ۱۰۵ روپیہ کی قدر اس کے نزدیک فوراً ملنے والے سو روپیہ کے برابر ہے۔ لیکن واضح ہو کہ سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۵ روپیہ کی قدر موجودہ سو روپیہ کی قدر سے بمقدار ۵ روپیہ زائد ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سال بھر انتظار کرنے پر وہ رضامند کیوں ہونے لگا تھا گویا اس وقت تو ان ۵ روپیوں سے بمقابلہ ۱۰۰ روپیہ حاضر کے ۱۰۰ روپیہ مستقبل کی قدر کی موجودہ تخفیف کی تلافی ہوتی ہے۔ لیکن سال بھر بعد جبکہ بوقت حصول بھی ۱۰۰ روپیہ مستقبل ۱۰۰ روپیہ حاضر کے مساوی القدر ہو جاویں تو وہ ۵ روپیہ سود بن جاویں گے یا بالفاظ دیگر ۱۰۵ روپیہ مستقبل کی موجودہ قدر سو روپیہ حاضر کے

برابر ہی۔ اور سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۰ روپیہ حاضر سے بقدر ۵ روپیہ زائد ہوگی یہی ۵ روپیہ جو اس وقت تخفیف قدر کی تلافی کرتے ہیں اُس وقت بطور قدر مزید سود شمار ہوں گے۔

پس صاف ظاہر ہی کہ سود کا باعث انتظار کشی ہی۔ اور انتظار کشی اکثر اصل کی پیدائش اور تمام اصل کے شغل سے لاینفک ہی۔ چند دولتمندوں کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ بھوڑی بہت موجودہ احتیاجات دبائے بغیر پس انداز کم کر سکتے ہیں۔ رہا شغل اصل۔ خواہ اندوختہ کچھ عرصہ کے واسطے قرض دیا جائے یا زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں لگایا جائے اس کی واپسی ہمیشہ قریب یا بعید مستقبل میں ہوگی۔

جو اندوختہ محض بوجہ زیادتی دولت یا بخیال اہمیت احتیاجات مستقبل جمع ہوتا ہی اگر موجودہ کاروباری ضروریات کے لیے کافی ہوتا تو نہ انتظار کشی کا کوئی دخل ہوتا نہ اصل دار کی زیادہ پروا کی جاتی۔ لیکن حقیقت یہ ہی کہ آج کل تو اُمرا اس اصل کا عشر عشیر بھی مُہیّا نہیں کر سکتے جو عوام اور متوسط الحال لوگوں کے اندوختوں سے ملتا ہی۔ اور آخر الذکر طبقہ کے اصل کی پیدائیش و شغل میں انتظار کشی کو بہت بڑا دخل ہی، بلا اُمید منفعت سود نہ تو یہ لوگ اس قدر پس انداز کر سکتے ہیں اور نہ اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی قرض دینے یا کاروبار میں پھنسانے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ اور موجود کاروبار ضروریات کے لحاظ سے اُن کا اصل بھی ناگزیر ہی۔ پس ان کو سود دینا لابد ہوا۔ اور جب اُن کو سود ملنے لگا تو پھر دولتمند اپنے اصل کا سود کیوں طلب نہ کریں۔ کام تو ان کا اصل بھی وہی کرتا ہے جو دوسروں کا۔ پھر کیا وجہ کہ اس پر سود نہ دیا جائے۔ آجر کو اس سے کیا بحث کہ آیا اس کی پیدائش اور شغل میں انتظار کشی مضمر ہی یا نہیں۔ اس کو تو صرف اصل کے کام سے تعلق ہی اور بس۔ لہٰذا بلا تفریق موجودگی و عدم موجودگی انتظار کشی ہر قسم کے اصل پر سود دیا جانے لگا۔ لیکن سود کا حقیقی باعث پھر بھی انتظار کشی ہی۔

(۷) پیداآوری بھی اصل کا جدید خاصہ ہے اس کی جا بجا تفصیل بھی کی جا چکی ہے (۴-۵/۳ و ۱/۴) مختصراً یہاں بھی تشریح کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک درزی جو ہاتھ کی سلائی سے آٹھ آنہ روز کما سکے سنگر مشین کی مدد سے بارہ آنہ روز کمائے تو چار آنہ کی پیداوار اصل مشین سے منسوب کرنا بیجا نہ ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ اصل کی پیداآوری ثابت کرنے کے لیے چار آنہ کا محض پیدا ہونا کافی نہیں۔ دوران شغل میں اصل قائم برابر فرسودہ ہوتا رہتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ میں بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔ ابتدائے استعمال کے وقت سے بیکاری کے وقت تک اس پیداوار میں سے جو استعمال اصل کا نتیجہ ہو مطالبات فرسودگی ایسی شرح سے منہا کرتے رہتے ہیں کہ کل اصل واپس آجائے پس اگر ایسی پیداوار مطالبات فرسودگی سے کمتر ہو تو گویا اصل پھر واپس بھی نہیں آسکتا اور اس کے استعمال میں سراسر نقصان ہے اگر مطالبات فرسودگی کے مساوی ہو تو کچھ عرصہ میں صرف اصل واپس آجائے گا۔ استعمال سے اصول انتظارکشی کے مطابق پھر بھی نقصان رہے گا۔ البتہ اگر مطالبات فرسودگی سے ایسی پیداوار کچھ زائد ہو تو بیشک وہ پیداآوری اصل کا ثبوت ہوگی اور پیداوار اصل کہلانے کی مستحق۔ تجربہ شاہد ہے کہ شغل اصل سے علاوہ مطالبات فرسودگی کے مزید پیداوار بھی حاصل ہوتی ہے جس میں سے بالعموم سود ادا کیا جاتا ہے یہی پیداآوری ہے جس کی بدولت لوگ خوشی خوشی بمقدار کثیر سود پر قرض لے کر اصل مستعار سے کاروبار چلاتے ہیں اور سود ادا کرنے پر بھی منافع اُٹھاتے ہیں۔ اگر اصل سے پیداوار میں جداگانہ اضافہ نہ ہوتا تو لوگ اس قدر شوق سے قرض لے کر اس کو کیوں کام میں لاتے اور سود کے فضول کیوں زیر بار ہوتے۔ البتہ جو لوگ روپیہ قرض لے کر مجبوری یا بخوشی غیر پیداآور کاموں میں صرف کرتے ہیں جیسا کہ بحالت افلاس قرض لے کر بسر اوقات کرنا۔ یا آوارہ مزاج رئیسوں کی طرح رنگ رلیاں

حصہ ۱ باب ۱۲ پیداآوری

منانا۔ ایسے اصل میں قرض دہندہ کی طرف سے تو انتظار کشی موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ سود کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن قرض گیر کے ہاتھ میں آکر ایسا اصل محض دولت رہ جاتا ہے، اس سے پیدا آوری مفقود ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ خود مع سود اس پر بار گراں بن کر تباہی کا باعث ہو جاتا ہے، اب اگر محض اس بنا پر کہ اصل مستعار سے پیدا آوری کا کام نہیں لیا گیا تھا قرض دہندہ کو سود سے محروم کیا جائے تو وہ قرض دینے سے انکار کر دے گا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ایسی قانونی بندش سے لین دین رُک سکتا ہے۔ ایسے قرض گیر جو نہایت نا عاقبت اندیش ہوتے ہیں طرح طرح کی تدابیر نکال کر قرض لیے بغیر نہ رہیں گے۔ البتہ قانونی گرفت کے خوف سے قرض دہندہ شرح سود کو اور بھی بڑھا دیں گے۔ اور اس اضافہ کو مطالبہ خطر کہیں گے۔ جس کی تشریح ہم اقسام سود کے تحت میں آیندہ کریں گے (۹/۱۲)

اگر قرض دہندہ کو قانوناً سود سے محروم کر کے قرض دینے سے روکنے کے بجائے بذریعہ قانون قرض خواہ کو روکا جائے تو نتیجہ زیادہ حسب دلخواہ ہوگا۔

محتاجوں کو اور رفاہ عام کے کاموں کے واسطے بلا سود قرض دینا۔ آوارہ لوگوں کو قرض دینے سے انکار کرنا معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے نہایت ضروری اور پسندیدہ ہے لیکن اس کی مثال اس قدر نایاب ہے کہ معاشی معاملات پر اس کا اثر قابل لحاظ نہیں ہو سکتا اسی طرح غریبوں سے بیحد زیادہ شرح سے سود لے کر چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض دے کر ہمیشہ کے واسطے اُن کی کمائی کا شریک غالب بن جانا یا شوق دلا دلا کر بھولے بھالے وارستہ مزاج رئیس زادوں کو قرض دے کر اُن کی جائداد ضبط کر لینا سوسائٹی کے حق میں اس قدر خطرناک اور اخلاقی لحاظ سے مذموم ہے کہ قانوناً اس کی بندش اشد ضروری بھی ہے اور ممکن بھی، سود کے بھلے بُرے نتائج سے ہم آیندہ سود کے حاضر و مستقبل کے

حصہ سوم تحت میں بحث کریں گے (۱۱/۱۲) یہاں صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ سود انتظار کشی اور
باب ۱۲ پیدا آوری کا آفریدہ ہے اور یہ دونوں خواص شغل اصل میں مضمر ہیں۔ لہٰذا سود بھی شغل اصل سے لاینفک رہا۔

شرح سود (۸) جیسا کہ شرح اُجرت کے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے (۶/۱۰) اصل بھی قانون تقلیل حاصل کا پابند ہے۔ یعنی کسی کھیت یا مزدوروں کی جماعت میں جو اصل استعمال ہوتا ہے حسب دلخواہ کسی مقدار تک اس کا اضافہ کر کے اسی نسبت سے پیداوار میں بھی اضافہ ممکن نہیں۔ خواہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت اصل کے جرعے استعمال کرتے کرتے ایک ایک ایسا جرعہ ملے گا کہ اس کے مابعد جرعوں کی پیداوار درجہ بدرجہ گھٹتی چلی جاوے گی۔ مثلاً کاشتکار اپنے کسی کھیت میں دس روپیہ کا کھاد ڈالے یا بیج بوئے یا پانی لگائے اب اگر ان مدوں میں چوگنا اصل لگائے تو پیداوار کا چوگنا ہونا غیر اغلب ہے۔ اسی طرح کسی درزی کی دوکان میں جب دو سنگر مشین استعمال ہوتی ہیں تو چار آنہ روز فی مشین ملتا ہے اب اگر دو مشینیں اور بڑھا دی جائیں تو ان پر بمشکل دو تین آنہ مل سکیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ دیگر عاملین پیدائش زمین محنت کے مقابلہ میں اصل کی مقدار جس قدر بڑھے گی پیداآور اصل کی شرح گھٹتی جائے گی۔ اور شرح اُجرت کی طرح شرح سود بھی کمترین پیداوار کے مساوی قرار پائے گی۔

زمین کی وسعت تو تقریباً معین ہے۔ اس میں اضافہ کی برائے نام بھی گنجائش نہیں۔ محنت کے اضافہ میں بھی دیر لگتی ہے اور وبا، قحط، جنگ جیسے عاملین موت اس کی کاٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں لیکن اصل کے اضافہ کا کیا کہنا نہ سرگ بیل اس قدر پھیلے نہ مچھلی کی نسل اس قدر بڑھے گزشتہ صدی میں نہ معلوم اصل کے سَو گنا ہو گیا ہو گا اور جس قدر بڑھتا ہے ساتھ ساتھ قوت اضافہ اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے اصل کی مقدار

 بڑھ رہی ہے جس کی پس اندازی و شغل میں انتظارکشی مضمر نہیں ایسی اصل کی مقدار جس قدر
 بڑھے گی انتظارکشی والی اصل کی جانشین بن کر اس کی مقدار مطلوبہ کی تخفیف کا باعث ہوگی اور جس قدر آخر الذکر اصل کی مقدار کم ہوگی ادنیٰ شرح سود پر اصل ملنا آسان ہوگا علاوہ ازیں قیام امن و امان اور عام بیداری کی بدولت خود انتظارکشی کا اثر کمزور ہو رہا ہے یعنی بہ نسبت سابق اب لوگ کمتر معاوضہ پر اپنا اندوختہ قرض دینے یا کاروبار میں لگانے پر رضامند پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ یا ادنیٰ شرح سود پر شغل اصل گوارا کرنا بھی معاشی ترقی و پس ماندگی کی علامت مانی جاتی ہے۔ اضافہ اصل کے ساتھ ساتھ معاشی ترقیات کی بدولت شغل اصل کے واسطے بھی نئی نئی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اور قانون تقلیل حاصل کے مقابلہ میں نت نئی ایجادات اصل کی قوت پیدا آوری بڑھا رہی ہیں۔ ایک طرف تو طلب اصل، زراعت صنعت و حرفت، تجارت اور عام کاروباری حالت پر منحصر ہے۔ دوم کثرت اندوختہ معاشی ترقیات اور عام بیداری کا رسد اصل پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اور پھر طلب و رسد میں بہت کچھ باہمی انحصار موجود ہے اور اُن کے عمل میں کوئی تقدم و تاخر مقرر نہیں۔ ایسی حالت میں شرح سود کے کل اسباب کا جداگانہ تعین محال ہے۔ صحت کے ساتھ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ شرح سود طلب و رسد اصل کے باہمی عمل سے مقرر ہوتی ہے۔ لیکن اتنا تحقیق ہے اور علمی لحاظ سے یہ واقفیت نہایت اہم ہے کہ مقدار سود بالعموم اصل کے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔

یہ ایک نہایت دقیق اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ چونکہ سود قلت اصل کا نتیجہ ہے۔ یعنی انتظارکشی والا اصل ناگزیر ہے کسی زمانہ میں کثرت اصل کی بدولت یعنی جبکہ غیر انتظارکشی والا اصل کاروباری ضروریات کے واسطے کافی ہوگا سود بھی غائب ہو جائے گا؟ یہ تو رسد کا پہلو تھا۔ ادھر طلب کے پہلو پر بھی بوجہ کثرت اصل پیداوار مختتم میں تخفیف ہوتے ہوتے صفر رہ جائے گا۔ بالفاظ مختصر سود محض موجودہ حالات کا آفریدہ ہے' پیداوار کا مستقل حصہ قرار نہیں پا سکتا'

شرح سود برابر گھٹ رہی ہے۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں ایک گروہ کا حصہ سوم
خیال ہے کہ وہ کبھی بالکل غائب ہو جائے گا۔ دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ایک خاص حد پر باب ۱۲
موجودہ تخفیف ضرور رُک جائے گی اور سود ہمیشہ برابر جاری رہے گا اور وہ پیداوار کا مستقل حصہ ہے' سود دائمی ہے یا عارضی اس کا فیصلہ تو بہت بحث طلب اور دشوار ہے۔ لیکن عرصہ دراز تک اس کا رواج جاری رہنا تو بہر حال یقینی ہے۔

تمام مذکورۂ بالا بحث سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ شرح سود معاشی اسباب سے خود بخود مقرر ہو جاتی ہے وہ محض رواج یا قانون کی آفریدہ نہیں۔ اور معاشی شرح سود میں قانونی مداخلت بیکار بلکہ مضر ہوتی ہے۔ لیکن پس ماندہ ممالک میں جہاں معاشی اسباب کا اثر ضعیف ہے اور اب تک قدیم طرز پر غیر پیدا آور کاموں کے واسطے زر نقد کا لین دین ہوتا ہے سود بالعموم قرض گیر کے احتیاج کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے قرض لاچاری اور مجبوری کے ہوتے ہیں اور مثل مشہور ہے مرتا کیا نہ کرتا جب کسی کو قرض لیے بغیر چارہ ہی نہیں تو شرح سود پر ردو قدح کرنے کی اس کو کہاں سے جرأت ہو سکتی ہے۔ زیادہ شرح جس کا وہ بظاہر متحمل ہو سکتا ہے۔ قرض دہندہ اس سے طلب کرتا ہے اور اس کو بھی منظور کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لین دین کی مضرتوں سے ہم آیندہ سود کے حاضر و مستقبل کے تحت میں مفصل بحث کریں گے (۱۱/۱۲) یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی شرح سود قانوناً محدود مقرر کرنا ممکن بھی ہے اور از حد مفید بھی۔

اصطلاحی زبان میں مذکورۂ بالا بحث کا لُبّ لباب یہ ہے کہ شرح سود معاشی اسباب کے تابع ہوتی ہے اور قانونی نگرانی کی محتاج نہیں لیکن شرح ربا بیشتر قرض گیر کی شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی قوت دست برد کے مطابق ہوتی ہے اور بذریعہ قانون اس کے حدود مقرر کرنا بیحد مفید اور اشد ضروری ہے۔

(۹) سود کی دو قسمیں ہیں سود خام و سود خالص سود خام میں علاوہ سود خالص کے اقسام سود

کے جس کی ماہیت مسائل سود کے تحت میں واضح کی جا چکی ہے۔ بعض اور مدین بھی خصوصاً **مطالبات خطر و مطالبات فرسودگی** شامل ہوتی ہیں۔ کاروباری مقابلہ کی آزادی اور اصل کے سریع الانتقال ہونے کی بدولت سود خالص کی شرح تقریباً ہر جگہ ایک ہی سطح پر پائی جاتی ہے۔ یہ جو ۳ فیصدی سے لے کر ۲۰۔ ۲۵ فیصدی تک شرح میں فرق پھیلا ہوا ہے۔ یہ درحقیقت سود خام سے متعلق ہے۔ جن کاروبار میں اصل ضائع ہونے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یا فرسودگی اصل کی رفتار تیز تر ہے اور اصل بھی بیش قیمت ہے تو سود خالص عام شرح کے مطابق ہونے کے باوجود بھی مطالبات خطر و فرسودگی کی زیادتی کی وجہ سے سود خام کی شرح بہت ہو جائے گی اور مذکورۂ بالا مطالبات ملے بغیر کوئی اپنا اصل ایسے کاروبار میں کیوں لگانے لگا۔ بمقابلہ زر رہن کے قرض پر زیادہ سود طلب کیا جاتا ہے، خوش حال لوگوں کو بمقابلہ عوام کے کمتر شرح سود پر قرض ملتا ہے۔ کمتر شرح سود پر بھی لوگ قدیم اور معتبر بنکوں ہی میں روپیہ داخل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے نئے بنکوں کو زر داخلہ پر شرح سود بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ شرح سود کے ایسے فرقوں کا باعث مطالبات خطر کی کمی بیشی ہوتی ہے۔ بعض کاروبار ایسے ہیں کہ ان پر خاص طور پر نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے مثلاً شیشہ آلات یا اونی اور زردوز کپڑوں کی تجارت کہ ذراسی بد احتیاطی سے ہزارہا روپیہ کا سامان ٹوٹ پھوٹ کر یا کرم خوردہ اور ماندہ ہو کر اکارت ہو جاتا ہے۔ ایسے کاروبار میں بھی باقاعدہ مطالبات خطر ملتے رہنے ضروری ہیں تاکہ اُن سے اتفاقی نقصانات کی تلافی ہوتی رہے۔ ورنہ کچھ عرصہ بعد کاروبار جاری رکھنا محال ہوگا۔ اصل دائر مثل کوئلہ و پیداوار خام تو عمل پیدائش میں اوّل ہی مرتبہ اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آ جاتا ہے۔ لیکن عمارت و مشین جیسا اصل قایم عرصہ دراز تک عمل پیدائش سر انجام دے کر مدت میں واپس ہوتا ہے۔ لیکن دوران عمل پیدائش میں وہ برابر کہنہ اور فرسودہ ہوتا

رہتا ہی حتی کہ کچھ عرصہ میں وہ بالکل بیکار ہو جاتا ہی۔ لہذا اس وقت تک اس کی واپسی بھی ضروری ہی۔ پس قاعدہ یہ ہی کہ کچھ فیصدی سالانہ بطور مطالبات فرسودگی شمار کیا جاتا ہی۔ تاکہ بتدریج کل اصل قائم اس کی ناکارگی کے وقت تک واپس آجائے۔ اصل قائم جس قدر بیش قیمت اور سریع الزوال ہوگا مطالبات فرسودگی بھی زیادہ ہوں گے۔ بصورت دیگر مطالبات کی مقدار بھی بہت کم ہوگی

پس معلوم ہوا کہ سود خام میں علاوہ سود خالص کے جس کی شرح کم و بیش مساوی ہو مطالبات خطر و فرسودگی بھی خاص طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان مطالبات کی مقدار کاروبار کی نوعیت سے متعلق ہوتی ہی۔ سود خام میں بیحد فرق پایا جاتا ہی۔

یہاں یہ نکتہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہی کہ کہیں کہیں سود خالص کی شرح بھی معمولی سے اعلیٰ پائی جاتی ہی۔ لیکن یہ اس حالت میں ممکن ہی جبکہ کاروبار متعلقہ میں اجارہ حاصل ہو یعنی وہ مقابلہ کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ اجارہ و مقابلہ سے ہم آیندہ بحث کریں گے ($\frac{۲-۱}{۱۹}$) یہاں صرف یہ بتانا کافی ہو کہ مقابلہ کی خاصیت قیام مساوات ہی خواہ اجرت میں یا سود و قیمت میں۔ اس کے برعکس اجارہ داران میں اپنے موافق فرق بھی پیدا کر سکتا ہی۔ لیکن یہ شرح صرف کاروبار کے قدیم شرکا کے نزدیک اعلیٰ شمار ہو سکتی ہی۔ جدید شرکا کے حق میں وہ بھی معمولی سطح پر آرہتی ہی۔ اس کی تفصیل یوں ہی کہ اگر کسی کاروبار میں بغایت اعلیٰ شرح سود خالص حاصل ہو رہی ہو تو مروجہ شرح کے حساب سے ایسے کاروبار کے حصص کی قیمت صحیحہ بھی بڑھ جاوے گی۔ اور جدید شرکا کو وہی معمولی شرح مل سکے گی مثلاً کسی کارخانے میں شرح سود خالص پندرہ روپیہ ہوا اور معمولی شرح ۵ روپیہ تو ایسے کارخانہ کے سو سو روپیہ قیمت متعارف والے حصے میں تین تین سو روپیہ میں فروخت ہو کر خریداروں کو معمولی شرح سے سود دیں گے۔ البتہ قدیم شرکا کو اب بھی ۱۰۰ روپیہ پر ۱۵ فیصدی ملے گا لیکن اُن کے قدیم ۱۰۰ روپیہ بھی اب ۱۰۰ روپیہ نہیں رہے

حصہ سوم
باب ۱۲

بلکہ تین سو کے مساوی ہوگئے لہٰذا اصل کی موجودہ قیمت کے مطابق اُن کو بھی ۵ فیصدی ہی ملتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کارخانہ کی شرح سود ادنیٰ ہو تو حصص کی قیمت صحیحہ قیمت متعارفہ سے گھٹ کر شرح سود معمولی شرح تک بلند کردے گی۔ حاصل کلام یہ کہ سود خالص کی شرح کم و بیش ہر جگہ مساوی پائی جاتی ہے۔ جو کچھ فرق نظر آتا ہے اکثر سود خام سے متعلق ہے۔

سود و ربا اور سود خام و سود خالص کا فرق ظاہر ہوگیا۔ اب ہم سود کی ایک اور تفریق بتانا چاہتے ہیں جو کاروبار کی اصطلاحی زبان سے متعلق ہے۔ اصل قرض دے کر جو معاوضہ بشرح مُعیّن فیصدی سالانہ ہم قرض دار سے پاتے ہیں وہ سود کہلاتا ہے لیکن اگر کسی انجمن سرمایہ مشترک کے حصہ دار بن کر ہم کاروبار کے نفع نقصان میں یکساں شریک رہیں اور غیر مُعیّن شرح سے حسب حالات شغل اصل کا معاوضہ پائیں تو وہ اگرچہ سود سے مختلف نہیں لیکن کاروباری زبان میں مقسوم کہلادے گا اور اگر بلا شرکت غیرے ہم اپنے اصل سے خود کاروبار چلائیں تو اس کا سود منافع میں شمار ہوگا جو سود کہ بشکل مقسوم یا منافع حاصل ہوتا ہے اس کی شرح غیر معیّن ہوتی ہے اور بمقابلہ اضافہ تخفیف کا اندیشہ زیادہ دامنگیر رہتا ہے اس وجہ سے ان میں علاوہ مطالبات خطر و سود کے مطالبات ضمانت بھی شامل ہوتے ہیں تاکہ کمی سود کی تلافی ہوتی رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان کی شرح عام مروجہ شرح سود سے کسی قدر اعلیٰ ہوتی ہے۔ لیکن بحیثیت سود خالص سب تقریباً ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں۔

زر و سود کا تعلق

(۱۰) زر کی ماہیت اور اس کے اصول و مسائل سے مبادلہ دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف زر و سود کا رشتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ آیندہ مفصل بحث سے بخوبی روشن ہوگا (۳/۲) زر کی تین حیثیتیں ہیں وہ آلہ مبادلہ زر معیار قدر ہے اور تیسرے خزینۃ القدر بالفاظ دیگر زر سے ہر چیز کا مبادلہ ہوسکتا ہے اور اسی وجہ سے

اس کو بدلے میں لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں چوں کہ زر کا مبادلہ بالکل عام ہے اس کے وساطت سے مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا باہمی مقابلہ ممکن ہو اور بشکل زر ہی لوگ اندوختہ جمع کرتے ہیں ۔مثلاً روپیہ سے ہم غلہ، شکر، نمک، کپڑا، جوتا غرضکہ دنیا بھر کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر غلہ کا نرخ چار روپیہ من اور شکر کا آٹھ روپیہ اور نمک کا دو روپیہ من ہو تو قیمت کے مقابلہ سے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ دو من غلہ ایک من شکر اور چار من نمک مساوی القیمت ہیں اور چند در چند آسانیوں کی وجہ سے بجائے دیگر اشیاء کے لوگ بالعموم روپیہ پس انداز کرتے ہیں۔ البتہ اندوختہ سے بعد کو اور چیزیں خریدنا اختیاری ہے۔ زر کی مذکورہ بالا تین حیثیتوں سے شرح سود کا بھی قابل توجہ تعلق ہو۔ چوں کہ دولت بشکل زر بیشتر پس انداز کی جاتی ہو اور زر میں یہ خوبی ہو کہ حسب دلخواہ اس کا ہر چیز سے مبادلہ ممکن ہو اصل کا لین دین بشکل زر ہوتا ہے۔ اور زر کے حوالہ سے فیصدی سالانہ سود شمار کیا جاتا ہو۔ درحقیقت تو اصل سے وہ آلات۔ عمارات۔ پیداوار خام وغیرہ مراد ہوتی ہو جو عمل پیدائش میں کام آئے۔ لیکن حساب کتاب اور علمی مباحث میں اصل ہمیشہ بشکل زر شمار کیا جاتا ہو۔ اوپر ہم یہ بھی سمجھا چکے ہیں کہ سود خالص کی شرح آج کل ہر جگہ کم و بیش مساوی پائی جاتی ہو اور اصل بشکل سامان شرح مروجہ کے حساب سے اپنی مقدار سود کے مطابق اصل بشکل زر منتقل کیا جاسکتا ہو مثلاً کسی مشین سے چار روپیہ خالص سود سالانہ حاصل ہوتا ہو۔ اب اگر عام شرح ۳ فیصدی ہے تو یہ مشین ۱۳۳ روپیہ زر اصل کے مساوی شمار ہوگی اور اگر ۵ فیصدی ہو تو ۸۰ روپیہ کے برابر۔ ہر ایک اصل خواہ دائر یا قائم اول بوقت شغل اکثر زر ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہی کہ زر چونکہ عام آلۂ مبادلہ ہے۔ اصل بشکل زر از حد سریع الانتقال ہے جہاں موقع دیکھتا ہے جا پہنچتا ہی اور شرح سود سطح آب کی مانند ہموار رہتی ہے حتی کہ اصل قائم بھی مساوات شرح کے اثر سے اپنی شکل زر بدلتا رہتا ہی۔ حاصل کلام یہ کہ اصل یوں تو

بکثرت سامان و آلات کی شکل میں موجود ہے۔ لیکن لین دین اور علمی مباحث میں وہ ہمیشہ بہ لباس زر پیش کیا جاتا ہے۔

زر کی تیسری حیثیت بھی کہ وہ معیار قیمت ہے۔ شرح سود سے ایک نہایت دلچسپ تعلق رکھتی ہے۔ زر یوں تو عام آلہ مبادلہ ہے کہ اس سے دنیا کی ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں لیکن فی نفسہ زر سے ہماری کوئی احتیاج رفع نہیں ہوسکتی ہے زر کیا ہے سونے چاندی اور تانبے کے سکے یا کاغذ کے پرزے کہ جن کو نہ ہم کھا سکتے ہیں نہ پی سکتے ہیں نہ اوڑھ پہن سکتے ہیں نہ جن سے براہ راست ہماری اور کوئی احتیاج پوری ہوسکتی ہے۔ لیکن زر عام آلۂ مبادلہ ہے اور اس سے دنیا کی بیشمار چیزیں خریدی جاسکتی ہیں جن سے ہماری احتیاجات رفع ہوں پس صاف ظاہر ہے کہ زر محض مبادلہ کے واسطے درکار ہے تاکہ حسب ضرورت اس سے ہر چیز خریدی جائے زر کے مبادلہ میں جس قدر کوئی چیز زیادہ یا کم ملے گی۔ اسی قدر گویا زر کی قدر بھی بحوالہ اس چیز کے بیش و کم ہوگی۔ مثلاً جس زمانہ میں گیہوں کا نرخ ۱۵ سیر ہو تو ایک روپیہ اس زمانہ کے بارہ آنہ کی برابر ہے۔ جب کہ گیہوں ۲۰ سیر فی روپیہ فروخت ہوتے ہوں اور اس زمانہ کے عہ کے مساوی القدر ہے جب کہ نرخ ۱۰ سیر ہو۔ زر سے جو بیشمار چیزیں خریدی جاتی ہیں اُن کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ لیکن علمی طریق سے تحقیق ہوا ہے کہ جس سے من حیث المجموع زر کی قدر و قیمت کا اضافہ یا تخفیف قابل اطمینان حد تک دریافت ہوسکتا ہے۔ اس کو انڈکس نمبر کہتے ہیں۔ بخوبی ثابت ہوچکا ہے کہ بحیثیت مجموعی تقریباً ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے یعنی زر کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے اور بمقابلہ سابق کمتر چیز اس کے مبادلہ میں ملتی ہے تخفیف قدر کے اسباب کی بحث بہت طویل ہے ہم یہاں نہیں چھیڑ سکتے (۱۵۰/۲۸) صرف اسی تخفیف کا شرح سود پر اثر دکھانا مدنظر ہے۔ زر عام معیار قدر ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے مثلاً گز کہ وہ ۳۶ انچ لمبا ہے۔ یا من کہ ۴۰ سیر وزنی ہے لیکن زر ایسا معیار ہے جو خود تغیر پذیر ہے۔ اور اشیا کی گرانی

حصہ سوم
باب ۱۴

ارزانی کے مطابق کبھی گھٹ کر اپنے ماسبق روپیہ کا تین چوتھائی یا نصف رہ جاتا ہے کبھی ڈیوڑھا دوگنا ہوجاتا ہے - اس کی مثال ایک ایسے گز کی سی ہے جو کبھی سکڑ کر ۲۰ - ۲۵ انچ اور کبھی پھیل کر ۴۰ - ۵۰ انچ ہوتا ہے فرض کرو کہ کوئی شخص ۵ فیصدی شرح سود سے سال بھر کے واسطے ۱۰۰ روپیہ قرض لے اب اگر روپیہ کی قدر بمقدار ۲۰ فیصدی بڑھ جائے یعنی سال میں گیارہ سو روپیہ شروع سال کے ۱۲۰ روپیہ کے مساوی القدر ہوں تو گویا قرض دار بوقت ادا کرکے قرض و سود ۱۰۵ روپیہ کے درحقیقت ایسے ۱۲۶ روپیہ ادا کرتا ہے جیسے کہ اس نے قرض لئے تھے - گویا کہ شرح متعارف ۵ فیصدی اور شرح صحیح ۲۶ فیصدی ہوگی اس کے برعکس اگر روپیہ کی قدر بیس فیصدی گھٹ جائے یعنی آخر سال کے ۱۰۰ روپیہ شروع سال کے ۸۰ کے مساوی القدر رہ جائیں تو بوقت ادائگی ۱۰۵ روپیہ وہ درحقیقت ایسے ۸۴ روپیہ کرتا ہے جیسے کہ قرض لئے تھے - یعنی کہنے کو تو ۵ فیصدی سود ادا کرتا ہے لیکن درحقیقت ۱۶ فیصدی بٹہ گویا بمعاوضہ قرض گیری خود کاٹتا ہے - بالفاظ مختصر زر کی قدر و قیمت تغیر پذیر ہے اور اس کے گھٹنے بڑھنے سے سود کی شرح صحیحہ میں بھی کمی بیشی ہو رہتی ہے - چنانچہ واقعہ ہے کہ نصف صدی میں روپیہ کی قدر گھٹتے گھٹتے بمشکل نصف رہ گئی ہے اور قدیم قرض خواہوں کو بھی درحقیقت قرض کم و بیش ۵۰ فیصدی مل رہا ہے اگرچہ روپیہ کی مقدار اب بھی وہی ہے لیکن ان کی قدر چونکہ اصلی غایت ہے جو قرض دئے ہوئے روپیوں کے نصف کی برابر رہ گئی ہے - ایسے قرضوں پر سود ملنا تو درکنار خود قرض دار کو اپنی گرہ سے سود دینا پڑتا ہے لیکن واضح ہو کہ زر کی قدر و قیمت میں ایسا بڑا فرق کہیں مدتوں میں نمودار ہوتا ہے مختصر زمانوں میں جن کے واسطے بالعموم قرض دیا لیا جاتا ہے - قدر و قیمت میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی - چنانچہ تخفیف قدر زر کا واقعہ اور اس کا سود پر اثر عملاً زیادہ اہم نہیں البتہ اصولاً بہت قابل توجہ ہے -

زر کے متعلق یہاں بلحاظ ضرورت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کی مفصل تشریح زر کے تحت میں ملے گی (۱-۳/ب-۲)

حصہ سوم باب ۱۲ سود کا حاضر مستقبل

(۱۱) ہم بتا چکے ہیں کہ ہماری اصطلاحی زبان میں ربا سے مراد وہ معاوضہ ہے جو غریب حاجتمندوں یا امیر ناعاقبت اندیشوں کی فوری احتیاجات رفع کرنے کے لئے نہ کہ پیدا آور کاموں کے واسطے زر نقد قرض دے کر بشرح اعلیٰ وصول کیا جائے۔ شرح کی زیادتی قرض گیر کی لاچاری و شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی چیرہ دستی و بیرحمی کے مطابق ہوگی۔ خدا کی رحمت یعنی مرفہ الحالی کی ناشکری اور زر نقد کی بد استعمالی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ غریبوں کی تنگدستی اور اپنی دولتمندی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی چھوٹی چھوٹی کمائیوں سے حصہ چھیننے۔ بغایت اعلیٰ شرح سود پر تھوڑا سا قرض دے کر ہمیشہ کے واسطے ان کو اپنا غلام بنالے کہ گاڑھے پسینے کی کمائی میں سے وہ اس کو مدت العمر سود دیا کریں اور ادائگی قرض کی کبھی نوبت نہ آنے پائے۔ یا کسی بھولے بھالے رئیس زادہ کو اول اول عیش وعشرت کی چاٹ پر لگا کر نہایت دلجوئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ قرض مرحمت کیا جائے اور چند ہی روز میں بر سر عدالت ان کو جائداد و ریاست کی ملک و آمدنی سے سبکدوش کر کے ان کا خاتمہ بالخیر کر دیں۔ یورپ میں تو یہودی شہرۂ آفاق ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے مہاجن بھی کسی سے کم نہیں۔ رباخوری کے لین دین سے سب کی آنکھوں کے سامنے خود قانون کی ظل عاطفت میں (جس کی مشہور عالم غرض واحد کمزوروں کی حمایت اور قیام حفظ و امن ہے) چور اور ڈاکوؤں سے کہیں بڑھ کر بیشمار غریب اور نادانوں کا گھر لوٹ رہے ہیں افلاس پھیلا کر عزت مند اور نیک نیت خستہ حال مقروضوں کو بھیک اور چوری کے سوائے بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں چھوڑتے اور اپنے مقروض فاقہ کش خاندانوں کی اموات میں طاعون کا حق ادا کر دیتے ہیں جس طرح سرگ بیل کا ایک بالشت بھر ٹکڑا بڑے سے بڑے

سرسبز شاداب درخت پر چند ہی روز میں پھیل کر اس کو زرد و خشک کر ڈالتا ہے - مہاجن سے
کچھ قرض لینا شرط ہے اس کے بعد اگر گھر بار نیلام نہ ہو جائے تو ہمارا ذمہ - ان کی چیرہ دستی حصۂ سوم
سے خدا کی خلقت پامال ہو رہی ہے - ذرا عدالتوں کے رجسٹر مقدمات اٹھا کر دیکھئے وہ غریبوں باب ۲
کی تباہی کے ایسے افسانوں سے لبریز ہیں کہ جنھیں سُن کر پتھر کے دل بھی پگھل جائیں - اگر
ایسے مظلوموں کی آہ سے آسمان بھی ہلجاتا ہو تو عجب نہیں - صوبہ متحدہ کی عدالتوں کی مصدقہ
رپورٹ میں سے چند معاملات مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں -

نام عدالت	زر قرضہ	ڈگری مع سود
الہ آباد	۵۰	۴۰۰۰
کانپور	۵۰	۳۰۰۰
علی گڑھ	۹۹	۶۰۰۰
ایضاً	۹۹	۶۰۰۰
ایضاً	۶۰	۲۰۶۹
آگرہ	۷۵	۲۷۵۰
علی گڑھ	۱۶	۷۰۰
بنارس	۱۹۹	۲۷۹۰
علی گڑھ	۲۰۰	۲۷۱۵
بنارس	۲۷۲	۱۶۷۸
ایضاً	۱۵۰	۱۱۰۰
شاہ جہاں پور	۱۷۶	۱۰۰۰

ان چند مثالوں کی اہمیت یہ کہہ کر گھٹانا بیجا ہو گا کہ یہ مقدمے چند نادر الوجود انتہائی قسم

کے واقعات ہیں۔ بلکہ ہر باخبر شخص تسلیم کرے گا کہ ایسی وحشت افزا معاملات کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں اور بہت بڑی تعداد عدالت کے علم میں نہیں آتی۔ غرض کہ ربا سے ملک میں جو ناقابل تلافی تباہی پھیل رہی ہے کوئی ذی ہوش اور ایماندار آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اب سوال یہ ہی کہ ان شرمناک حالات کی اصلاح کیوں کر ممکن ہی۔ رباخوری کے خلاف ۱۸۸۰ء میں جرمنی میں ایک قانون پاس ہوا اور ۱۸۹۳ء میں اس کی ترمیم ہوئی جو اب تک برابر جاری ہی اس قانون کی رو سے معمولی شرح سے زیادہ سود پر غریب اور نادار لوگوں کو قرض دینے کا معاہدہ کالعدم ہی۔ علاوہ ازیں رباخوری کا پیشہ جرم بھی قرار دیا گیا ہی۔ الحمدللہ کہ سرکار ہند نے بھی اوائل ۱۹۱۸ء میں یوزاری بل یعنی قانون ربا پاس کرکے نافذ کردیا۔ اس کا منشا بھی یہی ہی کہ مہاجنی اور ساہوکار قرضداروں پر سود کا بیجا بار نہ ڈال سکیں۔ اگرچہ اس سے داد وستد کے مظالم کی بہت کچھ روک تھام ہونے کی امید ہی۔ تاہم محض قرض دہندوں کو ربا سے روکنے کا ایک نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ مطالبات خطر کے بڑھنے سے سود خام کا اضافہ ہوگا۔ خود قرض گیروں کو بیجا مصارف کے واسطے قرض لینے سے روکنے اور جائز ضروریات کے واسطے شرح مناسب سود پر قرض مہیا کرنے کا طریق کہیں زیادہ کارگر ہوسکتا ہی چنانچہ کاشتکار و دیگر مزدوری پیشہ طبقوں کو مہاجن کے پنجہ سے چھڑانے کی غرض سے سرکاری سرپرستی اور نگرانی میں جابجا انجمن ہائے امداد باہمی یورپ کے نمونہ پر قائم ہورہی ہیں۔ شرکا میں کفایت شعاری اور خوش معاملگی کی مستقل عادتیں پیدا کرنا بیجا اسراف سے روکنا اور جائز ضروریات کے واسطے مناسب شرح سود پر قرض دینا ان کے خاص مقاصد ہیں۔ ہندوستان کے اکثر حصوں میں ایسی سوسائٹیاں بہت جلد اپنے فوائد و برکات ظاہر کرکے ہر دلعزیز ہورہی ہیں۔ یہاں ان سوسائٹیوں کے حوالہ پر اکتفا کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے۔ طریق کاروبار کی تشریح اپنے اپنے محل پر ہوگی (۱/۲)

آج کل حتی الوسع ہر شخص اپنے اندوختہ سے بطور اصل کام لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے موجودہ طریق کاروبار نے شغل اصل میں ایسی آسانیاں پیدا کر دی ہیں کہ ہر شخص بلا دردسر اپنے اصل سے سود حاصل کر سکتا ہے۔ معتبر بنک میں اندوختہ داخل کر دے یا سرکاری شرح معین سود والے پرامیسری نوٹ اور اسٹاک خرید لے یا کسی انجمن سرمایہ مشترک کے حصے خرید لے۔ غرضکہ بلا محنت و مشقت اصل دار اپنے سود کی آمدنی سے نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ غریب مزدور تو پیٹ پالنے کی خاطر دن رات جان کھپاتا ہے۔ زمیندار کو بھی ریاست کے انتظام میں بہت کچھ تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اکثر اصل داروں کو وقت معینہ پر گورنمنٹ یا بنک یا کارخانوں سے سود وصول کرنا اور چین اڑانا اس کے سوا اور کام ہی نہیں۔ سیر و سیاحت شکار و تفریح کے سوا ان کو نہیں معلوم کہ دنیا میں کونسی ہوا چل رہی ہے دوسروں کا ان کے عیش و بےفکری پر حسد کرنا بالکل قدرتی بات ہے۔ چنانچہ اصل کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ بنا ہوا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اصل کا کوئی قصور نہیں اور نہ سود میں کچھ عیب۔ اصل داروں کی اصلاح کے واسطے ان اسباب کا روکنا ضروری ہے جن کی بدولت وہ بلا محنت و مشقت بڑی بڑی مقدار دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اگر امریکا والے راک فیلر کی طرح کوئی غریب شخص اپنی سخت محنت اور غیر معمولی قابلیت سے ناجائز طریق اختیار کئے بغیر کروڑپتی کیا بلکہ ارب یا کھرب پتی بن جاوے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ نہایت ناکارہ لوگ خود ہاتھ پیر ہلائے بغیر باپ دادا کے بڑے بڑے ورثوں کی آمدنی پر جس کو بذریعہ شغل اصل بطور سود حاصل کرنے سے شاید ہی کوئی دنیا میں آسان کام ہوگا۔ دن عید اور رات شب برات مناتے ہیں۔ زمیندار بھی اگرچہ ریاست کے انتظام میں کچھ توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں۔ جیسا کہ لگان کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے لیکن ان کی ملک و جائداد کی آمدنی و قیمت بہت سی عام معاشی ترقیات کی بدولت

ان کی کوشش بغیر خود بخود دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے - یہ لوگ بھی ایسے اضافوں سے روز بروز بلا محنت و مشقت زیادہ دولت مند بن رہے ہیں - مزید براں بوجہ سہولت شغل اصل کا ان کو بھی شوق پیدا ہو چلا ہے - اور اُن کو آمدنی غیر مکتسب کے دو ذرائع حاصل ہیں - علاوہ ازیں بطریق اجارہ بھی کاروبار میں اُجرت و سود سے زیادہ معاوضہ وصول کیا جا سکتا ہے گویا وراثت، زمین اور اجارہ یہی تین طریق ہیں جن سے کافی محنت و کوشش کئے بغیر بڑی بڑی دولتیں افراد کے ہاتھ آجاتی ہیں - پس اُن کی اس طرح پر اصلاح کرنی چاہئے کہ تقسیم دولت بہت زیادہ مساوی رہے - اس وقت نہ لوگوں کے پاس جدا گانہ بہت زیادہ اندوختہ ہوگا نہ شغل اصل سے موجودہ آمدنی غیر مکتسب اس قدر زیادہ مقدار میں میسّر آسکے گی - ماحصل غیر مکتسب کے اصلی ذرائع تو مسدود نہ کرنا جن کی وجہ سے لوگ بڑی بڑی دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں اور شکایت یہ کرنا کہ دولت مند شغل اصل سے بہت کچھ سود پا رہے ہیں نہ اصولاً صحیح ہے نہ عملاً مفید -

بالفاظ مختصر لوگوں کو بلا مشقت بہت سی دولت سنگوالینے سے روکنا چاہئے نہ کہ جو دولت وہ حاصل کرلیں اس کے استعمال سے -

حصہ سوم
باب ۱۳

باب تیرہ

منافع

تجزیہ (۱) آجر کی کارگزاری (۲) منافع کی ماہیت (۳) شرح منافع

آجر کی کارگزاری

۱- اس سے قبل بھی آجر کے کام کا جا بجا ذکر آچکا ہے (۱۴/۷ و ۱/۸ و ۱/۱) یہاں اسی کی تفصیل مقصود ہے۔ ہر سہ عاملین پیدائش کے مالک تین جداگانہ گروہ میں منقسم پائے جاتے ہیں۔ زمیندار مزدور اور اصل دار۔ چنانچہ باب اول میں واضح ہو چکا ہے کہ ملک عاملین کی اس تقسیم کی بدولت پیداوار میں لگان اجرت اور سود کی تفریق ضروری معلوم ہوئی بہت کم زمیندار خود کاشت کرنا پسند کرتے ہیں۔ لگان پر زمین اٹھانے کا طریق مدت سے مروج ہے۔ غریب مزدور کے پاس آج کل کے کاروبار کے لائق اصل کہاں، اکثر دوسروں کے ہاں اجرت پر کام کرتے ہیں۔ اکثر اندوختہ والے چاہتے ہیں کہ کاروبار کے مخمصوں میں پڑے بغیر کسی دوسرے کی معرفت شغل اصل سے سود حاصل کریں زمینداروں کا جداگانہ گروہ تو قدیم سے چلا آتا ہے لیکن جب سے پیدائش بر پیمانہ کبیر کا رواج ہوا اور خاص و عام میں اپنے اندوختہ سے بطور اصل کام لینے کا شوق بڑھا مزدور۔ اصل دار۔ اور آجر بھی جداگانہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ آجر کرایہ پر زمین اور سود پر اصل قرض لے کر۔ اجرت پر مزدوروں سے کام لیتا ہے۔ گویا اپنے اہتمام نگرانی اور ذمہ داری میں دوسروں سے عاملین پیدائش مستعار لے کر کاروبار جاری کرتا ہے۔ واضح ہو کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں آجر کے کام کی بہت گنجائش ہے۔ اور آخر الذکر شعبۂ پیدائش میں اصل و محنت کے عمل کا غلبہ ہوتا ہے۔ براہ راست زمین اس میں بہت کم حصہ لیتی ہے۔ لہذا آجر کا کام بالخصوص قابل لحاظ حصہ اصل

حصۂ سوم
باب ۱۳

و محنت کو یک جا کرنا ہے۔ مزدوروں سے اجرت پر کام لئے بغیر تو کوئی چارہ نہیں۔ آجر اپنی ذات سے کل کاروبار کیسے چلا سکتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ زمین اور اصل یا ان کے کسی حصہ کا خود مالک ہو لیکن ان کے ذاتی ملک ہونے سے آجر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بالفاظ مختصر آجر کا کام عاملین یکجا کر کے دولت پیدا کرنا ہے۔ خواہ خود مالک زمین ہو اور اپنی گرہ سے اصل لگائے یا دوسروں سے مستعار لے۔ لیکن مزدوروں سے بہر صورت اجرت پر کام لیتا ہے اور خاص اسی وجہ سے آجر کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر عامل پیدائش ایک جداگانہ گروہ کے ہاتھ میں جا پڑا ہے اور مالک خود کام لینے سے یا تو جان چراتے ہیں یا معذور ہیں۔ اس لئے عاملین یک جا کر کے دولت پیدا کرنے کا کام خاص طور پر ایک جداگانہ گروہ کے سپرد کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت پیدائش کا کام اس قدر دشوار اور تخصیص طلب ہو گیا ہے کہ اس میدان میں اچھے اچھے ٹھوکریں کھاتے اور راستہ بھٹکتے ہیں۔ اوّل تو یہ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا زمانہ ہے۔ صدہا بلکہ ہزارہا مزدور اور لاکھوں کروڑوں روپیہ قیمتی اصل کا اہتمام نگرانی کیا کوئی آسان کام ہے ذرا تفصیل پر غور کیجئے تو قدم قدم پر بے حد باخبری۔ وقت شناسی دوربینی مستعدی اور استقلال کی ضرورت نظر آئے گی۔ آجر کو کاروبار کا کپتان کہتے ہیں۔ اور تشبیہ از حد موزوں اور درست ہے۔ لڑتی تو فوج ہی ہے لیکن فتح و نصرت کا دار و مدار بیشتر جنرل کی عاقلانہ ترکیب اور موزوں چالوں پر ہوتا ہے۔ عمدہ افسر حسن بہادر سپاہیوں سے بڑے بڑے فتوحات پاتے ہیں۔ نا قابل افسر انھیں بے کار کٹوا کر ہزیمت اٹھاتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ خالد بن ولید، صلاح الدین اور نپولین کا نام جنگی دنیا میں کیوں روشن ہے۔ سپاہی تو ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ بہت سے پیش رفتہ اور پس آئندہ سپہ سالاروں کے۔ لیکن کام ان سے وہ وہ لئے گئے کہ دنیا

آج تک مدّاح اور حیران ہو۔ یہی حال آج کل کاروبار کا ہے۔ یوں تو سینکڑوں مزدور اور ملازمین شریک کار ہوتے ہیں لیکن کامیابی اور سرسبزی ایک ہی دو نگراں کاروں کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے۔ چاہے اُن کی ذرا سی غلطی اور لغزش سب کی کوشش خاک میں ملا دے۔ چاہے اُن کی پیش بینی اور عاقلانہ کوشش کاروبار کو آسمان پر چڑھا دے۔ دوسرے مزدور در اصل کی نگرانی کیا ادنے کام ہے۔ وسیع الاثر معاشی تغیرات کا بغور مطالعہ کرنا اقتضائے وقت کو پہلے سے تاڑنا اور اس کا ساتھ دینا نہ صرف مروّجہ ضروریات بہم پہنچانا بلکہ نت نئی اختراع و ایجاد سے جدید ضروریات رائج کرنا۔ عمدگی تنظیم اور سائنس کی تحقیقات اور عام معلومات سے مدد دے کر مصارف پیدائش میں کفایات داخلی و خارجی نکالنا، نرخ گھٹا کر خریدار بڑھانا، یا مروّجہ نرخ سے اعلیٰ منافع اٹھانا۔ غرضکہ ہر وقت نہایت باخبر اور مستعد رہنا اور حریف کارخانوں سے دوڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش برابر جاری رکھنا۔ کیسے کیسے دشوار کام آجر کے ذمہ آپڑے ہیں۔ یہ جو یورپ اور امریکا کے کارخانوں اور کاروبار نے دنیا پر تسلط کر رکھا ہے کیا یہ محض حسن اتفاق کا نتیجہ ہی؟ نہیں۔ بلکہ علاوہ چند در چند معاشی اسباب کے آجروں کی کوشش بھی اس عالمگیر کامیابی کا خاص اور بہت بڑا باعث ہے حتیٰ کہ چند مشہور بنکوں اور کارخانوں کے ڈائرکٹر اور منیجر بلحاظ کارگزاری و ذمہ داری اعلیٰ سے اعلیٰ سلطنت کے وزیر اعظم اور پریسیڈنٹ کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں۔ انگلستان کی وزارت اور لندن بنک کی ڈائرکٹری۔ ان دونوں عہدوں میں کون زیادہ اہم ہے۔ اس پر اب تک اختلاف رائے موجود ہے۔ کسی گروہ یا طبقہ کے کل افراد کی حالت یکساں نہیں ہوسکتی۔ علیٰ ہذا یہ کس طرح ممکن ہی کہ تمام آجر ایسی ہی عظیم الشان کارگزاریاں دکھا سکیں۔ یہ تو معدودے چند کا ہی حصہ ہی۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہی کہ اپنی اپنی حیثیت کے موافق وہ ایک خاص قسم کا ضروری اور

حصہ سوم قابلیت طلب کام سرانجام دے رہے ہیں۔ گویہ کام فی نفسہ ایک قسم کی محنت ہے لیکن
باب ۱۳ بوجوہات مذکورۂ بالا اس قدر اہم اور متمیز ہو گیا ہے کہ عمل پیدائش دولت کا چوتھا جزو شمار ہو کر تنظیم کے جداگانہ نام سے موسوم ہوا۔

ٹھیٹ آجر تو وہی ہے جو ہر سہ عاملین یک جا جمع کر کے دولت پیدا کرے۔ لیکن تاجر بنکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ جیسے لوگ جو کسی کاروبار کے نگراں ہوں اسی زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے کام بھی مذکورالصدر تنظیم کی صرف مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں یہ نکتہ جتانا نہایت ضروری ہے کہ آجر کہلانے کے واسطے نہ صرف کاروبار کی نگرانی بلکہ براہ راست ذاتی نفع نقصان کا تعلق بھی لازمی ہے۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی تنخواہ دار منیجر کاروبار کا نگراں ہو تو وہ آجر نہیں شمار ہو سکتا۔ کیونکہ اگرچہ بحیثیت ملازم وہ بھی جواب دہ ہے اور کاروبار کی سرسبزی و تباہی کا اس کے مالی مفاد پر اثر ضرور پڑتا ہے۔ لیکن اس کی ذمہ داری اور تعلق اتنا قوی اور قریبی نہیں جتنا اس وقت ہوتا جب کہ وہ خود اپنی طرف سے کاروبار جاری کرتا اور اس کا خود نگراں بنتا۔ بحالت اوّل صرف تنزل یا زیادہ سے زیادہ ترک ملازمت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بحالت دوم کاروبار کے کل نفع نقصان کا اثر براہ راست اس کی ذاتی حالت پر پڑتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ کسی کارخانہ اور کاروبار کے تنخواہ دار اور منیجر اس قدر توجہ اور تن دہی سے نگرانی نہیں کر سکتا۔ جتنا کہ خود مالک کرتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ آجر سے مراد وہ لوگ ہیں جو عاملین پیدائش کو یک جا کر کے اپنی ذاتی نگرانی اور ذمہ داری میں اُن سے دولت پیدا کریں۔ آج کل اکثر آجر زمین و اصل دوسروں سے کسی معاوضہ پر مستعار لے لیتے ہیں اور بعض خود ہی ان کے مالک ہوتے ہیں۔ آخر الذکر قسم کے آجر تو زمانہ قدیم میں بھی موجود تھے لیکن پیدائش بر پیمانہ کبیر شغل اصل کے

حصہ سوم

باب ۱۳

رواج اور عام معاشی ترقیات کی بدولت اوّل لذکر قسم کے آجروں کا گروہ اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے اور چونکہ نہ یہ زمیندار ہوتے ہیں۔ نہ محض مزدور۔ نہ اصل دار۔ اور پھر بھی پیدائش دولت کے واسطے اُن کا کام بڑی حد تک ناگزیر سا ہو گیا ہے۔ لہذا عاملین کے مالکوں سے۔ ان کا بحیثیت عاملین سے کام لینے والوں کے ایک جدا طبقہ بن گیا ہے اور ان کا ماحصل زاید بھی ایک خاص نام یعنی منافع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لیکن چند روز سے آجروں کا حلقہ عمل پھر تنگ ہوتا جاتا ہے۔ خصوصاً جب سے انجمن سرمایہ مشترک اور شراکت کا رواج پھیلا کاروبار کے اہتمام اور نگرانی میں تنخواہ دار منیجر آجروں کے قائم مقام بن رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مشین کا استعمال جس قدر بڑھ رہا ہے۔ بہ نسبت سابق نگرانی کی ضرورت بھی گھٹتی جاتی ہے۔ جو کاروبار کمال کو پہنچ چکے ہیں اور جن کے چلانے کے طرز و طریق مقرر سے ہو گئے ہیں۔ وہ تنخواہ دار منیجر کے بھی سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن جن کاموں میں جدّت، جرأت اور جان کاہی کی ضرورت ہے۔ وہ آجر کے ہاتھ ہی سرسبز ہو سکتے ہیں۔ آج کل بھی آجر و تنخواہ دار منیجر کے درمیان کام تقسیم کرنے میں اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے۔

منافع کی ماہیت

(۲) تقسیم دولت کے دیگر مباحث کی مانند منافع کا مسئلہ بھی کچھ کم معرکۃ الآرا اور پیچیدہ نہیں۔ اوّل تو خود اس کا مفہوم غیر معیّن دوم اس کے اسباب تحقیق کرنے پر اب تک معدودے چند لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور ایسے مسائل کی دقّتِ لاینفک اُن کی عدم تعیّن کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا جائے زیادہ سے زیادہ وہ قرین صحت ہو سکتا ہے۔ کوئی بات قطعی طور پر کہنی محال ہے۔ ایسی صورت میں جس قدر بھی اختلاف رائے ہو کم ہے۔ مستند تصانیف کے مطالعہ اور ذاتی غور و خوض کے بعد منافع کی جو تشریح سب سے زیادہ قرین اصول اور تشفی بخش نظر آئی وہ بیان کی جاتی ہے

منافع کا مفہوم اوّل ایک مثال سے واضح کر کے بعدہٗ اس کے اسباب دریافت کرنے کی کوشش کریں گے۔ فرض کرو کہ کسی کارخانہ کے سالانہ آمد و خرچ کا حساب حسب ذیل ہے۔

قیمت پیداوار .... روپیہ ۵۰۰۰۰

مصارف پیداوار

قیمت اشیاء خام جو کام آدیں	۲۵۰۰۰
اجرت مزدوران	۹۰۰۰
اصل مستعار کا سود	۴۰۰۰
بشرط امکان دوسرے کے زمین کا کرایہ جو معاشی لگان سے زاید ہو	۲۰۰۰
دوسروں کی قمیں جو حسب تفصیل بالا اپنی جیب سے دی گئیں	۴۰۰۰۰
	۱۰۰۰۰

منافع خام

اجرت تنظیم	۴۰۰۰
کچھ ذاتی اصل ہے جس کا سود	۳۰۰۰
کچھ زمین ذاتی ہے جس کا کرایہ زاید از معاشی لگان	۱۰۰۰
اصل قایم کے مطالبات فرسودگی و خطر	۱۰۰۰
جو رقمیں حسب تفصیل بالا اپنی جیب میں رہیں	

منافع خالص .... ۹۰۰۰ / ۱۰۰۰

اس مثال میں بغرض جامعیت وہ تمام مدیں دکھائی گئی ہیں جو منافع کی بحث میں قابل توجہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن ہر ایک کارخانہ کے حساب میں اُن سب مدوں کی موجودگی لازمی نہیں۔ فرض کرو کہ کسی آجر کے پاس نہ ذاتی اصل ہو نہ زمین یعنی دونوں مستعار لے تو منافع خام میں سے صرف اجرت تنظیم اور اصل قائم کے مطالبات فرسودگی و خطر منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ

منافع خالص ہوگا۔ اسی طرح پر اگر کوئی آجر نہ سود پر اصل مستعار لے نہ کرایہ پر زمین یعنی دونوں اُس کے ذاتی ہوں تو قیمیت اشیاء خام و اجرت مزدوران منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافع خام ہوگا۔ اجرت، سود اور کرایہ زمین مصارف پیدائش کی ان تینوں مدوں کو دو دو جزو میں منقسم کر کے ایک ایک کو منافع خام سے خارج اور باقی کو شامل شمار کرنے کی وجہ ایک تو حساب کتاب کی سہولت ہی۔ جو اجرت، سود یا کرایہ دوسروں کو ادا کرنا پڑتا ہے وہ تو مصارف پیدائش میں جداگانہ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن جو اپنے ہی جیب میں رہتا ہی۔ اس کی ایسی باقاعدہ تفریق غیر ضروری سمجھ کر لوگ اس کو منافع شمار کر لیتے ہیں، مطالبات فرسودگی و خطر اگرچہ مصارف پیدائش کے ضروری جزو ہیں لیکن جب تک وہ آجر کی جیب سے نہیں نکلتے بمنافع میں ملے جلے رہتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ منافع خام محض رواج کا آفریدہ ہی علمی لحاظ سے اس کا کوئی وجود نہیں۔ اوّل تو منافع خام کے دو جزو یعنی اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کے سود کا موازنہ اس اجرت و سود سے جو خارج از منافع ہی۔ علمی غرض سے ضروری ہی۔ دوم منافع خام کاروباری مقابلہ کا ایک کارگر آلہ ہی جس کی ہم ابھی مختصر تشریح کریں گے۔

اوّل اجرت تنظیم کو لیجئے۔ بحیثیت ملازم دوسروں کے کاروبار کی نگرانی و اہتمام میں اس قدر تن دہی و ذمہ داری درکار نہیں جتنی کہ ذاتی کاموں میں۔ چنانچہ واقعہ ہی کہ آجر اپنے کاروبار کی ترقی میں جس قدر جانفشانی کرتا ہے تنخواہ دار منیجر ہرگز نہیں کر سکتا۔ ایسی محنت و ذمہ داری سے بچنے کے لئے اکثر لوگ کمتر شرح معین پر اپنا اصل قرض دیدینا اور دوسروں کے کارخانوں میں ملازمت کرنے آجر بننے کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہی کہ منیجر کو جو تنخواہ دینی پڑے یا جو تنخواہ خود آجر کو کسی دوسرے کارخانہ میں بحیثیت منیجر مل سکے اس سے غالباً کچھ زیادہ اجرت تنظیم کے طور پر آجر وصول کرنے کی کوشش کرے گا یہی حال سود کا ہے۔ دوسروں کو اصل قرض دے کر اصل دار سود بشرح معین اطمینان

سے وصول کرسکتا تھا۔ لیکن اپنے کاروبار میں لگانے سے اس کے سود کی شرح ہمیشہ غیر معین رہتی ہے۔ کبھی معمول سے زیادہ ملا تو کبھی کچھ نہیں، ایسی غیر اطمینانی حالت میں آجر مطالبات ضمانت بغیر جن سے قلت مقدار سود کی تلافی ہوتی رہنا یقینی ہو۔ بطور خود کاروبار میں اصل لگانا ہرگز پسند نہ کرے گا اور بشرح معین سود پر دوسروں کو قرض دینا ہزار درجہ غنیمت سمجھے گا۔ لہٰذا ذاتی اصل کے سود کی شرح بھی بازاری شرح سے بقدر مطالبات ضمانت زیادہ مطلوب ہوگی۔ البتہ ذاتی زمین کے کرایہ میں کوئی بیشی ضروری نہیں اور اصل ذاتی و مستعار کے مطالبات فرسودگی و خطر بھی یکساں ہوں گے۔

واضح ہو کہ اس بحث میں یہ لازم نہیں آتا کہ آجر کو ہمیشہ اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کا سود بشرح اعلیٰ ہی ملتا ہے بلکہ ایسا ہونا عجب نہیں کہ کاروبار جاری کرنے کے بعد ناموافق تغیرات کی بدولت معمولی شرح سے بھی کم وصول ہو۔ یہ آجر کی بڑی بدقسمتی ہوگی لیکن وہ اکثر بے بس ہو جاتا ہے۔ فرض کرو کہ آجر ہزارہا بلکہ لاکھوں روپیہ عمارت اور مشین میں لگا کر کارخانہ جاری کرے اور حالات نامساعد اس کے کاروبار کو آگھیریں۔ اب اگر وہ کاروبار بالکل بند کردے تو جو کچھ منافع مل رہا ہے وہ بھی نہ ملے گا اور سراسر نقصان ہوگا اور اگر کاروبار فروخت کرے تو بحالت موجودہ قیمت نہایت ادنیٰ اٹھے گی لہٰذا کچھ مجبور ہو کر اور کچھ آئندہ اصلاح کی امید پر وہ کاروبار جاری رکھے گا اور بمصداق "گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است" تھوڑا بہت منافع جو کچھ بھی ملیگا اُسی پر قناعت کرے گا۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر آجر کے کاروبار میں منافع کی گنجایش ہی بہت کم ہو یعنی زمین اور کل اصل مستعار ہو تو کساد بازاری کا وہ بہت کم متحمل ہو سکے گا اور جلد تباہ ہو جائے گا پس جب کہ عملاً منافع میں شرح اجرت و سود اس قدر تغیر پزیر ہو تو پھر ایسی شرح کا بازاری شرح سے اعلیٰ ہونا کیونکر ضروری بتایا جاتا ہے؟ اس سے صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ کن وجوہ پر

کاروبار جاری کرتے وقت آجر لازماً اعلیٰ شرح کی اُمید باندھتا ہے اور بجالت کامیابی کس بناء پر اپنے آپ کو اعلیٰ شرح کا مستحق قرار دے سکتا ہے۔

منافع خام کو مقابلہ کا آلہ اس وجہ سے کہا گیا کہ چوں کہ وہ آجر کی جیب میں جاتا ہے اور کسی دوسرے کو ادا نہیں کیا جاتا۔ چندروز اس سے دست بردار ہو کر ایسے حریف کو میدان مقابلہ سے بھگانا دشوار نہیں کہ جس کو منافع خام کا کچھ سہارا نہ ہو اور کل مصارف پیدایش اس کو جیب سے نقد ادا کرنے پڑیں لیکن صاف ظاہر ہے کہ منافع خام بھی عرصہ تک بار مقابلہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ برس تک تو تلافی یا مستقبل کی اُمید پر منافع خام کو کوئی صبر کر سکتا ہے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ سالہا سال کے واسطے کوئی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس کا نتیجہ تو سراسر تباہی ہوگا۔ مقابلہ جاری رکھ سکنے کی مدّت کا دار ومدار مقابلہ اور مقدار منافع کی باہمی نسبت پر منحصر ہے۔ اگر مقابلہ میں کم نقصان اُٹھانا پڑے اور مقدار منافع خام کثیر ہو تو زیادہ عرصہ تک مقابلہ جاری رکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کا جلد خاتمہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ ایسے مقابلہ کا منشا ہمیشہ حریف کی تباہی ہوتا ہی۔ دوران مقابلہ میں تخفیف نرخ سے خریداروں کو جو کچھ نفع ہو مقابلہ ختم ہونے کے بعد ممکن ہی کہ فتحیاب کارخانہ کچھ اجارہ کے زعم میں جس کی خاطر مقابلہ کیا گیا اور کچھ نقصان مقابلہ کی تلافی کرنے کے واسطے نرخ بڑھا کر خریداروں سے کل منافع تلف شدہ مع سود وصول کر ڈالے ، مقابلہ اور اجارہ سے ہم مبادلہ دولت کے تحت میں مفصل بحث کریں گے ($\frac{۱-۳}{۱۹}$) اس وقت منافع خام کا جُداگانہ وجود تسلیم کرنے کی عملی سہولت اور علمی ضرورت واضح کرنے کے بعد منافع خالص پر ایک نظر ڈالنا چاہیے ہیں۔ جب کہ منافع خام کی مقدار غیر مُعیّن ہو اور اس میں بعید تخفیف ہو سکتی ہو تو منافع خالص کا ملنا معلوم۔ چنانچہ اکثر معاشین کا خیال ہے کہ مقابلہ کے دباؤ سے نرخ گھٹتے گھٹتے مصارف پیدایش کے برابر آ لگا ہے۔ اور منافع خالص کی عام شرح

صفر ہے لیکن علمی لحاظ سے یہ سوال نہایت قابل توجہ ہے کہ منافع خالص اگر کبھی نمودار ہو تو اول اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں، دوم کن کن حالتوں میں وہ آجر کے پلّہ پڑتا ہے اور کب اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

تعیین شرح اُجرت۔ سود کی بحث میں اس سے قبل بالتفصیل سمجھایا جا چکا ہے کہ ہر دو شرح محنت واصل کے جزعہ مختتم کے پیداوار کے مساوی ہوتی ہیں (ف ۱۰۵ ، ۴/۱۲) جس سے صاف ظاہر ہے کہ جزعہ مختتم کے کل ماسبق جزعوں کی پیداوار سے آجر کو کچھ ماحصل زاید ضرور ملتا ہے اور اس واقع کی اس سے قبل لگان اُجرت وسود کے تحت میں متواتر تشریح ہو چکی ہے جس کا اعادہ یہاں پر محض طوالت ہوگا۔ منافع خالص کی یہ مد تو کم وبیش جائز مانی جاتی ہے کیوں کہ یہ ماحصل زائد تنظیم آجر کی بدولت پیدائش بر پیمانہ کبیر سے حاصل ہوتا ہے اگر تنظیم نہ ہو اور مزدور جُدا جُدا بطور خود کام کریں تو غالباً یہ ماحصل زاید پیدا ہی نہ ہو۔ بلکہ اگر موجودہ شرح سے بھی اُجرت کم پڑے تو عجب نہیں۔ البتہ اگر مزدور خود مل جل کر کاروبار چلاویں۔ جیسا کہ شراکت کے عنوان سے اُجرت کے بیان میں واضح کیا جا چکا ہے تو یہ منافع پیدا ہوگا اور خود انھیں کے جیب میں رہیگا لیکن بحالت موجودہ آجر ناگزیر ہے اور اس لیے اگر وہ مذکورۂ بالا منافع خود سنگوائے تو چارہ نہیں اور اگر بطریق شراکت منافع کچھ مزدوروں کو بھی دے تو اس کا ہزار احسان اور لاکھ شکریہ۔ لیکن اگر آجر مزدوروں کی تہیدستی، غفلت و نااتفاقی اور اپنے قابو سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر شرح اجرت محنت کی پیداوار مختتم سے بھی گھٹا دے تو ایسا منافع میں جو اضافہ ہو وہ سراسر بیجا ہوگا۔ اُجرت میں اضافہ یا تخفیف جس پر مزدوروں یعنی نسل انسان کی سب سے بڑی جماعت کی حیات و ترقی کا دار مدار ہے۔ از حد قابل توجہ ہے۔ اگر شرح اُجرت پیداوار مختتم کی پابند ہے اور اس پابندی میں ایک عملی سہولت ضرور ہے تو آجر کو چاہیے کہ شرح اُجرت میں مزید تخفیف کرنے کے بجائے محنت کے ماحصل زائد کا ایک جزو اپنی طرف سے

مزدوروں میں تقسیم کردے۔ چنانچہ شرکت منافع کے تحت میں اس تجویز کی تفصیل کی جا چکی ہے (۱۱ ص) اور کہیں کہیں تجربتاً اس پر عملدرآمد بھی ہو رہا ہے اور آجر و مزدور دونوں کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے۔ رہی شرح سود وہ بھی اصل کی پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس سے بھی کم ہو سکے تو ایسی تخفیف صرف اضافہ اصل کی رفتار گھٹانے کی وجہ قابل توجہ ہے اور بس۔ مزید براں واقعات شاہد ہیں کہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ پس اندازی کی قابلیت وعادت بڑھنے سے اصل کا اضافہ سود کے لالچ سے روز بروز مستغنی ہوتا جاتا ہے۔ گویا تخفیف اُجرت کے برعکس تخفیف شرح سود سے کسی بڑی مضرت کا اندیشہ نہیں۔ اور منافع خالص کا جو حصہ پیداوار اصل کے ماحصل زاید سے مرکب ہو وہ معاشی لحاظ سے قطعاً بے ضرر اور ناقابل اعتراض ہے۔

اوپر کی کل بحث سے مترشح ہوتا ہے کہ ہم کاروباری دنیا میں دیرپا سکون فرض کرکے تمام اسباب زیر بحث متعین قرار دے رہے ہیں۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ اوّل تو ایسے مفروضات کے بغیر کسی معاشی مسئلہ کی تحقیق محال ہے دوم کاروبار کے روزانہ، ماہانہ اور سالانہ تغیرات نظرانداز کرکے جب ہم کسی طویل زمانہ مثلاً چالیس پچاس سال پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی حد تک سکون تعین کے مفروضات ضرور قرین حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جلد جلد جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں وہ بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلاف امید کبھی کاروبار کی حالت ایسی ابتر ہو جاتی ہے کہ منافع خام تک غائب ہو جاتا ہے۔ اور کبھی گرم بازاری کا یہ زور بندھتا ہے کہ منافع خام سے بڑھ کر منافع خالص نمودار ہونے لگتا ہے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ منافع خالص اگر نمودار بھی ہو تو آجر کے ہاتھ کب آسکتا ہے؟ اُس وقت جب کہ آجر کو کسی نہ کسی شکل پر اجارہ حاصل ہو یعنی صرف وہی۔ یا چند اور آجر بھی کوئی کاروبار چلاویں لیکن باہمی اتفاق سے پیداوار کی من مانی قیمت مقرر کریں۔ ایسی حالت میں

مصارف پیدائش کی کل مدیں قیمت میں شامل کر کے اصل و محنت کی پیداوار کا ماحصل زائد یعنی منافع خالص بچا سکیں گے۔ بلکہ مصارف پیدائش سے بھی قیمت بڑھا کر اگر منافع خالص میں اضافہ کرلیں تو عجب نہیں، لیکن واضح ہو کہ ایسا اضافہ از حد مذموم اور عوام کے حق میں مضر ہوگا۔ علاوہ بیش قیمت تعیشات کے جن کی خریدار دولت مندوں کی مختصر جماعت ہوتی ہے۔ مایحتاج زندگی کی ارزانی و گرانی کا اثر کل لوگوں پر پڑتا ہے جن کی تعداد کثیر مزدوری پیشہ ہے اور جن میں سے اکثر غریب اور بہت سے متوسط الحال ہیں پس آجروں کا باہمی اتفاق کر کے اضافہ منافع کی ہوس میں بیجا طور پر مصارف پیدائش سے زیادہ قیمت بڑھانا جبر و تعدّی نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال اگر بیشی قیمت سے منافع میں ایسا اضافہ نہ بھی کیا جاوے تو بحالت اجارہ منافع خالص جو اصل و محنت کی پیداوار کے ماحصل زائد سے نمودار ہو باسانی اپنی جیب میں رکھا جا سکتا ہے اس کے برعکس اگر آجروں میں مقابلہ ہو تو ہر ایک اپنے ہاں کی بکری بڑھانے اور حریف کو زک دینے کی غرض سے قیمت میں یہاں تک تخفیف کریگا کہ اگر منافع خالص نمودار ہوا بھی ہوگا تو تخفیف کی نذر ہو جائے گا اور قیمت مصارف پیدائش کے سطح پر آرہے گی۔ آجر منافع خام پر قناعت کرے گا۔ بلکہ مقابلہ کے جوش میں بخوشی اسے بھی تخفیف کے ریلے میں بہا دے تو عجب نہیں۔ چونکہ آج کل مقابلہ کا زور شور خیال کیا جاتا ہے لہٰذا شرح منافع خالص محض صفر قرار دی جاتی ہے۔

المختصر منافع کا مفہوم اس کی دو قسمیں اور منافع خالص نمودار ہونے اور آجر کے قبضہ میں آنے کی صورتیں یہ سب نکات حتی الوسع سلیس طور پر واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن فی نفسہٖ منافع کے مفہوم اور ماہیت پر اس قدر جزوی اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ مبتدی حیران رہ جاتا ہے۔

(۴۴) اگرچہ اصل مستعار کا سود منافع سے خارج ہوتا ہے لیکن عام قاعدہ ہے کہ منافع کی

شرح اس کل اصل کی نسبت سے شمار کی جاتی ہی جو کاروبار میں لگا ہو خواہ وہ اصل مستعار
ہو یا ذاتی یا ہردو قسم کا مثلاً اگر اصل کی مقدار ایک لاکھ ہو اور منافع کی پانچ ہزار تو شرح منافع
۵ فیصدی شمار ہو گا۔ ذاتی اصل وزمین کا سود اور کرایہ اور اُجرت تنظیم تو ایک خاص شرح سے
تجاوز نہیں کر سکتی، منافع خالص کی بھی ایک حد ہے، یہ جو کاروبار میں ایک بلکہ نصف فیصدی
سے لے کر سو اور دو سو فیصدی تک شرح منافع میں حیران کُن فرق پایا جاتا ہی۔ اس کے
درحقیقت دو باعث ہیں، اوّل اُجرت تنظیم اور مقدار اصل کی باہمی نسبت دوم اصل کا مستعار
نہ ہونا، فرض کرو کہ ایک شخص بذریعہ ملازمت سو روپیہ ماہوار کما سکتا ہے اب اگر وہ بشرط
امکان کوئی ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ شغل اصل کی
گنجایش ہی نہ ہو تو ظاہر ہے کہ جب اس کا گذر اسی کاروبار پر ٹھیرا تو علاوہ سود اصل وہ سو روپیہ
ماہوار کی بچت بھی اسی کاروبار کے منافع سے نکالے گا۔ اس حالت میں علاوہ سود صرف
اُجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے ۱۲۰ فیصدی پڑے گی۔ اب اگر شرح سود ۵ فیصدی
ہو اور اصل ذاتی ہو تو شرح منافع ۱۲۵ فیصدی ہو جائے گی اور اگر اصل مستعار ہے تو سود
منافع میں شمار نہ ہو گا اور شرح منافع ۱۲۰ برقرار رہے گی اور اگر کچھ منافع خالص ہو تو
اس کے شامل ہونے کی بعد منافع خام کی شرح اور بھی بڑھ جائے گی۔ مشہور بات
ہے کہ قصبات کے بساطی، عطار، پنواڑی اور پنساری جیسے دُکاندار جو صبح سے شام تک
دو دو چار چار پیسہ کا چھٹکل سودا فروخت کر کے بمشکل چند روپیہ روز کا کاروبار چلاتے ہیں
تھوک فروشی کے نرخ کے مقابلہ میں بھی بہت زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں اور کہنے کو
شرح منافع بھی بہت اعلیٰ پاتے ہیں لیکن ایسا ہونا نہ کچھ عجیب نہ کاروبار والوں کے حق میں
خاص طور پر مفید۔ ان کو درحقیقت منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہی۔ شرح خواہ کچھ ہی کیوں
نہ ہو اور اوپر کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود شرح اس قدر اعلیٰ ہونے کے مقدار

منافع معمول سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ حلوائی نان بائی بقال جیسے خردہ فروشوں کی دُکانیں اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ہر ایک دُکان کی مقدار فروخت گھٹنے سے نرخ اشیا بڑھ جاوے گا اور باوجود اضافہ شرح اگر مقدار منافع میں تخفیف ہو جائے تو عجب نہیں، دُکانداروں کے باہمی مقابلہ کا نتیجہ بالعموم تو تخفیف نرخ ہوتا ہی لیکن بعض صورتوں میں خود مقابلہ اضافہ نرخ کا باعث بن جاتا ہے۔ مقابلہ کے اس غیر متوقعہ خاصہ سے ہم مبادلہ دولت کے تحت میں مفصل بحث کریں گے (۱۹-۱-۲) جو چیزیں قیمتی ہوں اور بآسانی تھوک فروشوں کے ہاں سے منگائی جاسکیں ان کی قیمت میں تو اضافہ دشوار ہے اور نہ ایسی چیزوں کی تجارت میں خردہ فروشی سرسبز ہو سکتی ہے لیکن جو چیزیں کم قیمت ہوں یا بآسانی باہر سے نہ منگائی جاسکیں اُن کی تجارت میں چھوٹے چھوٹے دُکانداروں کی چڑھ بنتی ہے۔ خریدار یا تو بوجہ قلت مقدار اضافہ قیمت کی پروا نہیں کرتے یا بوجہ مجبوری اس کو گوارا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں خردہ فروشوں کی دُکانیں جس قدر بڑھیں گی قیمت بھی چڑھے گی اور گو فرداً فرداً بوجہ قلت مقدار اضافہ محسوس نہ ہو لیکن بحیثیت مجموعی خریدار ضرور زیر بار ہوں گے، اس توضیح کی روشنی میں اب صاف معلوم ہو جائے گا کہ بعض تجارتوں میں خردہ فروشی اس قدر کیوں مروج ہے اور بعض میں بہت کم اور کسی کاروبار میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کی شرکت کس طرح پر شرکا اور عوام دونوں کے حق میں یکساں مضر ہے۔

مذکور الصدر مثال کے مقابلہ میں فرض کرو جو شخص ننو روپیہ ماہوار کی ملازمت پا سکتا ہے ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ۲۴ ہزار روپیہ سالانہ شغل اصل کی گنجائش ہو اس میں بھی وہ ننو روپیہ ماہوار کاروبار کے منافع میں سے نکالے گا لیکن اسی اُجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے مثال اوّل الذکر میں ۱۲۰ فیصدی قرار پائی تھی اور یہاں صرف ۵ فیصدی شرح میں تو زمین آسمان کا فرق ہے لیکن مقدار مجموعی وہی ایک ہے یعنی ۱۰۰ روپیہ ماہوار یا ۱۲۰۰ روپیہ

سالانہ اور آجر کے حق میں نتیجہ یکساں۔ نیز فرض کرو کہ شرح سود ۵ فیصدی ہی۔ اب اگر اصل مستعار ہے تو منافع جس میں صرف اُجرت تنظیم شامل ہے ۵ فیصدی رہے گا اور اگر ذاتی ہے۔ تو سود بھی شامل منافع ہو کر شرح کا مقدار ۱۰ فیصدی بڑھا دے گا۔ منافع خالص اس کے علاوہ رہا چھوٹے چھوٹے کاروبار تو ذاتی سرمایہ سے چلتے ہیں۔ لیکن آج کل کے بڑے بڑے کارخانوں میں اور تجارتوں میں بالعموم کروڑہا روپیہ قیمتی اصل قرض لے کر لگاتے ہیں بالفاظ دیگر کبھی سود جزو منافع شمار ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ہر دو مذکورۂ بالا مثالوں پر غور کرنے سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بالعموم بڑے کار باروں میں بمقابلہ چھوٹوں کے شرح منافع کیوں ادنیٰ ہوتی ہے، شرح میں اس قدر فرق کیوں کر ممکن ہے اور وہ کس طرح پر اُجرت تنظیم اور اصل کی باہمی نسبت اور اصل کے ذاتی یا مستعار ہونے سے متعلق ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ نکتہ جتانا بھی ضروری ہے کہ آجر کو تو منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہی شرح جو دیگر اسباب پر منحصر ہے۔ خواہ اعلیٰ بڑے یا ادنیٰ۔ لیکن عوام یعنی خریداروں کا حال مختلف ہی۔ اصل ذاتی یا مستعار ہونے کے مطابق سود کے شامل یا خارج ہونے سے جو بیشی وکمی شرح منافع میں نمودار ہو اس کا نرخ اشیا پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اسی لئے وہ خریداروں کے حق میں مفید نہ مضر۔ اس کے برعکس اگر اُجرت تنظیم اور مقدار اصل کی موافق نسبت سے شرح میں تخفیف یا اضافہ ہو تو اس کا اثر بذریعہ ارزانی وگرانی نرخ اشیا عوام کے مالی مفاد پر اچھا خاصہ پڑے گا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہی۔ یوں تو اصل کی نسبت سے شرح منافع فیصدی سالانہ شمار کیا جاتا ہی۔ لیکن شرح کی ایک اور قسم بھی قرار دی گئی ہے۔ جو عملی لحاظ سے بہت قابل توجہ ہی، اصل قایم تو عرصہ دراز تک عمل پیدائش سرانجام دے کر بشکل مطالبات فرسودگی قسط وار واپس آسکتا ہی۔ لیکن اصل دائر جلد جلد بشکل قیمت پیداوار وصول ہوتا رہتا ہی۔ اب اگر

حصہ سوم
باب ۱۳

کسی کاروبار میں اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہو اور وہ تیزی سے گھومتا رہے تو فی گردش شرح منافع ادنیٰ ہونے پر شرح سالانہ اعلیٰ ہونی ممکن ہے۔ اور مقدار منافع بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ ہزار کا مال صرف ایک فیصدی منافع پر ہر مہینہ ارزاں فروخت کرتا رہے تو گو شرح منافع فی گردش نہایت ادنیٰ ہے شرح سالانہ ۱۲ فیصدی آ پڑے گی۔ اور مقدار منافع جو اصل مقصود ہے ۲۰۰ روپیہ ماہوار یا ۲۴۰۰ روپیہ سال ہو گی۔ اس کے برعکس اگر کوئی کوتہ نظر تاجر زیادہ منافع کی ہوس میں صرف ۵ ہزار کا مال ۳ فیصدی کے منافع سے سال میں صرف دو مرتبہ فروخت کرے تو گو شرح منافع فی گردش ۳ فیصدی نظر آئے لیکن شرح سالانہ صرف ۶ فیصدی ہو گی اور مقدار منافع صرف ۲۵ روپیہ ماہوار یا ۳۰۰ روپیہ سالانہ شرح فی گردش شرح سالانہ اور مقدار منافع کے مذکورۂ بالا تعلق سے ایک نہایت اہم اصول تحقیق ہوتا ہے، کاروبار میں کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قیمت گھٹا گھٹا کر بہت بہت سا مال جلد جلد اس طرح پر فروخت کرے کہ نہایت ادنیٰ شرح فی گردش سے نہ صرف اعلیٰ شرح سالانہ ملے بلکہ منافع کی بڑی سے بڑی مقدار ہاتھ آئے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کے کارخانے سال میں کئی بار ½ بلکہ ¼ فیصدی منافع فی گردش کی شرح سے کروڑہا روپیہ کا قیمتی سامان فروخت کر کے لاکھوں روپیہ منافع اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن معاشی پس ماندگی اور ناواقفیت کی بدولت ہمارے اکثر ہموطن کاروباری لوگ اس کے بالکل برعکس کوشاں رہتے ہیں یعنی شرح فی گردش اس قدر اعلیٰ چاہتے ہیں کہ بوجہ تاخیر فروخت شرح سالانہ بہت ادنیٰ رہ جاتی ہے اور بوجہ قلت فروخت مقدار منافع اور بھی کچھ نہیں رہتی۔ گویا خود اپنے ہاتوں اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتے ہیں، خریداروں کی آگاہی کے واسطے قیمت نقد کا نوٹس تو اکثر جلی حروف میں دکان پر آویزاں رہتا ہے لیکن کیا اچھا ہو کہ "منافع کم"، کا زریں اصول دکان دار اپنے دلوں پر نقش کر لیں، البتہ جہاں کمی منافع سے اضافہ فروخت کی گنجایش نہ ہو وہاں تخفیف سے سراسر نقصان ہو گا۔

ہو۔ لیکن ہم آگے چل کر واضح کریں گے کہ بعض حالتوں میں کیوں کر اِس ٹکس سے سرکار اور عوام کو یکساں نقصان پہنچ سکتا ہو۔

اب سوال پیدا ہوتا ہو کہ کس اُصول کے مطابق مکانات پر ٹکس قائم کرنا چاہیے کسی زمانہ میں تو یورپ کے اکثر ممالک میں مکان کے دریچے دروازے یا روشن دان شمار کر کے اُن کے مطابق ٹکس وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن ظاہر ہو کہ حیثیت مکان کے یہ قابل اعتماد معیار نہ تھے اور طرز عمارت بدل کر ٹکس سے کم و بیش بچنا ممکن تھا اِس لئے اوّل اوّل تعمیر مکان کی اصلی لاگت اور کچھ عرصہ بعد لاگت تعمیر کا موجودہ تخمینہ تعین ٹکس کا معیار قرار پایا لیکن عام مشاہدہ ہو کہ مکان کی خوبی و قیمت میں عمارت سے کہیں زیادہ موقع کا دخل ہو۔ چنانچہ اِس سے قبل جا بجا لگان و قیمت زمین کی بحث میں موقع کا اثر زرعی اور بالخصوص سکنی اراضیات کی قیمت و آمدنی پر بالتفصیل واضح کیا جا چکا ہو۔ ایسی مثالوں کی کوئی کمی نہیں کہ بے موقع عالیشان عمارات پر باموقع معمولی مکانات کو لوگ بہت زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ اوّل الذکر قسم کی عمارتوں کا کرایہ بمقابلہ آخرالذکر مکانات کے بہت کم ہوتا ہو اور نیز بصورت فروخت بے موقع عمارات کی لاگت تعمیر کا عشر عشیر بھی ملنا دشوار ہو جاتا ہو۔ چنانچہ محاورہ ہو کہ فلاں عمارت کے بانی کے دام بھی وصول نہیں ہوتے اِس کے برعکس عمدہ موقع کے مکانات کی قیمت لاگت تعمیر سے دس گنا زیادہ بآسانی بڑھ سکتی ہو۔ بس واضح ہوا کہ اصلی لاگت یا اُس کا موجودہ تخمینہ بھی حیثیت مکان کا عمدہ معیار نہیں بلکہ کسی مکان کی حیثیت کا معیار اُس کا کرایہ سمجھنا چاہیئے جو کرایہ داروں سے وصول ہو سکے۔ جو جتنے زیادہ کرایہ کے مکان میں رہتا ہو اُسی قدر خوشحال سمجھا جانا چاہیئے۔ بے موقع اور کم کرایہ کے محض عالیشان مکانات میں رہنے سے لوگ امیر شمار نہیں کئے جا سکتے اور نہ ایسے مکانات مالکوں کے حق میں بمقدار لاگت دولت سمجھنے چاہئیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہو کہ قدیم بے موقع محلات مسمار کرانے کا خرچ ملبہ کی قیمت سے بھی بڑھ جاتا ہو اور صاف کرائے بغیر زمین سے

حصہ سوم
باب ۱

کوئی آمدنی حاصل نہیں ہو سکتی، ایسی صورت میں گویا مکان ایک قسم کی دولت منفی ہے جو آمدنی زمین میں مزاحم ہوتی ہے اور جس سے سبکدوش ہونے کے واسطے خرچ ناگزیر ہے۔

کسی نئی سڑک کے کنارے، جہاں صرف دکانات کی طلب ہو قدیم وضع کی وسیع اور عالی شان مستحکم عمارت جس کا کوئی خواستگار نہ ہو یا ہو تو بہت تھوڑا کرایہ دے یا تو سراسر دولت ہی نہیں یا لاگت تعمیر سے صدہا گنا کم۔ با موقع مکان کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ہاؤس ٹیکس کا معیار مکان کا کرایہ ہونا چاہیئے نہ کہ اصلی لاگت تعمیر یا اس کا موجودہ تخمینہ معیار کی مذکور الصدر بحث سے ایک عملی نتیجہ واضح ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ قدیم پس ماندہ شہر اور قصبات جو کبھی دولت و حشمت کا مرکز رہ چکے ہوں اور جہاں قدیم عالیشان عمارات کی کثرت ہو لیکن جہاں اب نکبت و افلاس کی ایسی گھٹا چھائی ہو کہ مکینوں کو اپنے آبا و اجداد کے مکانات کی مرمت کی بھی توفیق نہ ہو۔ جہاں بوجہ پس ماندگی مکانات کی طلب بھی بہت کم ہو اور محلات سے ترقی یافتہ شہروں کے جھونپڑوں کا بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہاں پر ہاؤس ٹیکس جاری کرنا عقل و مصلحت دونوں کے خلاف ہے۔ اگر ہاؤس ٹیکس کا معیار لاگت عمارت قرار پائے تو علاوہ خلاف اصول ہونے کے ہاؤس ٹیکس مکینوں کو جلد تباہ کر کے خود بھی فنا ہو جائے گا اور اگر کرایہ مکانات معیار رہو تو اول ہی سے کچھ وصول نہ ہوگا۔ بہر صورت ٹیکس ناکامیاب رہے گا اور بصورت اول مکینوں کی مزید تباہی کا بھی باعث ہوگا۔

رہے ایسے قصبات جہاں ایک سرے سے عمدہ عمارات ہی نہ ہوں اور غربا جھونپڑوں اور کچے مکانات میں بستے ہوں وہاں پر ہاؤس ٹیکس کا رواج خارج از بحث ہے پس ہاؤس ٹیکس صرف جدید خوشحال اور ترقی پذیر شہروں کے واسطے موزوں ہے جہاں مکانات کی بہت مانگ ہو۔ اور کرایہ اعلیٰ ہو۔ ایسی جگہ ٹیکس کی مقدار بھی بہت کثیر رہے گی اور لوگوں پر بار بھی نہ ہوگا۔

جو قصبہ بہت سے خوش حال لوگوں کا وطن ہو جہاں انھوں نے عمدہ عمارات بنا رکھی ہوں اور وقتاً فوقتاً آ کر رہتے ہوں لیکن جہاں کاروباری مرکز نہ ہونے کی وجہ سے مکانات کی مانگ کم ہو اور زیادہ کرایہ وصول نہ ہو سکے وہاں ہاؤس ٹکس بمعیار لاگت قایم کرنا بھی مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن ایسے قصبات شاذ و نادر مل سکتے ہیں۔ اکثر تو یہی ہوتا ہے کہ ترقی پذیر شہروں اور کاروباری مرکزوں میں جہاں مکانات کی بہت مانگ ہوتی ہے اور کرایہ اعلیٰ ہوتا ہے خوش حال لوگ رہتے ہیں اور پس ماندہ قصبات میں جہاں قدیم عمارات ہوں یا نہوں مکانات کا کرایہ اور اُن کی حیثیت اونیٰ ہوتی ہے جن میں غریب خاندان رہتے ہیں۔

بڑے شہروں کی دیکھا دیکھی یہ جو ہر قصبہ میں محصول جنگی توڑ کر ہاؤس ٹکس جاری کرنے کا خبط ہر طرف پھیل رہا ہے یہ نہایت غیر عاقلانہ نقالی ہے جس کا کبھی کبھی میونسپلٹی اور باشندگان شہر کو سخت خمیازہ اُٹھانا پڑے تو عجب نہیں۔ ہاؤس ٹکس فی نفسہ بہت اچھا سہی لیکن اس کے واسطے موقع و محل شرط ہے۔ ایک ہی دوا یا غذا کسی کے حق میں آبِ حیات اور کسی کے حق میں سم قاتل ہو سکتی ہے۔

اُسی سلسلہ میں یہ نکتہ بھی جتانے کے قابل معلوم ہوتا ہے کہ ہاؤس ٹکس بمعیار لاگت تعمیر وصول کرنے سے یہ اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ ٹکس سے بچنے کی خاطر لوگ عمدہ عمارتیں بنانا کم کر دیں اور شہروں کی شان و خوبصورتی میں فرق آجائے اکثر خوش حال لوگ تعمیر میں محض شان و خوبصورتی کی خاطر دل کھول کر دولت لگاتے ہیں اور اس بیش خرچی سے کرایہ میں کوئی نمایاں اضافہ نہیں ہوتا۔ البتہ عمارتیں نہایت مستحکم اور قابل دید ہوتی ہیں، ایسی ہی عمارتیں ہر ترقی یافتہ شہر کی آرایش سمجھنی چاہئیں اور ٹکس بمعیار کرایہ اُن سے کسی طرح بھی مزاحم نہ ہوگا۔ مزید براں ٹکس بمعیار کرایہ مقابلۃً کم گراں گزرتا ہے، وجہ یہ کہ کرایہ حیثیت عمارت سے کہیں زیادہ موقع پر منحصر ہوتا ہے اور عمدگی موقع بالعموم عام ترقیات کا نتیجہ ہوتی ہے، مالک مکان کو اپنی گرہ سے

بہت کم خرچ کرنا پڑتا ہی لہذا جب کہ کرایہ میں عام ترقیات سے اضافہ ہو تو اس کا ایک جزو بہبودی عامہ کے واسطے بطور ٹکس دینا مالک مکان کو کیوں کر گراں گزر سکتا ہی۔ معیار لاگت کے مقابلہ میں بمعیار کرایہ اگر ٹکس کی مقدار زیادہ بھی رہے تو دینے والے کو ناگوار اس وجہ سے نہیں گزرنا چاہیے کہ محض موقع کی بدولت جو عام ترقیات کا آفریدہ ہی مکان کی حیثیت سے کہیں بڑھ کر وہ کرایہ مل رہا ہی، اگر اس میں سے حصہ طلب کیا جائے تو کیا بیجا ہی۔ اِس کے برعکس اگر ٹکس بمعیار لاگت معیار کرایہ کے مقابل میں زیادہ ہو تو مالک مکان اپنے کو دوگونہ بدقسمت سمجھے گا وجہ یہ کہ کرایہ تو مکان کی حیثیت سے کم ملتا ہی اور ٹکس کرایہ کی حیثیت سے کہیں زیادہ ادا کرنا پڑتا ہی۔ گویا مکان کی عمدگی سے بجائے نفع کے نقصان پہنچتا ہی۔

اگر کوئی چیز درحقیقت وہی رہے تب بھی اکثر محض ظاہری صورت بدل جانے سے اسکا اثر طبیعت پر مختلف پڑ سکتا ہی، فطرت انسانی کا یہ ایک نہایت نتیجہ خیز خاصہ ہی جس کا لحاظ کرنے نہ کرنے سے بڑے بڑے کام سنورتے اور بگڑتے ہیں۔ ہاؤس ٹکس ادا تو بہر صورت کیا ہی جاتا ہی۔ محض معیار کا ادا کنندوں کی طبیعت پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہی۔ معیار لاگت بظاہر عمدہ عمارت بنانے کا جرمانہ معلوم ہوتا ہی اور معیار کرایہ گویا آمدنی میں سے ایک حصے کا جائز مطالبہ نظر آتا ہی۔

انکم ٹکس کی طرح ہاؤس ٹکس سے بھی غریب لوگ جو کچّے مکانات اور جھونپڑوں میں رہتے ہیں مستثنی کرنے بلحاظ انصاف و مصلحت ضروری ہیں۔ نیز جبکہ بمعیار کرایہ ہاؤس ٹکس قایم کیا جائے تو مکان کی مرمت اور درستی کے تخمینی مصارف کرایہ میں سے اول منہا کر دینے چاہئیں گویا کرایہ کی خالص آمدنی پر ٹکس قایم ہونا چاہیے یہاں پر یہ جتانا غیر ضروری ہی کہ جو لوگ خود اپنے مکانات میں رہیں اُن کے مکانوں کے کرایہ کا تخمینہ کیا جا سکتا ہی۔ البتہ جو مکانات غیر معمولی طور پر وسیع اور عالی شان ہوں کہ گردونواح میں ان جیسے مکانات کا کوئی کرایہ دار ہی نہ مل سکے

اور جن کے کرایہ کا تخمینہ دشوار ہو وہاں بطور خاص معیار لاگت استعمال کیا جا سکتا ہی لیکن ایسی صورتیں بہت کم پیش آتی ہیں اور معیار کرایہ میں شاذ و نادر مزاحم ہوتی ہیں۔

ہاؤس ٹیکس کے حسن و قبح اور اس کے معیار سے بحث کرنے کے بعد اب ہم اس کا تعدیہ تحقیق کرنا چاہتے ہیں یعنی دیکھنا یہ ہی کہ ہاؤس ٹکس کا ادا کنندہ کون ہوتا ہی اور مورد کون عملاً ٹکس کس سے وصول کیا جاتا ہی اور حقیقتاً اس کا بار کس پر پڑتا ہی۔ اس غرض کے واسطے اوّل ٹکس کی چند خصوصیات سمجھانی ضروری معلوم ہوتی ہیں۔

ہاؤس ٹکس سے جو رقم وصول ہو وہ دو طرح پر صرف ہو سکتی ہی۔ یا تو ایسے کاموں میں کہ مکان داروں کو آرام پہنچے مثلاً شہر کے گلی کوچوں کی صفائی اور روشنی۔ نل کا پانی مفت ابتدائی تعلیم یا اس کے برعکس ایسی مدوں میں کہ ٹکس دہندوں کو کسی قسم کا اس سے نفع پہنچتا معلوم نہو۔ مثلاً ایسے قدیم قرض اور اُس کے سود کی ادائیگی جو کسی مفید کام میں لگا ہو مگر بوجہ ناکامیابی ضائع ہو گیا ہو۔ جیسے کہ کسی قصبے میں صفائی کی زمین دوز نالیاں یا نل کا پانی جاری کرنے میں بہت سا روپیہ صرف کیا جائے مگر بالآخر اسکیم ناقابل عمل ثابت ہو اور کل لاگت اکارت جائے یا مثلاً امرا سے لیے ہوئے ہاؤس ٹکس کا جز و غربا کے مفت علاج پر صرف ہو تو اس ٹکس سے براہ راست امرا کو فائدہ محسوس نہ ہوگا۔ بحالت اوّل ہاؤس ٹکس اصطلاحاً ٹکس **فیض رساں** اور بحالت ثانی ٹکس **بے فیض** کہلائے گا۔ بلحاظ وسعت حلقہ بھی ٹکس کی دو قسمیں ہیں، **لوکل** یا **مقامی** جو کسی خاص شہر تک محدود ہو، **امپیریل** یا **ملکی** جو کہ تمام ملک سے یکساں وصول کیا جائے نیز مقامی اور ملکی کے بین بین ٹکس کی تیسری قسم **پراونشیل** یا **صوبہ وار** بھی ہے ملک کے کسی حصہ یا صوبہ میں رائج ہو۔ اس سے قبل معیار ٹکس کی بحث میں ابھی واضح ہو چکا ہی کہ کسی مکان کا کرایہ عمارت کی حیثیت اور زمین کے موقع پر منحصر ہی اگر دو یکساں حیثیت والے مکانوں سے جو شہر کے مختلف حصوں میں واقع ہوں ۱۴۰ اور ۶۰ روپیہ ماہوار کرایہ وصول ہو تو

آخر الذکر کرایہ میں (۶۰ - ۴۰) ۲۰ روپیہ کرایہ موقع زمین شمار ہوگا۔ اگر تعمیر کو بھی ایک قسم کی دیر پا زراعت فرض کریں اور اس کے کرایہ کو زرعی پیداوار تو لگان کی مذکورالصدر بحث کی روشنی میں یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ جو کرایہ بمد عمارت وصول ہو وہ درحقیقت اُس **اصل قائم** کا سود مع مطالبات فرسودگی وغیرہ ہے جو بہ شکل عمارت منتقل ہے اور جو کرایہ بوجہ موقع زمین ملے وہ زرعی لگان کی مانند حسن اتفاق اور ایسے اسباب کا آفریدہ ہوتا ہے جن پر مالک زمین کو بہت کم قابو حاصل ہو۔ اگر کرایہ پر چلانے کی نیت سے مکانات تعمیر کرائے جائیں تو گویا تعمیر بھی یک گونہ شغل اصل ہے اور عمارات اصل قائم کی ایک شکل۔ ظاہر ہے کہ جس حالت میں عرصہ تک ایسے اصل قایم یعنی عمارات پر بشرح مناسب سود و مطالبات فرسودگی وغیرہ بہ شکل کرایہ وصول ہونے کی امید نہ ہو کوئی مکانات بنا کر غیر پیدا آور کام میں اپنا روپیہ کیوں پھنسانا گوارا کرے گا۔ اور جب کہ مکانات کی مانگ اس قدر ہو کہ بے موقع سے بے موقع مکان کا کرایہ بھی کم از کم اصل قایم کا سود و مطالبات پورے کر سکے تو باقی مکانات کا موقع جس قدر عمدہ ہوگا کرایہ بھی اسی قدر زیادہ ہوگا اور یہ اضافہ کرایہ لگان میں شمار ہوگا۔

لگان کی تفصیل اور موجودہ اجمال پر غور کرنے سے بخوبی واضح ہوگا کہ زمین خواہ زرعی ہو یا سکنی اس کا معاشی لگان یا کرایہ یکساں اسباب وحالات کا آفریدہ ہے اور بہر صورت وہ نرخ پیداوار یا کرایۂ مکانات کے اضافہ کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث اور کسی حالت میں وہ مصارف پیدایش کا جزو شمار نہیں ہو سکتا۔ المختصر کرایۂ مکانات کے دو جزو ہوتے ہیں کرایہ عمارت جس کو اصل قائم کا سود اور مطالبات خطر و فرسودگی سمجھنا چاہیئے دوم کرایۂ زمین جو ہر طرح پر معاشی لگان ہوتا ہے،

ٹکس کی چار قسمیں۔ فیض رساں بے فیض اور مقامی وملکی اور کرایۂ مکانات کے دو جزو کرایۂ عمارات و کرایۂ زمین یہ سب واضح کرنے کے بعد اب ہم تعدیہ ٹکس کی کیفیت پیش کرنا چاہتے ہیں، بالعموم تو عمارت و زمین ایک ہی شخص کی ملک ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ خود ہی

اپنے مکانات میں رہتے ہیں لیکن زیادہ سے زیادہ تین شخصوں کا ایک ہی مکان سے تعلق ہو سکتا ہی مالک زمین۔ مالک عمارت۔ اور کرایہ دار مکان بغرض صفائی بیان ہم اِن تینوں کا مکانات سے تعلق فرض کرتے ہیں اور اسی بحث سے بصورت دیگر جب کہ صرف دو یا ایک شخص کا مکان سے تعلق ہو نتائج اخذ کرنا دشوار نہ ہوگا۔

جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں رواج پایا جاتا ہی۔ فرض کرو کہ کوئی شخص کسی ہونہار شہر میں جہاں آبادی بڑھ رہی ہو مکانات کا کاروبار جاری کرے۔ یعنی کوئی کارخانہ یا دُکان کھولنے کے بجائے وہ مکانات تعمیر کرائے اور اُن کے کرایہ سے عمارات جیسے اصل قائم کا سود اور مطالبات خطر و فرسودگی وصول کرے۔ عمارات بنواتے وقت انتخاب موقع کا مسئلہ ازحد توجہ طلب ہوگا۔ ایسی بے موقع زمین کہ جہاں مکان بنانے سے بقدر سود اصل بھی کرایہ وصول نہ ہو سکے وہ مفت بھی لینا گوارا نہ کرے گا۔ جس زمین پر مکان بنانے سے اصل قائم کے سود اور دیگر واجبی مطالبات کے علاوہ کچھ وصول نہ ہو ایسی زمین بھلا وہ کیوں خریدنے لگا۔ البتہ اگر کوئی ایسی عمدہ موقع کی زمین ہاتھ لگے کہ وہاں پر مکان کا کرایہ سود و مطالبات سے بھی زیادہ وصول ہو سکے تو بیشک اِس کا خواستگار ہوگا۔ اِس مزید مقدار کرایہ کی حالت بعینہ معاشی لگان کی سی ہی۔ اب اگر وہ زمین خریدتا ہو تو اس کی قیمت اِس لگان کے حساب سے دے گا۔ اگر قیمت لگان سے کم پر زمین مل جائے تو کیا کہنا ورنہ زیادہ سے زیادہ اس قیمت تک زمین خریدلے گا، اِس سے زیادہ ادا اس وجہ سے نہیں کر سکتا کہ اس کو سراسر نقصان ہوگا۔ پس لگان کی قیمت سے کم یا مساوی رقم تک وہ زمین خریدے گا۔ لیکن چونکہ زمین کی قیمت گویا لگان کی قیمت ہی۔ یہی معاشی لگان خریدار کے حق میں اس اصل کا سود بن جائے گا جو اِس نے بطور قیمت زمین ادا کیا ہو۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ آپڑا۔ ہم اپنے مفروضہ پر قایم رہ کر خیال کرتے ہیں کہ زمین خریدنے کے بجائے اِس نے کچھ مدت کے واسطے کرایہ پر لے لی گویا

حصۂ سوم
باب ۱۲

مالک زمین و مالک مکان دو جداگانہ شخص ہے۔ اِس صورت میں بھی صاف ظاہر ہو کہ زمین کا کرایہ اس کے لگان کی مقدار سے کم ہو گا یا اس کے مساوی، اِس سے زاید نہیں ہو سکتا۔ دوسروں کی زمین کرایہ پر لے کر مکانات تعمیر کرانا اور اُن کو کرایہ پر چلا کر کرایہ کی آمدنی سے زمیندار کو کرایہ زمین ادا کرنا اور خود اپنے اصل قائم کا سود اور مطالبات وصول کرنا ہندوستان میں شاید عجیب معلوم ہو لیکن اکثر ترقی یافتہ ممالک میں اِس کا رواج پایا جاتا ہو۔ قاعدہ یہ ہو کہ ۹۹ برس کے واسطے مقررہ کرایہ پر زمین مستعار لے کر اس شرط سے مکانات تعمیر کیے جاتے ہیں کہ بعد انقضائے میعاد بحصول معاوضہ یا بلا معاوضہ مالک مکان عمارت و زمین سے دست بردار ہو کر اُن کو مالک زمین کے سپرد کر دے گا۔ کرایہ زمین و کرایہ مکان میں ایسی نسبت قایم کرنیکی کوشش کی جاتی ہو کہ مالک مکان کو عرصۂ معینہ میں اصل قایم پر بشرح مناسب سود بھی ملتا رہے اور بذریعۂ مطالبات فرسودگی اختتام میعاد تک کل اصل قایم واپس بھی آجائے۔ چونکہ اس کاروبار میں بوجہ وسعت زمانہ وغیر اختیاری تغیرات۔ نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔ مطالبات خطر کی شرح بھی بہت اعلیٰ ہو تو عجب نہیں۔ نیز ظاہر ہو کہ بوقت واپسی زمین عمارات کا معاوضہ نہ دینے کی حالت میں کرایہ زمین کسی قدر معاوضہ دینے کی حالت سے کم ہو گا۔ حاصل کلام یہ کہ ایک شخص اپنی لاگت سے کرایہ کی زمین پر مکان تعمیر کرا کر کرایہ پر اُٹھاتا ہو۔ کرایہ مکان میں سے اپنے اصل کا سود اور مطالبات ضروری وصول کرتا ہو اور نیز زمیندار کو کرایہ زمین ادا کرتا ہو۔ گویا ہمارے سابق مفروضہ کے مطابق مکان سے تین شخصوں کو تعلق ہو۔ مالک زمین۔ مالک عمارت و کرایہ دار مکان کے ہر دو مالکوں میں کرایہ جس اصول سے منقسم ہوتا ہو ہم ابھی واضح کر چکے ہیں۔ آمدم بر سر مطلب فرض کرو کہ ایسے بہت سے مکانات ہوں اور ان سب پر ہاؤس ٹکس قائم ہو۔ اب اگر ٹکس فیصد سالانہ ہو گا تو کرایہ دار اس کو بخوشی ادا کریں گے بلکہ اس ٹکس کی خاطر قرب وجوار سے آکر حلقۂ ٹکس میں آباد ہوں تو عجب نہیں، وجہ یہ کہ صفائی پانی روشنی جیسی ضروریات جب پیدائش

بر پیمانہ کبیر کے اصول پر باشندگان شہر کو مہیا کی جاتی ہیں تو اکثر نہایت ارزاں پڑتی ہیں اور اُن کی جو کچھ قیمت بطور ٹکس ادا کی جائے وہ بجائے گراں گزرنے کے مفید معلوم ہوتی ہی لیکن اگر ٹکس بے فیض ہو تو اس کا تعدیہ بہت ٹیڑھی کھیر ہی۔ تحقیق طور پر معلوم کر لینا کہ ٹکس کا مورد کون ہوگا از حد دشوار ہی۔ زیادہ سے زیادہ چند ایسے عام اصول قرار دیئے جا سکتے ہیں تعدیہ ٹکس جن کا کم و بیش پابند ہو اور بس۔ جیسا کہ معاشی لگان اور سرکاری مالگذاری کی مذکورہ بعد بحث سے بخوبی واضح ہی ٹکس کا جو حصّہ کرایہ زمین پر پڑے گا اس کا مورد زمیندار ہوگا۔ وہ کسی اور پر منتقل نہیں ہو سکتا حسب قرار داد تا انقضائے میعاد مالک عمارت زمیندار کو مقررہ کرایہ ادا کرتا ہی اور اس دوران میں اگر وہی اس کا متحمل ہو تو عجب نہیں لیکن ممکن ہی کہ تعین کرایہ میں اِس مستقبل خدشہ کا اُس ذی لحاظ رکھا ہو اور اگر بوقت تعیّن یہ ٹکس جاری ہو تو یقیناً اُس نے ٹکس کی وہ مقدار جو کرایہ زمین پر عائد ہو کرایہ میں سے منہا کر لی ہوگی۔

اب رہا ٹکس کا وہ جزو جو کرایہ عمارت پر پڑے۔ اِس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اگر یہ ٹکس محض مقامی ہی تاکہ لوگ قرب وجوار میں رہ کر بچ سکیں تو اِس خوف سے کہ مبادا کرایہ دار مکان چھوڑ دیں۔ مالک عمارت اِس کا بار کرایہ داروں پر توڈالنے سے رہے اگر کرایہ عمارت کی مقدار سود و مطالبات سے کچھ زیادہ ہو تو ٹکس کو خاموشی سے خود برداشت کریں گے اور بصورت دیگر اس کا کم و بیش بار زمیندار پر بھی منتقل ہو جائے گا یعنی کرایہ زمین میں مزید تخفیف ہوگی لیکن اگر یہ ٹکس مقامی نہیں بلکہ ملکی ہو تاکہ اس سے کرایہ دار کو کہیں بھی مفر نہ ہو تو مالکان عمارت کی حالت تو وہی ہوگی کرایہ داروں کے چلے جانے کا تو کچھ خوف نہیں جہاں جائیں گے ٹکس ادا کرنا پڑے گا۔ پھر بھلا وہ ٹکس سے بچنے کی خاطر کہاں جانے لگے۔ ایسی صورت میں اگر ٹکس کے مورد کرایہ دار بنیں تو عجب نہ ہوگا۔

چنانچہ مذکورۂ بالا وجوہات پر خیال کیا جاتا ہی کہ ہاؤس ٹکس فیض رساں کا مورد ہمیشہ

کرایہ دار ہوتا ہے۔ رہا ہاؤس ٹکس بے فیض اگر مقامی ہے تو اس کا مورد زمیندار ہوگا اور اگر ملکی تو کرایہ دار مالک عمارت کو بھی معاہدوں کی مجبوری سے کچھ دنوں ہاؤس ٹکس کا بار اُٹھانا پڑے تو عجب نہیں اِس عرصہ میں اغلب ہے کہ اس کو اصل کا سود و مطالبات کافی مقدار میں نہ مل سکیں اور نقصان اُٹھانا پڑے لیکن میعاد معاہدہ ختم ہوتے ہی وہ کرایہ دار یا زمیندار پر حسب حالات ٹکس کا بار منتقل کرے گا۔ معاہدہ سے آزاد ہونے کے بعد وہ مناسب منافع کے بغیر جدید کاروبار ہرگز جاری نہیں کرے گا۔ اور چونکہ بحالت مفروضہ اس کا کاروبار یعنی عمارات ہونہار شہروں میں ناگزیر ہیں اس لئے مقامی ٹکس زمیندار کو دینا پڑیگا اور ملکی ٹکس کرایہ دار کو۔ اِس بحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ چونکہ کرایہ زمین و مکانات از روئے معاہدہ اوقات معینہ کے واسطے مقرر ہوتے ہیں اور حسب دلخواہ ان میں جلد جلد رد و بدل ممکن نہیں۔

ہاؤس ٹکس کے انتقال میں معاہدات و نیز رسم و رواج عارضی طور پر مزاحم ہوتے ہیں یعنی تعدیۂ ٹکس میں دیر لگتی ہے فوراً اس کا عملدرآمد نہیں ہوسکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اداکنندوں کو مورد ہوئے بغیر بھی کچھ عرصہ تک ہاؤس ٹکس برداشت کرنا پڑتا ہے۔ لہذا وصولی ہاؤس ٹکس میں حتی الامکان اداکنندہ وہی مقرر کرنا چاہیئے جس کا مورد ہونا مقصود ہو۔ تاکہ کسی دوسرے غیر متعلق شخص کو فضول کچھ دنوں ٹکس سے زیربار ہونا نہ پڑے۔

ملک و جائداد غیر منقولہ مثلاً کھیت۔ باغات۔ مکانات دُکانات پر جو ٹکس قائم کیا جاتا ہے اس کے متعلق یہ نکتہ جتانا مفید اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بوقت فروخت ایسی ملک و جائداد کی آمدنی میں سے مقدار ٹکس منہا کرکے قیمت قرار دیجاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے واسطے ٹکس کا بار اُس شخص پر قائم رہ جاتا ہے جو بوقت تقرر ٹکس جائداد کا مالک تھا۔ بعد کے خریدار چونکہ ٹکس آمدنی سے منہا کرکے جائداد کی قیمت ادا کرتے ہیں اُن کو ٹکس سے صرف اسقدر سروکار ہے کہ ابتدائی مالک کی طرف سے سرکار کو ادا کرتے رہیں۔ البتہ خرید کے بعد اگر ٹکس بڑھے تو بقدر

اضافہ جدید مالک اس کا متحمل ہوگا۔ قدیم ٹکس کوئی ٹکس نہیں۔ جو ایک معاشی مقولہ ہے اس کا یہ بھی خاص مفہوم ہے۔ عام طور پر اس مقولہ سے یہ جتانا مقصود ہے کہ جب ٹکس پرانا ہو جاتا ہے تو کچھ لوگ اُس کے عادی ہو جاتے ہیں اور نیز کار و بار میں اِس کا پورا لحاظ کرنے لگتے ہیں جس کی وجہ سے اِس کا بار کم محسوس ہونے لگتا ہے۔

واضح ہو کہ ہاؤس ٹکس اور خصوصاً اس کے تعدیہ کی بحث کی دقّت اور پیچیدگی کا ہر ایک مستند مصنف نے کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ اس میں تعیّن تو قطعاً محال ہے۔ چند اغلب نتائج دریافت ہو سکتے ہیں جن کا ہر حالت میں ظہور پذیر ہونا یقینی نہیں۔ تاہم تھوڑی بہت جو کچھ معلومات بھی مہیّا ہو سکی ہے۔ تقرر ٹکس میں عملاً اس سے از حد مفید مدد لی جا سکتی ہے اور لی جاتی ہے۔

(۹) محصول چنگی بھی ٹکس بالواسطہ کی ایک قسم ہے اور فرانس۔ اٹلی اور ہندوستان میں بکثرت رائج ہے اس کی مخالفت اور تائید دونوں جاری ہیں۔ اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ چنگی کی چوکی پر مال رکنے سے ادا کنندہ کا وقت ضائع ہوتا ہے گویا طریق چنگی مال کی آمد و رفت میں تاخیر کا باعث ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ تجارت میں وقت بڑی چیز ہے مقدار محصول جس کا تعین بیشتر ملازمان چوکی کے ہاتھ میں ہوتا ہے حسب مرضی کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے واسطے خاص طور پر عملہ رکھنا پڑتا ہے جس سے مصارف فراہمی بہت بڑھ جاتے ہیں نیز مال چھپا کر بلا محصول داخل حد چنگی ہو سکتا ہے اور باوجود ہزار نگرانی یہ نقص کم و بیش ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ محصول چنگی کی نسبت سے کہیں زیادہ خردہ فروشی کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور چونکہ محصول اکثر ضروریات پر لیا جاتا ہے اس کا بار متوسط الحال اور غربا پر بہت زیادہ پڑتا ہے ساتھ ہی اس کے چند خوبیاں بھی محصول چنگی میں موجود ہیں۔ مثلاً جہاں صنعت و حرفت اور تجارت کا بازار گرم ہو اس محصول سے بہت معقول آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ نیز خردہ فروشی کی قیمت میں کوئی ایسا اضافہ نہیں ہوتا ہے کہ خریداروں پر نامناسب بار ہو۔ بوقت خریداری محصول

کو ٹکس کا علم تک نہیں ہوتا اور نیز بعض حالتوں میں خود ادا کنندہ کل محصول یا اس کے ایک حصہ کا خود مورد بن جاتا ہی نہ کہ خریدار۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ مقامی ٹکس کے واسطے اُس کا بدل ہاؤس ٹکس جو پیش کیا جاتا ہی اس کے اجرا میں اس سے بھی زیادہ اندیشے اور دقتیں لاحق ہوں گی۔ چنانچہ بہت سے ہندوستانی قصبات میں اب تک محصول چنگی بمقابل ہاؤس ٹکس ہر لحاظ سے قابل ترجیح اور لہذا رائج ہی،

(۱۰) اِس فیس کا ایک حِصّہ تو محض اُن خدمات کا معاوضہ ہوتا ہی جو سرکار بشکل قانونی داد رسی عدالتوں کے ذریعہ سے سرانجام دیتی ہی اور کم و بیش ٹکس ہوتا ہی جس کا بار حسب حالات یا قرار داد یا تو سب متعلقین پر پڑتا ہی یا بعض خاص پر۔ ایسے ٹکسوں کے تعدیہ کا کوئی عام اصول مقرر کرنا دشوار ہے۔

جہاں تک اِس کتاب میں گنجائش نظر آئی بحث ٹکس کا ایک سادہ اور مختصر خاکہ پیش کیا گیا۔ لیکن فی نفسہ یہ مسئلہ نہایت اہم اور توجہ طلب ہی۔ اور اس کی تفصیلی بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

حصّہ چہارم

مبادلۂ دولت

باب اٹھارہ

قیمت

تجزیہ (۱) مبحث مبادلہ کی اہمیت (۲) قانون تقلیل افادہ (۳) قانون طلب (۴) تغیر پذیری طلب (۵) بازار (۶) قدر و قیمت (۷) مسئلہ قیمت (۸) طلب مشترک و طلب مرکب (۹) رسد مشترک و رسد مرکب۔

۱۔ مبادلہ کا مفہوم اس کے لوازمات و شرائط اور مبادلہ کی مختلف صورتیں بعنوان استبدال و اشکال دولت بالتفصیل بیان ہو چکی ہیں ۵-۱-۳ یہاں مجملاً اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ مبادلہ سے مراد ہے چیزوں کا ایک دوسرے سے ادل بدل کرنا۔ مبادلہ کی بنا افادہ ہے اور قلت یعنی تعین مقدار اور تملیک کی شرط لابد۔ مبادلہ میں انتقال ملک اگرچہ معمولی ہے لیکن لازمی نہیں۔

مبادلہ کے متعلق دو جدید نکات کی تشریح یہاں ضروری ہے۔ پہلی بات توجہ طلب یہ ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت کسی دو چیز کے مبادلہ کے واسطے ایک خاص تیسری چیز کی وساطت لازمی سی ہو گئی ہے جس کو اصطلاحاً زر کہتے ہیں۔ اس چیز سے ہم عنقریب ایک جداگانہ باب میں مفصل بحث کریں گے۔ ۲-۳-۲ زر کے سیدھے سادے مفہوم سے ہر کوئی واقف ہے یعنی کوئی ایسی چیز جس کو ہر شخص بلا عذر اپنی چیز کے مبادلہ میں قبول کرے مثلاً روپیہ

پیسہ پونڈ۔ شلنگ اور ایسے ہی ہر ملک کی چیزوں کا براہِ راست مبادلہ آج کل شاذونادر ہی ہوتا ہی۔ پس ماندہ دیہات میں کھانے پینے کی چیزوں کا تو اول بدل ہو جاتا ہے مثلاً غلہ دیکر پھل اور ترکاری لینا۔ دودھ سے تیل بدلنا۔ حجام۔ سقہ کو غلہ بطور فصلانہ دینا۔ لیکن دیہات میں بڑی بڑی چیزوں کا مثلاً ہل بیل۔ کھاد۔ گاڑی اور شہروں میں چھوٹی بڑی ہر قسم کی چیزوں کا مبادلہ ہمیشہ زر کی وساطت سے ہوتا ہی جس کا نتیجہ یہ ہی کہ مبادلہ کا عمل واحد خرید فروخت کے دو عملوں میں تقسیم ہو گیا ہی جب ہم اپنی چیز کا زر سے مبادلہ کرتے ہیں تو ہماری طرف سے یہ عمل **فروخت** کہلاتا ہے اور مبادلہ میں ملے ہوئے زر کا جب کسی شئے مطلوبہ سے مبادلہ کرتے ہیں تو وہ **خرید** کہلاتا ہی۔ حالانکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فروخت وخرید کے ہر دو عمل کا نتیجہ درحقیقت اپنی چیز کا دوسرے کی شئے مطلوبہ سے مبادلہ ہوتا ہی اور زر محض ایک درمیانی وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ مثلاً آج کل سائکل اور گھوڑے کا براہِ راست مبادلہ تو بہت کم ممکن ہی لیکن مبادلہ کا نہایت سہل طریق یہ ہی کہ اول ہم اپنا گھوڑا کسی سوار کے ہاتھ بیچ دیں اور اس کی قیمت سے کسی سوداگر کی دوکان سے سائکل خرید لیں یعنی اول گھوڑے کا زر سے مبادلہ کریں جس کو فروخت کہتے ہیں۔ اور بعدہٗ زر کا سائکل سے جو خرید کہلاتا ہی۔ مگر سچ پوچھو تو خرید و فروخت کے دو عملوں سے بوسیلۂ زر صرف گھوڑے اور سائکل کے مبادلہ کا عمل واحد ظہور پذیر ہوا ہی۔ اس جدید طوالت نما طریق میں بڑی بڑی خوبیاں ہیں جن سے ہم آیندہ مفصل بحث کریں گے۔

۱-۳/۲۰ یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیئے کہ معاشی ترقیات نے مبادلہ کے عمل واحد کو خرید وفروخت کے دو عملوں میں تقسیم کر دیا ہی اور اپنی چیز اور شئے مطلوبہ کا براہ راست مبادلہ کرنیکے بجائے اب ایک تیسری چیز زر کی وساطت سے لوگ عمل مبادلہ پورا کرتے ہیں۔

مبادلہ کے متعلق دوسری بات قابل لحاظ یہ ہی کہ اب اس کی از حد کثرت ہی۔ کسی زمانہ میں تو ہر خاندان اپنی مختصر ضروریات بیشتر خود ہی پوری کر لیتا تھا۔ اور مبادلہ کی بہت کم نوبت آتی تھی

ناگزیر ضروریات زندگی مثلاً کھانا کپڑا اور مکان۔ سب اہل خاندان مل جُلکر مہیا کر لیتے تھے لیکن معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ ایک تو ضروریات میں روزافزوں اضافہ شروع ہوا دوسرے طریق تقسیم عمل کی اشد ضرورت اور اس کے بیش بہا فوائد بھی نمایاں ہونے لگے۔ نوبت بانیجا رسید۔ کہ آجکل نہ صرف ضروریات کی تعداد بہت بڑھی ہوئی ہے اور بڑھ رہی ہی بلکہ اُن کی بہم رسانی کے واسطے ہم عموماً تمام وکمال دوسروں کے محتاج ہیں اور اسی طرح دوسرے ہمارے محتاج ہیں۔ ہر ایک شخص دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے میں مصروف ہی اور اپنی ضروریات دوسروں سے حاصل کرتا ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ اپنی ضروریات خود اپنے ہاتھ سے براہ راست بہم پہنچانے کے بجائے وہ اپنے حسب حال دوسروں کے واسطے کوئی ایک یا زیادہ ضروریات مہیا کر کے مبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کل ضروریات جن کو دوسروں نے اُس کی طرح بہم پہنچایا ہی۔ حاصل کر لیتا ہی۔ کسان غلہ اُگاتا ہی باغبان پھل پھول لگاتا ہی۔ موچی صرف جوتہ بناتا ہی۔ جولاہا صرف کپڑا بنتا ہی۔ لوہار قفل بناتا ہی۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہی۔ سوداگر طرح طرح کے مال منگاتا ہی لیکن ہر پیشہ وحرفہ والا بیشتر دوسروں کی ضروریات مہیا کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہی اور صرف ایک یا چند ضروریات بہم پہنچا کر مبادلہ کے طفیل سے اپنی ہر قسم کی کل ضروریات بلا دقت وپریشانی حاصل کر لیتا ہی۔ کیا یہ کچھ کم تعجب ناک اور دلچسپ بات ہی کہ سہولت و ارزانی آمد و رفت اور قیام امن و امان کی بدولت صنعت وحرفت اور تجارت نے وہ فروغ پایا ہی کہ ترقی یافتہ ممالک کے لوگ مدت العمر ایسی چیزیں تیار کرتے رہتے ہیں کہ جن کو وہ برائے نام بھی خود استعمال نہیں کرتے اور جو اُن لوگوں کی ضروریات میں داخل ہیں جو ہزارہا میل دور رہتے ہیں اور جن کی صورت کبھی خواب میں بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ دور اُفتادہ لوگ بھی اپنی طرف سے ان کے واسطے کوئی نہ کوئی ضرورت بہم پہنچانے میں مصروف رہتے ہیں۔ حضرت مولانا روم علیہ الرحمۃ کا قول ہی ؎

ہر یکے ناصح برائے دیگراں ناصحِ خود یافتم کم درجہاں

اگر عامل سے ہم ضروریات بہم پہنچانے والا مراد لیں تو اس شعر کو یوں بدل کر ہم موجودہ معاشی حالات کے مطابق بنا سکتے ہیں۔

ہر یکے عامل برائے دیگراں عاملِ خود یافتم کم ایں زماں

یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں ہے کہ اگر طریق تقسیم عمل یوں اختیار نہ کیا جاتا اور ہر ایک شخص جدا جدا خود اپنی ضروریات مہیا کرنے کی کوشش کرتا تو موجودہ حاصل شدہ ضروریات کا عشر عشیر بھی میسر نہ آتا اور معاشی ترقیات خواب وخیال سے بھی باہر تھیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ طریق مبادلہ کل معاشی ترقیات کی شرط اولیں ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معاشی جدوجہد کی باقی تین صورتیں یعنی پیدائش تقسیم اور صرف دولت اسی مبادلہ دولت کی خوبیوں اور برکات کی شرح اور تفسیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مبادلہ اور خصوصاً مسئلہ قیمت جس سے ہم ابھی بحث کریں گے بالاتفاق علم المعیشت کا سنگ بنیاد مانا گیا ہے اور ہر ایک مستند مصنف نے اس کی تشریح وتوجیہ میں پوری قابلیت صرف کی ہے، مل کو بھی بخیال خود اپنے اسی مبحث کے بیان پر ناز تھا اور انگلستان کے مشہور معاشی پروفیسر **مارشل** نے بھی مسئلہ قیمت میں سب سے زیادہ جدت اور نازک خیالی دکھانے کی کوشش کی ہے اور اس کی تصنیف کا یہ جزو بہت زیادہ قابل قدر مانا جاتا ہے۔ اگر مبادلہ کا رواج نہ ہوتا تو دنیا طریق تقسیم عمل۔ پیدائش بر پیمانہ کبیر صنعت وحرفت اور تجارت غرضکہ کل معاشی ترقیات سے بالکل محروم رہ جاتی اور موجودہ گوناگوں تعیشات کا تو ذکر کیا ہے۔ بغیر مبادلہ روکھا سوکھا کھانا۔ موٹا جھوٹا کپڑا اور ٹوٹا پھوٹا مکان جیسی مایحتاج زندگی بھی محض اپنی قوت بازو سے ہر شخص کو جداگانہ میسر آنی محال ہوتیں چنانچہ واقعہ ہے کہ مبادلہ کی قلت وکثرت معاشی پس ماندگی وترقی کا عام معیار ہے مبادلہ کی دوسری اہمیت یہ ہے کہ معاشی جدوجہد کے ہر شعبہ سے اس کا اساسی تعلق ہے۔ زمین محنت اصل اور تنظیم ان ہی

چار عاملین کے اتفاق عمل پر پیدائش دولت کا دارومدار ہے اور دولت معاشی زندگی کی روح رواں ہے۔ لگان۔ اُجرت۔ سود۔ اور منافع تقسیم دولت کی یہ چاروں شکلیں درحقیقت ان چاروں عاملین کی خدمات کا معاوضہ یعنی قیمت ہیں۔ اسی واقعہ سے ہم آگے چل کر پھر بحث کرینگے۔ یہاں مجملاً یہ دکھانا مقصود ہے کہ تقسیم دولت درحقیقت مبادلہ دولت کی ایک خاص صورت ہے وجہ خصوصیت یہ ہے کہ عام مبادلہ میں تو چیزوں کی قیمت خریدار و فروشندہ کی آزادانہ کھینچ تان سے قرار پاتی ہے لیکن لگان اُجرت۔ سود اور منافع جیسی قیمتیں مدتوں تک رسم رواج اور قانون کی آفریدہ رہیں اور صرف چند روز سے اُن کے تعین میں فریقین کو عام قیمت کی سی آزادئ مقابلہ حاصل ہوئی ہے پیدائش دولت کا براہِ راست و نیز سلسلہ تقسیم دولت مبادلہ پر انحصار ظاہر ہے رہا صرف دولت سو جب پیدائش و تقسیم دولت مبادلہ پر اس قدر منحصر ہیں تو صرف دولت کا بدرجہ اولیٰ مبادلہ کے زیر اثر ہونا یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مبادلہ کا اثر معاشی زندگی کے رگ و پے میں سرائت کئے ہوئے ہے اور اس کی بحث علم المعیشت کے ہر شعبہ سے علاقہ غالب رکھتی ہے یوں تو اس علم کی کل بحثوں میں باہمی تعلق ہے اور ہونا چاہیئے۔ لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ مبادلہ کا تعلق سب سے زیادہ وسیع اور اکثر باقی تعلقات کا باعث بنا ہے۔

مبادلہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ قیمت کا ہے یعنی مبادلہ یا خرید فروخت میں کسی چیز کی قیمت کیونکر قرار پاتی ہے تعین و تبدل قیمت کن کن قوانین کا پابند ہے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند دیگر قوانین سمجھنا ضروری خیال کرتے ہیں کیونکہ مسئلہ قیمت کے نکات سمجھنے میں اُن سے بیحد مدد ملے گی۔

۲۔ معاشرت کے اکثر قوانین پر ہم بیخبری میں عمل کرتے رہتے ہیں لیکن ان سے واقف ہوئے بغیر اُن کے نتائج ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ معاشیات کے مسائل میں جہاں عدم تعین کی

حصۂ چہارم باب۱

خامی عام ہے وہاں یہ خوبی بھی ہے کہ بلا اہتمام معاشی قوانین ہر ایک کے تجربہ میں آتے رہتے ہیں اور اکثر واقف ہونے پر تعجب ہوتا ہے کہ ایسی پیش پا افتادہ بات سے ہم اب تک کیوں غافل رہے اور اس کے نتائج پر کیوں غور نہ کیا چنانچہ قانون تقلیل افادہ پر انسان تو درکنار حیوان بھی عامل نظر آتے ہیں اور شیر خوار بچے تک اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اگر کسی بھوکے پیاسے جانور کے سامنے دانہ پانی رکھا جائے تو اول اول وہ کیسی جلدی جلدی کھانا پینا شروع کرتا ہے لیکن بتدریج کھانے پینے کی رفتار گھٹنے لگتی ہے۔ پھر وہ کچھ ٹھہر ٹھہر کر تھوڑا تھوڑا آہستہ کھاتا ہے حتیٰ کہ سیر ہو کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ پھر خواہ دانہ پانی کتنا ہی اُس کے سامنے کیوں نہ رکھا رہے منہ ڈالنا تو درکنار اُدھر نظر بھی نہیں ڈالتا۔ وجہ کیا ہے جب کہ بھوک پیاس جیسی احتیاج کی شدت تھی تو دانہ پانی کے ابتدائی جرعوں میں اس کو افادہ بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا لیکن جوں جوں بھوک پیاس گھٹتی گئی مابعد جرعوں میں افادہ بھی کم پڑتا گیا حتیٰ کہ جب سیری ہو گئی یعنی احتیاجات بہ تمام وکمال رفع ہو گئیں تو باقی ماندہ دانہ پانی سے اُسوقت افادہ بھی غائب ہو گیا جس کی وجہ سے وہ اب اُن کو سونگھتا بھی نہیں البتہ بھوک پیاس کی احتیاجات نمودار ہونے پر پھر حسب سابق اُن میں بھی افادہ محسوس ہونا یقینی ہے۔ بھوکا بچہ کسقدر زور سے ماں کا دودھ کھینچتا ہے لیکن کچھ سیر ہونے پر اُس کی شیر کشی کی سرگرمی بھی گھٹنے لگتی ہے۔ اب وہ لگاتار دودھ نہیں پیتا بلکہ درمیان میں رُک رُک کر مسکرا لیتا ہے حتیٰ کہ ماں کی چھاتی سے جُدا ہو جاتا ہے اور بعد سیری ایک قطرہ دودھ نہیں کھینچتا وجہ یہی ہے کہ گھٹتے گھٹتے دودھ کا افادہ اُس وقت بالکل غائب ہو جاتا ہے پھر وہ شیر کشی کی تکلیف کیوں گوارا کرے ان فطری واقعات سے ایک نہایت نتیجہ خیز معاشی قانون کا پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ شئے مطلوبہ کی مقدار جسقدر بڑھے گی اُس کے مزید جرعوں کا افادہ مقابلۃً گھٹے گا حتیٰ کہ اگر مقدار بہت بڑھ جائے تو افادہ گھٹتے گھٹتے مابعد جرعوں میں بالکل مفقود ہو جائیگا یا یوں کہیئے کہ اضافہ مقدار شئے مطلوبہ اور اُس کے افادہ کے اضافہ میں نسبت معکوس ہے، مقدار

حصہ چہارم
باب ۳

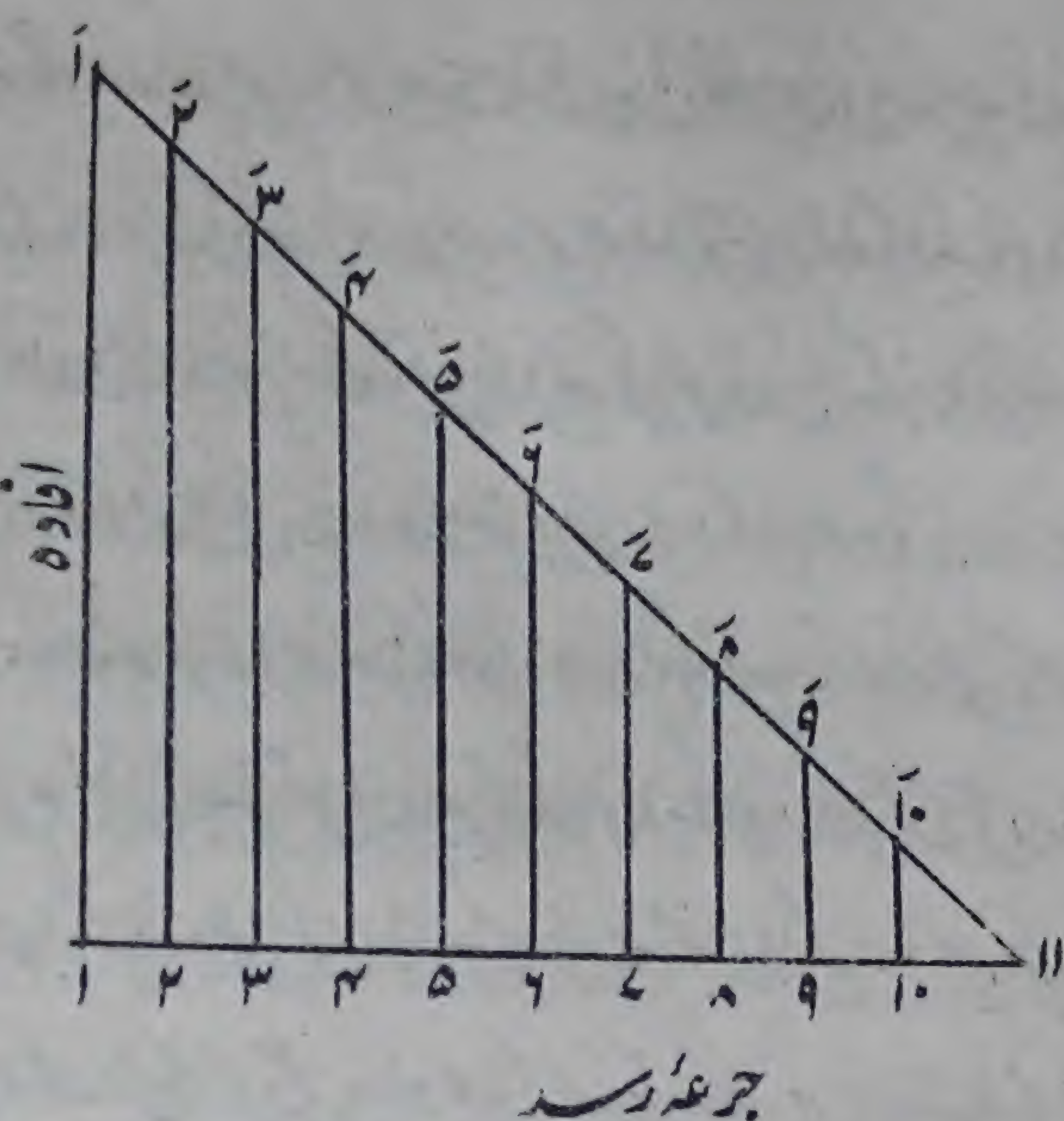
جتنی ہو زیادہ ہو گی مزید مقدار کا افادہ نسبتاً اُتنا ہی کم ہو گا حتی کہ مقدار بڑھتے بڑھتے افادہ بالکل غائب ہو جانا ممکن ہے۔ پانی کو لو کیسی ضروری چیز ہے اور جب کہ زندگی کا اس پر اسقدر دار و مدار ہو کہ چند گھنٹے اُس کے نہ ملنے سے مرنے کی نوبت آجائے تو اُس کے افادہ سے بڑھکر کس کا افادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن پانی کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے ہمارے نزدیک اُس کا افادہ گھٹتا ہے حتی کہ پانی بڑھتے بڑھتے افادہ غائب ہونے سے وہ اُلٹا وبال جان و مال ہو جاتا ہے، پیاس کی شدت میں ہر شخص سرد پانی کے ایک گلاس کے خاطر اپنی کل جیب خالی کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے اگر دور دور تک کنواں اور چشمہ نہو تو ایسے خشک میدان میں پانی دو چار ملکہ دس پانچ روپیہ سیر تک بھی فروخت ہونا ممکن ہے، جبتک کسی داموں پانی میسر آسکتا ہے کوئی پیاس سے مرنا کیوں گوارا کرے گا لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ایسی اعلیٰ شرح سے ہم صرف اس قدر پانی خرید نا پسند کرینگے جو پیاس کو تسکین دیسکے لیکن اگر قیمت میں کچھ مناسب تخفیف ہو جائے تو شاید ہم اسقدر پانی خرید لیں گے کہ علاوہ پینے کے ہم اس سے مُنہ ہاتھ بھی دھو سکیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پانی کی اس مزید مقدار سے کہ جو مُنہ ہاتھ دھونے میں کام آئے ہم کو بمقابلہ پینے کے پانی کے کم افادہ محسوس ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم نے اُس کو پینے کے پانی کی شرح سے خرید نا پسند نہ کیا لیکن قیمت گھٹ کر جب اس کے کم تر فائدہ کے مساوی ہو گئی تو ہم نے اس کو خرید لیا۔ اب اگر پانی کی قیمت اور بھی گھٹ جائے تو ہم اس کی اتنی مقدار خرید سکتے ہیں کہ پینے اور مُنہ ہاتھ دھونے کے علاوہ اس سے نہا دھو بھی لیں لیکن نہانے دھونے کے پانی کا افادہ پینے اور مُنہ ہاتھ دھونے کے پانی کے افادہ سے کم ہے اس لیے جب تک قیمت میں مزید تخفیف نہ ہوئی ہم نے اُس کو نہ خریدا لیکن جب ہم کو اپنی کل ضروریات کے واسطے پانی ملجائیگا تو باقی پانی میں ہمارے نزدیک کوئی افادہ نہیں رہے گا جس کی وجہ سے ہم اس کو کم سے کم قیمت پر حتی کہ مُفت بھی لینا گوارا نہیں کرینگے کیوں کہ وہ غیر ضروری بلکہ

حصہ چہارم
باب ۱

تکلیف دہ بار ہوگا اور کچھ نہیں بعینہ یہی حال باقی تمام چیزوں کا ہے جسقدر مقدار مطلوبہ بڑیگی ہماری احتیاج متعلقہ کی شان گھٹے گی اور ساتھ ساتھ مزید اضافوں کا افادہ بھی نسبتاً کم ہوتے ہوتے مفقود ہو جائیگا۔ حتیٰ کہ مزید اضافہ مفت بھی گوارا نہ ہوگا۔ گرمی میں برف ہر ایک کو کس قدر مرغوب ہے اگر چار آنہ سیر فروخت ہو رہا ہو تو ہم صرف پانی سرد کرنے کے واسطے سیر دو سیر خرید لیں گے۔ لیکن اگر نرخ صرف ایک آنہ سیر رہ جائے تو ہم آئس کریم بنانے کی تیاری کرینگے اور اگر صرف آدھ آنہ یا پیسہ سیر ہو جائے تو ہم آم اور دوسرے پھل بھی برف میں لگا کر خنکی کا لطف اُٹھائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ پانی والے برف سے آئس کریم والے برف کا افادہ ہماری نظر میں کم ہے اور پھل والے کا اس سے بھی کم جب ہی تو قیمت گھٹے بغیر ہمنے اس کو نہیں خریدا۔ اگر ہمارے نزدیک افادہ یکساں ہوتا تو تینوں مقدار کو اول ہی شرح سے نہ خرید لیتے۔ لیکن جب ہماری کل احتیاجات رفع ہو جائینگی تو ہم برف کی اینٹ پتھر برابر بھی قدر نہ کریں گے اور کوئی مُفت بھی دیگا تو نہ لیں گے۔

حاصل کلام یہ کہ قانون تقلیل افادہ سے مراد اس واقعہ کا بیان ہے کہ مقدار شئے مطلوبہ میں جسقدر اضافہ ہوتا ہے مزید مقدار کا افادہ بھی نسبتاً گھٹنے لگتا ہے حتیٰ کہ مقدار بڑھتے بڑھتے افادہ کا اضافہ بالکل بند ہو سکتا ہے اگر احتیاج ایک قطعہ اراضی فرض کر کے شئے مطلوبہ کی مقداریں جرعے قرار دیئے جائیں اور افادہ کو پیداوار مان لیں تو قانون تقلیل افادہ بعینہ قانون تقلیل حاصل کا مشابہ نظر آئے گا اور اس کی کل تفصیل اس پر بلا کم و کاست عائد ہوگی اور تفصیل کی تطبیق از حد دلچسپ بھی ثابت ہوگی۔ ذیل کی شکل سے قانون تقلیل افادہ کا مفہوم اور اس کی قانون تقلیل حاصل سے مشابہت بخوبی واضح ہے۔

حصہ چہارم
باب ۵



اس شکل میں ایک سے لیکر ۱۱ تک برابر رسد کے گیارہ جرعے دکھائے گئے ہیں اور ۱۱َ-۲۲َ سے ۱۰۱۰َ تک علی الترتیب ہر ایک جرعہ کا جداگانہ افادہ جو قانون تقلیل افادہ کے بموجب گھٹتے گھٹتے گیارہویں جرعہ پر غائب ہو جاتا ہے اور یہ وہ حالت ہوگی جب کہ احتیاج مطلوبہ بہ تمام و کمال پوری ہو جائیگی۔ آ سے لیکر ۱۱ تک کشش اصطلاحاً خط افادہ کہلائے گی۔

اس قانون کا مفہوم بتانے کے بعد اب اس کے متعلق ہم ضروری نکات واضح کرنا چاہتے ہیں، اوپر کی بحث سے صاف ظاہر ہے کہ ہم نے افادہ کا معیار وہ قیمت قرار دی ہے جو ہم کسی مقدار کے واسطے ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔ مثلاً اگر برف ۲ آنہ سیر تک دو سیر خریدیں تو گویا دو سیر برف کا افادہ ہمارے نزدیک ۴ر سے زیادہ نہیں قیمت کے اس معیار پر چند نہایت وزن دار اعتراض عائد ہوتے ہیں اور یہ معیار کسی حال میں بھی سراسر قابل اعتماد نہیں مانا جاسکتا لیکن چونکہ اس سے بہتر معیار میسر نہیں آسکا لہذا با ہمہ نقائص اسی کو غنیمت سمجھ کر اختیار کر لیا۔ اس معیار کے نقائص کی دقیق و پیچیدہ بحث بخوف پراگندگی و حیرانی ترک کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ البتہ قیمت کے متعلق ایک نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ عام مقولہ ہے کہ غریب کا ایک

حصہ چہارم باب ۱۳

پیسہ اور امیر کا ایک روپیہ برابر ہے۔ یعنی غریب کی نظر میں ایک پیسہ کی وہی قدر ہوتی ہے جو امیر کی نظر میں ایک روپیہ کی پندرہ روپیہ ماہوار آمدنی والے کو ایک روپیہ جسقدر عزیز ہوگا ہزار روپیہ ماہوار والے کے نزدیک تیس روپیہ کی بھی اُس کے برابر قدر نہ ہوگی۔ اس واقعہ سے اول تو قانون تقلیل افادہ کا مزید ثبوت ملتا ہے۔ گویا روپیہ کی مقدار میں جسقدر اضافہ ہوتا ہے ہر مزید اضافہ کا افادہ نسبتاً گھٹتا جاتا ہے حتیٰ کہ جب آمدنی پندرہ سے بڑھ کر ہزار ہوتی ہے تو تیس روپیہ کا افادہ گھٹتے گھٹتے بہ مشکل سابق کے ایک روپیہ کی برابر رہجاتا ہے۔ یعنی جس افادہ کا غریب آدمی ایک روپیہ معاوضہ تخمینہ کرتا ہے۔ اُسی افادہ کا امیر آدمی تیس روپیہ کر سکتا ہے۔ برف پینے کا خصوصاً گرمیوں کے رمضان میں کس روزہ دار کو اشتیاق نہیں ہوتا۔ لیکن امیر آدمی پانچ روپیہ سیر تک برف نہیں چھوڑتے۔ متوسط الحال ۴ آنہ ۸ آنہ سیر تک خرید سکتے ہیں اور غریب ایک آنہ سے آگے جرأت نہیں کرتے' ان تینوں طبقوں کے تخمینہ میں وہی ایک سیر برف کا افادہ ۵ روپیہ ۸ آنہ اور ایک آنہ کی برابر ہے گویا یہ تینوں قیمتیں ایک ہی مقدار افادہ کے بظاہر جدا گانہ معیار معلوم ہوتے ہیں لیکن قیمت دہندوں کے تخمینہ میں اُن قیمتوں کا جو افادہ ہے وہ برابر ہے لہذا یہ تینوں معیار بھی یکساں ہیں ان کے ظاہری عدم مساوات سے دھوکہ میں نہ پڑنا چاہیے اگرہ روپیے ۸ آنہ اور ایک آنہ کا افادہ بالکل برابر بھی نہو تو فرق اس کا عشر عشیر بھی نہوگا جو ان مقداروں میں بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ اور سہولت بیان کی غرض سے ہر ایک قلیل فرق نظر انداز کر کے ان تینوں رقموں کا ہر طبقہ متعلقہ کی نظر میں یکساں افادہ قرار دینا کچھ بعید از حقیقت نہیں ہے پس قیمت کو معیار افادہ قرار دینے میں قیمت دہندہ کی مالی حالت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ یہ ممکن بلکہ اغلب ہے کہ امیر اور غریب اگر ایک ہی چیز ایک روپیہ اور ۴ آنہ کو خریدیں تو غریب کی نظر میں اُس چیز کا افادہ بمقابلہ

امیر کے چوگنا ہو۔ اگرچہ صرف مقدار قیمت پر نظر کرتے ہوئے غریب کے نزدیک اس چیز کا افادہ صرف ایک چوتھائی معلوم ہوگا۔ خوشحالی اور افلاس کے علاوہ معیار قیمت پر طبیعت کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگ فراخ حوصلہ اور خرّاچ ہوتے ہیں، بعض تنگ دل اور خسیس یکساں مالی حالت ہوتے ہوئے بھی آخرالذکر کا ایک روپیہ اول الذکر کے دس روپیہ کے برابر ہو تو عجب نہیں مالی حالت اور طبیعت کے علاوہ شوق اور مذاق کا اختلاف بھی معیار قیمت میں قابل لحاظ ہے۔ چند مایحتاج زندگی مثلاً کھانا پانی وغیرہ تو ایسی ہیں کہ ان کی کم و بیش ہر شخص کو احتیاج ہوتی ہے لیکن بیشمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا کسی کو بدرجہ عشق و دیوانگی شوق ہے اور بعض اُن سے نفور اور گریزاں ہیں اور بعض کے نزدیک اُن کا ملنا نہ ملنا یکساں مختلف المذاق لوگ جب کسی ایک ہی چیز کی یکساں قیمت ادا کریں تو وہ قیمتیں باوجود مساوات یقیناً مختلف مقدار افادہ کی معیار ہوں گی اور اگر مختلف قیمتیں ادا کریں تو ان سب کا باوجود عدم مساوات ایک ہی مقدار افادہ کا معیار ہونا اغلب نہیں تو ممکن ضرور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی قیمت بیشمار مدارج افادہ کا معیار ہو سکتی ہے اور ایک ہی مقدار افادہ کے بیشمار معیار قیمت قرار پا سکتے ہیں گویا ہر ایک قیمت ایک جداگانہ معیار ہے۔ اس نتیجہ کی صحت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن کسی ملک کے معاشی حالات کے مطالعہ اور تحقیق میں اتنے دقیق فرق قابل لحاظ نہیں ہوتے اور ان کو نظرانداز کر کے عام حالات پر اکتفا کرنے سے بجائے کسی نقص و خامی کے علمی تحقیقات میں بیش بہا اور ناگزیر سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرق معیار کے متعلق بھی یہی طریق برتا جاتا ہے اور اس سے کوئی مفر بھی نہیں۔

قانون تقلیل افادہ کے عملدرآمد میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہماری احتیاج معین ہے۔ اور اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اگر مقدار شئے مطلوبہ کے اضافہ کے ساتھ ساتھ

حصہ چہارم باب ۱
احتیاج میں بھی اضافہ ہو تو اس قانون کا عمل اگر قطعاً نہ رُکے تو ملتوی ضرور ہو سکتا ہی مثلاً ہم بشرح ۴ آنہ سیر پینے کے واسطے سیر بھر برف روز منگائیں۔ اور اگر نرخ گھٹ کر ایک آنہ سیر رہ جائے تو ۴ سیر برف اور منگا کر شاید آئس کریم بھی جما ڈالیں لیکن اگر ہمارے ہاں مہمان آجائیں تو ہم بنرخ چار آنہ سیر صرف پینے کے واسطے ۵ سیر منگالیں تو عجب نہیں۔ گویا جس نرخ سے ہم پہلے صرف ایک سیر برف خریدنا پسند کرتے تھے اُسی نرخ سے ہم نے اب وہ مقدار خرید لی جو ہم پہلے کمتر نرخ سے خریدنا پسند کرتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ احتیاج بڑھنے سے قانون تقلیل افادہ کا عمل ملتوی ہوگا۔ لیکن پینے کے ۵ سیر برف سے زائد برف آئس کریم کے واسطے ہم ابھی شاید ایک آنہ سیر سے زیادہ خریدنے پر آمادہ نہ ہونگے گویا قانون کا عمل پہلے ایک سیر بعد شروع ہو جاتا تھا اور اب احتیاج بڑھنے پر ۵ سیر بعد شروع ہوتا ہے۔

اگرچہ قانون تقلیل افادہ سے کوئی مفر نہیں۔ احتیاج کے اضافہ سے اس کے عمل کا التوا البتہ ممکن ہی لیکن یہاں پر یہ نکتہ سمجھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ کبھی کبھی اس قانون کے عمل سے قبل اس کے برعکس قانون تکثیر افادہ کا عمل عارضی طور پر نمودار ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ موجودہ مقدار شئے مطلوبہ موجودہ احتیاج کے واسطے ناکافی ہو اسی حالت میں مقدار شئے مطلوبہ کا اضافہ اس حد تک کہ موجودہ احتیاج رفع ہو جائے۔ قانون تکثیر افادہ کا پابند ہوگا۔ مثلاً ہم کو آئس کریم بنانا مقصود ہے اور اس کے واسطے پانچ سیر برف درکار ہے۔ اب اگر صرف ۳ سیر برف دستیاب ہو سکے تو ہم اس کو شاید بہت کم قیمت پر بھی خریدنا پسند نہ کریں کیونکہ اس سے ہماری موجودہ احتیاج پوری نہیں ہو سکتی لیکن اگر مقدار مطلوبہ دستیاب ہو تو ضرور مناسب قیمت پر خرید لیں گے کپڑوں کے ٹکڑے خاص اسی وجہ سے کم تر قیمت پر فروخت ہوتے ہیں کہ اُن سے حسب دلخواہ لباس

تیار نہیں ہو سکتا۔ جو کپڑا پورے سوٹ کے واسطے ہم بقدرے گز چار روپیہ کے نرخ سے بخوشی خریدیں اس کا تین گز کا ٹکڑا جس سے ایک چھوٹا کوٹ تیار ہو سکے ہم تین روپیہ گز کو بھی نہ خریدیں تو کیا عجب اور اگر ٹکڑا اس سے بھی چھوٹا ہو تو کوئی اپنے بچے کے واسطے بہت سستا خرید لے گا اسی طرح علاوہ موقع کے زمین کی وسعت کا اس کی قیمت پر اثر پڑتا ہے اگر احتیاج سے کم ہے تو بھی قیمت گھٹے گی اور اگر احتیاج سے بہت زیادہ ہے تو بھی قیمت پر مضر اثر پڑے گا۔ البتہ اگر احتیاج کے موافق ہے تو خریدار اپنے تخمینہ کے مطابق اعلیٰ سے اعلیٰ شرح ضرور پیش کر دے گا۔ مکانات کے کرایہ کا بھی یہ حال ہے غرض کہ قانون تقلیل افادہ اور تکثیر افادہ کا عملدرآمد حسب طریق بالا ہر خرید و فروخت میں مخفی یا نمایاں ہوگا۔

قانون تقلیل افادہ کی ایک سادہ مثال سے مزید تشریح کر کے اس کے متعلق چند ضروری اصطلاحات اور بیان کرنا چاہتے ہیں فرض کرو کہ کوئی خاندان چار کا عادی ہے اب اگر نرخ چار ۳۲ روپیہ فی ڈبہ ہو تو شاید ایک ہی ڈبہ خریدا جائے۔ دوسرا ڈبہ اس وجہ سے نہیں خریدینگے کہ قانون تقلیل افادہ کے بموجب اس کا افادہ پہلے ڈبہ کے افادہ سے کمتر ہوگا۔ لہٰذا اس کی قیمت پہلے ڈبہ کے برابر نہیں ہونی چاہیئے۔ البتہ اگر نرخ گھٹکر ۲۴ روپیہ ڈبہ رہجائے تو بجائے ایک کے دو ڈبے خریدے جاسکیں گے۔ اس صورت میں ۲۴ روپیہ دوسرے ڈبہ کے افادہ کا معیار ہوگا۔ اور چونکہ پہلا ڈبہ ۳۲ روپیہ تک خرید لیا جاتا اس لیئے ۳۲ روپیہ اُسکے افادہ کا معیار رہا۔ ان دونوں ڈبوں کے مجموعی افادہ کا معیار واحد (۳۲ + ۲۴) ۵۶ روپیہ ہوا۔ اور ایسے مجموعی افادہ کو اصطلاحاً **افادۂ کلی** کہتے ہیں۔ لیکن اگر خریدار کے نزدیک پہلے ڈبہ کا افادہ ۳۲ روپیہ ہے اور دوسرے کا ۲۴ روپیہ۔ سب ڈبے بلا تفریق ایک ہی نرخ سے فروخت ہوتے ہیں اور دونوں ڈبے ۲۴-۲۴ روپیہ کو خریدے گئے صاف ظاہر ہے کہ

حصہ چہارم
باب ۱

خریدار کی نظر میں پہلے ڈبہ پر بقدر (۳۲-۲۴) ۸ روپیہ زائد افادہ حاصل ہوا جس کو اصطلاحاً نفع المصرف کہتے ہیں نیز واضح ہو کہ ۲۴ روپیہ دوسرے ڈبہ کے افادہ کا معیار ہے اگر ۳۰ یا ۲۸ روپیہ ڈبہ فروخت ہوتا تب بھی ایک ہی ڈبہ خریدا جاتا اور اس پر (۳۲-۳۰) ۲ روپیہ یا (۳۲-۲۸) ۴ روپیہ نفع المصرف حاصل ہوتا لیکن دوسرے ڈبہ کے خریدنے کی نوبت نہ آتی کیونکہ اس کا افادہ ۲۴ روپیہ سے زیادہ نہیں ہے لہذا دو ڈبہ خریدنے کی شرط یہ نکلی کہ وہ ۲۴ روپیے کو فروخت ہوا اور جب ایک ڈبہ ۲۴ روپیے کو فروخت ہوا تو دوسرا اس سے زائد قیمت پر کیوں فروخت ہونے لگا۔ اس میں کیا لال لگے ہیں فروشندہ کی نظر میں ڈبہ ڈبہ سب برابر محض اس وجہ سے کہ خریدار کی نظر میں ڈبوں کے افادہ کی مقدار مختلف ہیں فروشندہ اپنی طرف سے بلحاظ فرق افادہ اُن کی قیمت میں فرق قرار نہیں دیسکتا۔ اگر اس کو دو ڈبے فروخت کرنے مقصود ہیں تو وہ یہ نہیں کرسکتا کہ ایک ڈبہ ۳۲ کو اور ساتھ ہی اس قسم کا دوسرا ڈبہ ۲۴ روپیے کو دے بلکہ ایک ساتھ دونوں ڈبے ۲۴-۲۴ کو فروخت کریگا اور دوسرے ڈبہ کا کمتر افادہ جس کا معیار ۲۴ روپیے ہے اصطلاحاً **افادہ مختتم** کہلائے گا۔ یہاں پر یہ اصول بھی واضح ہوا کہ جب کوئی شخص ایک ہی چیز کے چند عدد یا کوئی مقدار خریدے تو اُس کی نظر میں ہر عدد یا جزو مقدار کا افادہ مختلف ہوگا اور جسقدر عدد یا مقدار میں اضافہ ہوگا ایسے اضافہ کے افادہ میں نسبتاً تخفیف ہوتی جائیگی اور ان تمام عددوں یا مقدار کی قیمت وہ بشرح مساوی ادا کریگا تو وہ آخری عدد یا جزو مقدار کے کمترین افادہ کے برابر ہوگی بالفاظ مختصر کسی چیز کی شرح قیمت اُس کے افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے جس کی وجہ سے بمقدار افادہ زائد خریدار کو نفع المصرف حاصل ہوتا ہے۔ افادہ کلی۔ افادہ مختتم اور نفع المصرف کا مفہوم اور اُن کا باہمی تعلق ذیل کی مثال سے بیان بالا کے ساتھ ساتھ اور بھی واضح ہوگا یہاں پر حسب بالا فرض کرتے ہیں کہ کس کس قیمت پر کتنے کتنے چار کے ڈبے خریدے جاسکتے ہیں

اور ہر صورت میں افادہ کلّی۔ افادہ مختتم اور نفع المصرف کیا کیا ہوگا۔

اعلیٰ ترین قیمت	تعداد ڈبّہ	افادہ کلّی	افادہ مختتم	نفع المصرف
۳۲ روپیہ	۱	۳۲	۳۲	
۲۴ "	۲	۵۶(۲۴ + ۳۲)	۲۴	۸(۴۸ - ۵۶)
۱۸ "	۳	۷۴(۱۸ + ۵۶)	۱۸	۲۰(۵۴ - ۷۴)
۱۴ "	۴	۸۸(۱۴ + ۷۴)	۱۴	۳۲(۵۶ - ۸۸)
۱۲ "	۵	۱۰۰(۱۲ + ۸۸)	۱۲	۴۰(۶۰ - ۱۰۰)

اعلیٰ ترین قیمت سے مراد وہ قیمت ہے کہ جس سے زائد دینے پر خریدار رضامند نہ ہو اور چونکہ وہ افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے قانون تقلیل افادہ کے طفیل سے اعلیٰ ترین قیمت ادا کرنے پر بھی خریدار کو کچھ نہ کچھ افادہ زائد یعنی نفع المصرف حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اکثر واقع ہوتا ہے اگر حُسنِ اتفاق سے خریدار کو اعلیٰ ترین سے کم قیمت پر چیز ملجائے تو اُس کو دوگونہ نفع المصرف حاصل ہوگا مثلاً مثال بالا میں اگر نرخ چار ۲۸ روپیہ ڈبّہ ہو تو پہلے ڈبّہ پر بھی اس کو (۳۲ - ۲۸) ۴ روپیہ نفع المصرف ملے گا اور اگر نرخ بجائے ۲۴ کے ۲۰ روپئے رہ جائے تو پہلے دو ڈبوں پر بجائے ۸ روپیہ کے {(۳۲ + ۲۴) - ۴۰} ۱۶ روپیہ نفع المصرف دستیاب ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ قیمت ۲۰ روپیہ ہوجانے پر بھی وہ صرف دو ہی ڈبّے خریدے گا۔ تیسرا ڈبہ جس کا افادہ اس کی نظر میں زیادہ سے زیادہ ۱۸ روپیہ ہے نہیں خرید سکتا کیونکہ ایسا کرنے میں نفع المصرف ۱۶ روپیہ سے گھٹکر {(۳۲ + ۲۴ + ۱۸) - ۶۰} صرف ۱۴ روپیہ رہ جاتا ہے گویا تیسرا ڈبہ خریدنے میں سراسر نقصان ہے البتہ قیمت ۱۸ روپیہ ہوجانے پر وہ تین ڈبے ضرور خریدلے گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے نفع المصرف ۱۶ روپیہ سے بڑھکر ۲۰ روپیہ ہوجائیگا اور اگر حُسنِ اتفاق سے قیمت گھٹ کر ۱۷ روپیہ رہجائے تو نفع المصرف میں اور بھی

حصہ چہارم باب۱ اضافہ ہو سکے گا۔ لیکن اسی طرح پر قیمت جب تک ۴ روپیہ نہ ہو گی وہ چار ڈبے ہرگز نہ خریدے گا۔

مذکورہ بالا بحث سے قیمت کا ایک پہلو بخوبی واضح ہو گیا۔ اور اس توضیح سے آگے چل کر مسئلہ قیمت کی تحقیق میں ہم کو بیش بہا مدد ملے گی۔ خریدار کی طرف سے شرح قیمت ہمیشہ کسی چیز کی افادہ مختتم کی مساوی ہوتی ہے یا اس سے کم افادہ مختتم سے زیادہ اس لئے نہیں ہو سکتی کہ اس میں خریدار کا سراسر نقصان ہے نفع المصرف کی مقدار بجائے بڑھنے کے الٹی گھٹ جاتی ہے جو قیمت کہ خریدار کی طرف سے پیش کی جائے اصطلاحاً قیمت طلب کہلاتی ہے اور جیسا کہ خوب واضح ہو چکا ہے وہ افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہے یا اس سے کم۔

قانون طلب (۲) قانون تقلیل افادہ اس غرض سے یوں بالتفصیل بیان کیا گیا کہ وہ قانون طلب کا سنگ بنیاد ہے اور لہذا مسئلہ قیمت سے بھی اس کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ اساسی قوانین اول جداگانہ واضح کر دینے سے بعد کو مسائل متعلقہ کے بیان میں بہت صفائی وسہولت پیدا ہو جاتی ہے قوانین کا صرف حوالہ کافی ہوتا ہے اور تمامتر توجہ مسئلہ زیر بحث پر یکجا رہتی ہے۔ قانون طلب کو ہم کئی طرح پر بیان کر سکتے ہیں لیکن وہ سب ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلو ہوں گے۔

(الف) کسی چیز کی مقدار رسد جس قدر بڑھے گی اُس کی قیمت بھی ضرور گھٹے گی۔ یعنی اگر کوئی چیز زیادہ مقدار میں فروخت کرنا مقصود ہو تو اس کی قیمت گھٹانا لازمی ہوگا۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ ہر مزید اضافہ کا افادہ گھٹے گا اور قیمت افادہ مختتم سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

(ب) کسی چیز کی مقدار رسد جس قدر گھٹے گی اس کی قیمت بڑھے گی۔ قانون تقلیل افادہ کا اثر کثرت میں بہت قوی ہو جاتا ہے اور قلت میں اس کے برعکس پس جبکہ شے مطلوبہ کی مقدار برابر گھٹے گی تو افادہ مختتم کی مقدار میں اضافہ ہوگا۔ اور قیمت کو بھی اس کے ساتھ

بڑھانا پڑے گا۔

باب ۱۸ (ج) کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی جتایا جا چکا ہے یہ بات پیش نظر رکھنی از حد ضروری ہے کہ قانون تقلیل افادہ ونیز قانون طلب میں کسی چیز کی طلب کی حالت معین فرض کر لی جاتی ہے۔ طلب کا دار و مدار آبادی رسم و رواج اور لوگوں کے شوق و مذاق پر ہے نیز ایسی چیزوں کا جو شے زیر بحث کے بدل کے طور پر استعمال ہو سکیں طلب پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہے، قانون طلب بیان کرتے وقت ان تمام حالتوں میں سکون فرض کرتے ہیں گویا ان میں کوئی قابل لحاظ تغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس لئے شے زیر بحث کی طلب معین سی مانی جاتی ہے۔ مثلاً چاء کا رواج کثرت آبادی، ملکی آب و ہوا، رسم و رواج عام شوق و مذاق پر منحصر ہے کافی اور قہوہ کے رواج کی کمی بیشی کا بھی چاء کے استعمال پر اثر پڑتا ہے اگر ان حالات کے ردوبدل سے چاء کی طلب میں معقول اضافہ ہو تو قوانین تقلیل افادہ و طلب کا اثر ضعیف بلکہ قطعاً زائل ہو سکتا ہے اور اگر طلب بھی گھٹے تو ان قوانین کا عمل دس گنا قوی ہونا آسان ہے گویا طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی مخالف و معاون ہوتی ہے۔ لیکن قوانین بحالت مخالفت و معاونت اپنا عمل برابر جاری رکھتے ہیں۔ اس سے باز نہیں رہ سکتے۔ ان قوانین کا اثر دریافت کرتے وقت طلب کم و بیش معین فرض کی جاتی ہے اور ایسا مفروضہ کچھ زیادہ خلاف واقعہ بھی نہیں کیونکہ طلب میں بڑے بڑے تغیرات مدتوں بعد نمودار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان ہر دو قوانین کا عملدرآمد ہر طرف نظر آتا ہے۔

کبھی کبھی طلب کی حالت جلد بھی بدل جاتی ہے اور قانون طلب کے عمل میں ضعف آجاتا ہے۔ مثلاً شروع فصل میں جب کہ ہر شخص کو شوق ہوتا ہے خربزہ اور انبہ جیسے

پھلوں کی قیمت بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور عین ریزگے زمانہ میں قیمت بہت گھٹ جاتی ہے اس کا باعث قانون تقلیل افادہ اور قانون طلب سے صاف ظاہر ہے لیکن آخر فصل میں جب کہ ان پھلوں کی اتنی ہی کمی ہوجاتی ہے جتنی کہ شروع فصل میں ان کو معمولی قیمت پر بھی لوگ خریدنے کی پروانہیں کرتے۔ سوال ہوتا ہے کہ مقدار گھٹنے پر قیمت میں اضافہ کیوں نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ حالت طلب بدل گئی لوگوں کا کھاتے کھاتے جی بھر گیا۔ طبیعت سیر ہو گئی گویا شروع اور آخر فصل میں قانون طلب کا عمل بھی نمایاں نہیں ہوتا۔

یہ بھی اگر سننے میں آتا ہے کہ کسی چیز کی طلب بڑھنے سے اس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور طلب گھٹنے سے قیمت بھی گھٹ جاتی ہے یہ مقولہ صرف اس حالت میں صحیح ہے جبکہ مقدار رسد معین فرض کرلی جائے اول یہ کہ شے زیر بحث کی مقدار میں جلد اضافہ نہ ہوسکے۔ دوسرے یہ کہ شے مذکور سریع الزوال ہو اور عرصہ تک اچھی حالت میں نہ رہ سکے۔ مثلاً کچھ قدیم چیزیں فروخت کی جائیں اگر محققین آثار قدیمہ اُن کے شائق اور خواہاں ہونگے تو زر و جواہر کے ہموزن فروخت ہونا عجب نہیں ورنہ کوئی اُن کا پرسان حال بھی نہ ہوگا۔ علیٰ ہذا پھل پھول ترکاری مچھلی اور برف جیسی عام استعمال کی چیزیں بھی جب کہ طلب کم ہو کوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگتی ہیں کیونکہ فروخت نہ کرنے سے وہ جلد خراب ہوجاتی ہیں اور تھوڑی بہت جو کچھ قیمت ملتی ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے لیکن جب طلب بڑھتی ہے تو یہی چیزیں روپیوں کے حساب سے فروخت ہوجاتی ہیں۔ لیکن ایسی چیزیں کہ جن کی رسد بطور مذکورہ بالا معین ہو کم ہیں۔ بے شمار چیزوں کا تعلق زراعت صنعت و حرفت سے ہے تھوڑے عرصہ میں گھٹ بڑھ سکتی ہیں اور بطور ذخیرہ بلا خوف و خطر رکھی جاسکتی ہیں، ان کی رسد کے اضافہ و تخفیف میں جس قدر عرصہ لگے تب تک تو مذکورہ بالا مقولہ اُن پر بھی صادق آئے گا۔ لیکن اس کے بعد اُن کی قیمت قوانین تقلیل

حصہ چہارم
باب ۱۸

حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہوں گی اور طلب کی کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی محرک ہوگی۔ براہ راست قیمت کی کمی بیشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ مثلاً اگر شئے زیر بحث قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے تو اضافہ طلب و اضافہ رسد سے اس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہوجائے گا۔ اس کے برعکس بحالت قانون تکثیر حاصل قیمت میں تخفیف یقینی ہوگی، اسی طرح پر جب کہ طلب کی کمی سے رسد بھی گھٹے تو قانون تقلیل حاصل سے قیمت میں تخفیف ہوجانا عجب نہیں۔ لیکن قانون تکثیر حاصل ضرور قیمت میں اضافہ کردے گا۔

اس بحث سے مجملاً یہ اصول دریافت ہوگیا کہ فروشندہ کی جانب سے قیمت کیونکر قرار پاتی ہے یعنی کوئی چیز کس اصول کے مطابق کم سے کم قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں کی مقدار کم و بیش معین ہو اور ان میں جلد اضافہ نہ ہو سکے یا جو چیزیں جلد خراب ہوجائیں اور بطور ذخیرہ نہ رکھی جا سکیں۔ ان کی قیمت پر تو طلب کی کمی بیشی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ یعنی اُن کی قیمت بیشتر صرف قیمت طلب ہوتی ہے۔ لیکن دیگر بے شمار چیزیں جو کاشت اور صنعت و حرفت سے تیار ہوتی ہیں جن کی مقدار بھی بہت زیادہ تاخیر بغیر بڑھ سکے اور جو کچھ عرصہ بطور ذخیرہ بھی رہ سکیں اُن کی قیمت پر مصارف پیدائش کا بھی قابل لحاظ اثر پڑتا ہے اور مصارف پیدائش قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہیں۔ پس طلب کی کمی بیشی کا صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے عمل کی محرک ہوتی ہے۔ ورنہ قیمت من جانب فروشندہ براہ راست انھیں ہر دو قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ تقسیم دولت میں جا بجا واضح ہوچکا ہے کہ قیمت من جانب فروشندہ براہ راست مصارف مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور اس کو اصطلاحاً قیمت رسد کہتے ہیں۔

در اصل زیر بحث یہ مقولہ تھا کہ طلب بڑھنے گھٹنے سے چیز کی قیمت بھی بڑھتی گھٹتی

حصہ چہارم باب ۱۸

ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقولہ اسی حالت میں صحیح ہوتا ہے جب کہ مقدار رسد معین فرض کرلی جائے یا چیز سریع الزوال ہو۔ اسی سلسلہ میں ہم قیمت رسد کے اصول بھی مجملاً بیان کر گئے۔ لیکن باوجود خوف طوالت ہم ان اصول سے مسئلہ قیمت کے تحت میں پھر بحث کرینگے کیوں کہ ان کا صاف طور پر ذہن نشین ہونا نہایت ضروری ہے یہاں پر صرف ایک معمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کے سلجھانے میں اس قدر بحث ومباحثہ کے بعد کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ :

(الف) کسی چیز کی قیمت گھٹتی ہے تو اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور کسی چیز کی طلب بڑھ جانے سے اُس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے اس کی طلب گھٹ جاتی ہے لیکن کسی چیز کی طلب گھٹنے سے اُس کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔

ان دونوں مقولوں کا مفہوم وہی ایک ہے گو بظاہر ان میں سے ہر ایک میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ تخفیف واضافۂ قیمت ایک ہی وقت میں اضافہ طلب کا باعث و نتیجہ علی الترتیب کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اضافہ و تخفیف قیمت کا بھی علی الترتیب تخفیف طلب کا باعث و نتیجہ ہو سکنا سمجھ میں نہیں آتا، اس معمہ کا حل مذکور الصدر بحث میں بالتفصیل موجود ہے۔ لیکن مزید سہولت کی نظر سے ہم یہاں اتنا اشارہ اور کئے دیتے ہیں کہ قیمت گھٹنے سے طلب بڑھنے یا قیمت بڑھنے سے طلب گھٹنے میں طلب کی حالت میں سکون فرض کرلیا جاتا ہے اور یہ نتائج قیمت بڑھنے گھٹنے سے قانون تقلیل افادہ و قانون طلب کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں لیکن طلب بڑھنے سے قیمت بڑھنے یا طلب گھٹنے سے قیمت گھٹنے میں رسد کو معین یا سریع الزوال خیال کرتے ہوئے حالت طلب میں ردوبدل تصور کرتے ہیں بالفاظ دیگر اول دو حالتوں میں تغیر طلب کا

حصہ چہارم باب ۱۸

باعث تغیر قیمت ہے اور آخر دو حالتوں میں خود تغیر قیمت تغیر طلب کا نتیجہ ہے۔

اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اضافہ طلب کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں' اول جب کہ دیگر حالات کے تغیر سے اضافہ طلب نمودار ہو کر اضافہ قیمت کا باعث ہو' دوم جب کہ وہ حسب قانون تقلیل افادہ وقانون طلب تخفیف قیمت کا نتیجہ ہو۔ ان ہر دو جداگانہ قسم کے اضافہ طلب کو علی الترتیب اصطلاحاً **اضافہ طلب** و **گشائش طلب** کہیں گے۔ تخفیف طلب کے بھی یہی دو مفہوم ہو سکتے ہیں یعنی یا تو وہ اضافہ قیمت کا نتیجہ ہو یا دیگر حالات سے پیدا ہو کر تخفیف قیمت کا باعث ہو۔ ان ہر دو مفہوم کے لحاظ سے اس کو بھی علی الترتیب **تخفیف طلب** و **بست طلب** کہنا چاہیے۔ اسی اصول کے مطابق رسد میں بھی بعینہ چار قسم کی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اضافہ اور حقیقت رسد جو بطور خود پیدا ہو کر کمی و بیشی قیمت کا باعث ہو، گشائش و بست رسد جو طلب یا قیمت کی بیشی کمی سے نمودار ہو۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اضافہ طلب و گشائش رسد' اضافہ رسد و گشائش طلب تخفیف طلب و بست رسد، تخفیف رسد و بست طلب یہ دو دو تبدیلیاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور اول الذکر تبدیلی دوسری کا باعث ہوتی ہے۔

تغیر پزیری طلب

(۴۲) قانون تقلیل افادہ سے ہم کو یہ قانون طلب دریافت ہوا کہ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اس کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے۔

لیکن واضح ہو کہ قیمت وطلب کی ان معکوس تبدیلیوں میں کوئی نسبت مستقیم نہیں کبھی قیمت کی زرا سی تبدیلی طلب میں بہت بڑا فرق کر دیتی ہے اور کبھی معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے مثلاً ۲۰ - ۲۵ فی صدی قیمت گھٹنے سے طلب میں دو چند سہ چند اضافہ ہو سکتا ہے اور کبھی اس کے برعکس قیمت نصف بلکہ چہارم بھی ہو جائے تو بھی طلب میں کوئی

حصہ چہارم باب۳

نمایاں فرق نہیں پڑتا۔ علیٰ ہذا کبھی قیمت کے صرف دس بیس فی صدی چڑھنے سے طلب بحد نصف بلکہ چہارم گھٹ جاتی ہے اور گاہے قیمت دوگنی سہ گنی بھی ہو جائے لیکن طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہے کہ قانون تقلیل افادہ کے عمل کی رفتار کبھی سست ہوتی ہے اور کبھی تیز۔ اس سستی اور تیزی کے شرائط تو ہم ابھی بیان کرینگے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر رفتار سست ہے تو بہت زیادہ مقدار خریدی جائے پر بھی قیمت کم گھٹے گی یا یوں کہو کہ قیمت تھوڑی سی بھی کم ہو جائے تو طلب بہت بڑھ جائے گی اور اگر رفتار تیز ہے تو تھوڑی سی مقدار بڑھنے پر قیمت بہت زیادہ گر جائے گی یا بالفاظ دیگر باوجود قیمت بہت زیادہ تخفیف ہونے کے طلب میں نمایاں اضافہ نہ ہوگا۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جب قیمت کی تھوڑی سی تخفیف سے طلب میں بہت سا اضافہ ہو تو اس کے برعکس قیمت کا تھوڑا سا اضافہ طلب کی بہت زیادہ تخفیف کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر چاء کے ڈبے عصہ کے بجائے ۱۵ر کی شرح سے بہت زیادہ فروخت ہوں تو یقیناً ۱۵ر کی بجائے عصہ کی شرح سے بہت کم فروخت ہونگے۔ اب اگر قیمت کی قلیل تخفیف یا اضافہ سے طلب میں کثیر اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو اس واقعہ کو **تغیر پذیری طلب** اور طلب کو **طلب تغیر پذیر** کہیں گے علیٰ ہذا یہ بھی مثال سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اگر قیمت کے کثیر تخفیف سے طلب میں قلیل اضافہ نمودار ہو تو قیمت کے کثیر اضافہ سے طلب میں قلیل تخفیف ہوگی مثلاً اگر للعہ کے بجائے عصہ کے نرخ سے کوئی چیز صرف دس فی صدی زیادہ فروخت ہو تو عصہ کے بجائے للعہ کے نرخ سے صرف تقریباً دس فی صدی کم فروخت ہوں گی۔ پس اگر قیمت کی کثیر تخفیف یا اضافہ سے طلب میں قلیل اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو ایسی طلب کو **طلب غیر تغیر پذیر** سے تعبیر کرتے ہیں۔

طلب تغیر پزیر و غیر تغیر پزیر کے کچھ معیار مقرر نہیں کہ ان دونوں قسموں میں کوئی عام اور مستقل تفریق کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تغیر پزیری تو طلب کا ایک عام خاصہ ہے اور اس کے بیشمار مدارج ہیں جتنی تغیر پزیری بدرجہ اعلیٰ پائی جائے گی یعنی قیمت کی تھوڑی تبدیلی سے طلب میں کوئی بڑا فرق نمودار ہوگا تو اُسی قدر وہ طلب تغیر پزیر کہلانے کی زیادہ مستحق ہوگی اور اگر تغیر پزیری بدرجہ ادنیٰ پائی جائے یعنی قیمت کی بڑی تبدیلی سے بھی طلب میں نہایت معمولی فرق پیدا ہوا تو ایسی طلب غیر تغیر پزیر کہلائے گی حالانکہ زراسی تغیر پزیری اس میں بھی ضرور موجود ہے گویا طلب غیر تغیر پزیری و تغیر پزیر میں صرف تغیر پزیری کی کمی بیشی کا فرق ہے ورنہ تھوڑی بہت تغیر پزیری دونوں طلبوں میں موجود ضرور ہے۔

پس تغیر پزیری طلب کی مختصر تعریف یہ ہوگی کہ اگر قیمت تھوڑی گھٹنے سے طلب بہت بڑھے یا قیمت تھوڑی بڑھنے سے طلب گھٹے اور ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حالتیں لازم ملزوم ہیں تو طلب بہت تغیر پزیر کہلائے گی۔ اس کے برعکس اگر قیمت بہت گھٹنے سے طلب کم بڑھے یا قیمت بڑھنے سے طلب کم گھٹے اور یہ حالتیں بھی لازم و ملزوم ہیں تو طلب کم تغیر پزیر یا غیر تغیر پزیر شمار ہوگی، اسی تعریف کو بدل کر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر قیمت میں کچھ تخفیف ہونے سے طلب زیادہ بڑھے تو تغیر پزیر کہلائے گی اور اگر کم تو غیر تغیر پزیر علیٰ ہذا اگر قیمت میں کچھ اضافہ ہونے پر طلب میں بہت تخفیف ہو تو طلب تغیر پزیر ہے ورنہ غیر تغیر پزیر ہم نے قصداً تغیر پزیری طلب کو کئی طرز سے بیان کیا ہے۔ بظاہر تو اس سے دقّت اور پیچیدگی بڑھتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس طریق سے یہ قانون بہت عمدہ طور پر ذہن نشین ہوگا۔ البتہ زرا غور و توجہ شرط ہے۔ تغیر پزیری طلب ایک عام مشاہدہ ہے اور اس کے واقع ہونے سے تو کسی کو انکار ہو نہیں سکتا، دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ تغیر پزیری کن

حصہ چہارم باب ۱۸

کن قوانین کی پابندی ہی گیا ایسی چیزوں کے جن میں تغیر زیر زیادہ یا کم ہو چند عام اور مستقل علامات قرار پا سکتے ہیں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہی کہ جس سے تغیر زیر طلب کا پہلے ہی سے تخمینہ اور اندازہ کیا جا سکے۔ علمی تحقیقات اور عملی تجربہ سے تغیر زیر طلب کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں پیش کی جاتی ہیں۔

یوں تو دولت مندی و افلاس کے مدارج کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن مالی حالت کے بے شمار قلیل فرق نظر انداز کر کے چند طبقے ایسے قرار پا سکتے ہیں کہ ان کی مالی حالت میں بمقابلہ یکے با دیگرے عام فرق نمایاں ہو مثلاً خوش حال، متوسط الحال اور تنگ دست ان طبقوں میں کوئی مستقل حد فاصل قائم کرنی تو محال ہی۔ بہت سے لوگ طبقہ اول کے ادنیٰ زمرہ میں اور طبقہ دوم کے اعلیٰ ممبروں میں یکساں شمار ہو سکیں گے۔ لیکن پھر بھی علاوہ ان لوگوں کے جن کی کسی طبقہ میں شمولیت محقق نہ ہو سکے۔ ہر طبقہ کے گروہ کثیر کی مالی حیثیت میں مقابلۃً نہایت بین فرق نظر آئے گا، مالی حالت کی طرح قیمت کے مدارج بھی شمار سے باہر ہیں، ایک پائی سے لے کر کروڑہا روپیہ تک کے نرخ سے چیزیں فروخت ہوتی ہیں لیکن قلیل فرق نظر انداز کر کے مالی طبقوں کی طرح قیمت کے بھی ہم تین عام درجے مقرر کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ سے مراد ایسی قیمت ہی کہ جو خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو لوگ اس قیمت پر چیزیں نہ خرید سکتے ہوں۔ متوسط قیمت وہ ہی کہ لوگوں کو گراں نہ گزرے اور ادنیٰ قیمت سے چیزوں کی بے حد ارزانی مراد ہی کہ ہر کوئی دل بھر کر خرید سکے۔ صاف ظاہر ہی کہ قیمت کے یہ مدارج محض اضافی ہیں مستقل نہیں ہو سکتے۔ خوش حال طبقے کی نظر میں جو قیمت ادنیٰ ہی۔ تنگدستوں کے نزدیک وہ ضرور اعلیٰ ہوگی، متوسط الحال طبقہ جس قیمت کو اعلیٰ قرار دے خوش حال طبقہ اس قیمت کو متوسط سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح پر تنگدستوں کی متوسط قیمت۔ متوسط الحال کو ادنیٰ

معلوم ہوگی۔ غرض کہ ایک ہی قیمت خریداروں کی مالی حیثیت کے مطابق اعلیٰ۔ متوسط اور ادنیٰ محسوس ہوتی ہے۔ مالی حالت اور قیمت کے مدارج اور اُن کے باہمی تعلق تو عام مشاہدہ میں ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن احتیاطاً اول اُن کو ذہن نشین کرکے اب ہم تغیر پزیری طلب پر ان کا اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ واضح ہو کہ اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب عموماً غیر تغیر پزیر ہوتی ہے اور متوسط قیمت والوں کی تغیر پزیر، وجہ غور کرنے سے خود سمجھ میں آسکتی ہے۔ اعلیٰ قیمت چونکہ خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے اضافہ یا تخفیف کا اُن کی خریداری پر قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ چونکہ ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی خریدتے ہیں۔ اضافہ قیمت سے اُن کی قلیل طلب میں اور کیا تخفیف ہوسکتی ہے اور چونکہ قیمت اُن کے نزدیک نہایت گراں ہوتی ہے۔ اس کی تخفیف سے بھی طلب میں کوئی نمایاں اضافہ ہونا دشوار ہے۔ اس کے برعکس ادنیٰ قیمت والی چیزیں اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ اگر اُن کی قیمت میں اضافہ بھی ہوجائے تو لوگوں کو یہ اضافہ بار محسوس نہ ہوگا اور حسب سابق خریداری جاری رکھیں گے اور چونکہ بوجہ ارزانی ہر کوئی دل بھر کر خرید سکتا ہے۔ مزید ارزانی سے اُن کی طلب میں اضافہ ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت کی افراط و تفریط کی دونوں حالتوں میں اشیا متعلقہ کی طلب غیر تغیر پزیر کہلا سکے۔ پس تحقیق ہوا کہ بالعموم اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب غیر تغیر پزیر ہوتی ہے۔ لیکن متوسط قیمت والی چیزوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی چیزیں نہ تو اس قدر گراں ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے دست کش رہیں اور قیمت بڑھنے پر اُن کی قلیل طلب میں کوئی تخفیف نہ ہو اور قیمت گھٹنے پر بھی لوگ اس کی مزید خریداری کی ہمت نہ کرسکیں اور نہ اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ قیمت بڑھنے پر بھی لوگ ان کو گراں محسوس نہ کریں اور بقدر سابق خریدے جائیں اور اگر قیمت اور بھی گھٹ جائے تو زیادہ اس

حصہ چہارم
باب ۱۸

وجہ سے نہ خرید سکیں کہ سابق قیمت پر ہی وہ خوب دل بھر کر خرید رہے تھے اور طلب میں اضافہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی بلکہ متوسط قیمت اس قدر معتدل ہوتی ہے کہ تھوڑے سے اضافہ سے وہ گراں اور تھوڑی سی تخفیف سے ارزاں محسوس ہونے لگتی اور قیمت کی تھوڑی سی تبدیلی کا طلب پر نمایاں اثر پڑتا ہے گویا متوسط قیمت والی چیزوں کی طلب تغیر پزیر ہوتی ہے۔ ہر ملک میں کسی چیز کی طلب اس کے باشندوں کی طلب کا مجموعہ ہوتی ہے اور بلحاظ مالی حالت باشندوں کے مختلف طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کا معیار قیمت اعلیٰ و متوسط و ادنیٰ جدا جدا ہیں جس قدر زیادہ باشندوں کی نظر میں کسی چیز کی قیمت متوسط ہوگی اتنی اس کی طلب بھی تغیر پزیر ہوگی۔

اب تک ہم نے صرف قیمت کی بیشی اور کمی کا تغیر پزیری طلب پر اثر دریافت کیا۔ اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ چیزوں کی نوعیت کا بھی تغیر پزیری طلب سے قریبی تعلق ہے۔ واضح ہو کہ ضروریات کے بھی بلحاظ اہمیت و شدت بے شمار مدارج ہیں۔ ان میں سے بعض از حد لابد اور ناگزیر ہیں مثلاً کھانا، پانی، لباس، مکان کہ محنت و زندگی کا اُن پر سراسر دار مدار ہے اور بہت سی ایسی ہیں کہ اگر ہم اُن کی عادت نہ ڈالیں تو ہم کو اُن کے نہ ملنے سے کوئی قابل لحاظ تکلیف نہ ہو بلکہ اکثر کا وہم و گمان بھی ہمارے دل میں نہ گزرے ع الخ ماور کار داریم اکثرے درکار نیست۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کو **ضروریات لابد** اور آخر الذکر کو **تعیشات** سے تعبیر کرتے ہیں۔

ضروریات لابد اور تعیشات میں ایک از حد نتیجہ خیز فرق ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت نے مصلحتاً پیدا کیا ہے جو احتیاجات ضروریات لابد سے متعلق ہیں اُن کو رفع کئے بغیر چارہ نہیں اور وہ ایک مقدار سے بتمام و کمال رفع بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس تعیشات والی احتیاجات پوری نہ بھی ہوسکیں تو کچھ زیادہ مضائقہ نہیں۔ لیکن پوری کرنے کا جس قدر اہتمام کیا جاتا ہے وہ ھل من مزید پکارتی ہیں احتیاجات اول الذکر اصطلاحاً

سیری پزیر اور دوم غیر سیری پزیر کہلائیں گی۔ مثلاً بھوک پیاس کو تو قحط سالی اور خشک سالی میں جان بچانے کی خاطر جہاں تک استطاعت ہوتی ہے لوگ کھانا پانی خریدتے ہیں نیز غلہ خواہ کتنا ہی ارزاں ہو جائے اور پانی خواہ کتنا ہی وافر کیوں نہو ایک مقدار معین سے زیادہ آدمی ایک وقت میں کھا پی نہیں سکتا۔ کچھ کھانا اور ایک آدھ گلاس پانی کے بعد آدمی اس وقت اس قدر سیری محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر اس کو مجبور بھی کیجئے تو زیادہ کھا پی نہ سکیگے غلہ اور پانی کا اگر کچھ ذخیرہ رکھا جاتا ہے تو آیندہ محض احتیاجات کے خیال سے بوقت سیری اس کی موجودگی و عدم موجودگی یکساں ہے۔ لیکن احتیاجات تعیشات کی حالت بالکل برعکس کی سی ہے۔ اگر تعیشات گراں ہوں تو لوگ اُن کی پروا بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہ ارزاں ہو جائیں تو خریدتے خریدتے نہیں تھکتے۔ فیشن ایبل جنٹلمین کے پاس حسب استطاعت درجنوں بوٹ، سوٹ ٹائی، کالر، جراب، تصاویر، چھڑیاں، میز، کرسیاں، فرش فروش اور ہر قسم کا فرنیچر ہو۔ تب بھی اُن کا دل نہیں بھرتا ہر وقت ان چیزوں کے اضافہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کوئی چیز پسند آئی خرید لی یہ سب چیزیں مثل ذخیرہ غلہ و پانی آیندہ احتیاجات کی غرض سے نہیں فراہم کی جاتیں بلکہ ایک ہی وقت میں ان سب کی موجودگی سے لطف آتا ہے۔ لیکن تعیشات کی مقدار کتنی ہی بڑھ جائے احتیاجات متعلقہ کو مثل بھوک و پیاس پوری سیری کبھی نصیب نہیں ہوتی بلکہ بمصداق آتش شوق تیز تر گردد احتیاجات کی شدت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امیر خواہ بقول گنوار۔ ہزار گھی ہی گھی پیئیں اور گڑ ہی گڑ کھائیں لیکن اُن کی احتیاج بھوک و پیاس کی اتنی ہی مقدار بلکہ کم سے رفع ہو جاتی ہے جتنی کہ غریب کی۔ اس کے برعکس اُن کی احتیاجات تعیشات غریب کے مقابلہ میں لاکھوں گنا زیادہ مقدار سے بھی پوری نہیں ہوتیں۔ اسی سلسلہ میں یہ نکتہ جتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سیری پزیر احتیاجات کی ضروریات تو بالعموم تعیشات ہیں لیکن سیری پزیر احتیاجات کی ضروریات میں سے

بھی بعض داخل تعیشات ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ناگزیر نہیں مثلاً شکر، دودھ اور میوہ جات، تعیشات کی اس تفریق کی اہمیت آگے چل کر اضافہ طلب کے مختلف مفہوم کے سلسلہ میں واضح ہو گی۔

ضروریات لابد اور تعیشات کی کوئی قطعی طور پر جدا جدا فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ کھانا، پینا یہ دو ضروریات تو بیشک دنیا بھر میں یکساں شدید و ناگزیر ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی بیشمار ضروریات شدت و نوعیت کے لحاظ سے ملکی آب و ہوا۔ رسم و رواج اور مالی حالت سے متعلق ہیں وہی ایک چیز کسی کے نزدیک از حد ناگزیر ضروریات میں شامل ہے اور کوئی اس کو نہایت فضول خرچی تعیشات میں شمار کرتا ہے۔ سرد ممالک میں غریب سے غریب کو بھی چاء پینی پڑتی ہے۔ گرم ممالک میں اختیاری ہے۔ یہی حال جوتے اور بیش خرچ ادنی لباس کا ہے اول اول تنباکو یا شراب محض شوقیہ استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن چند روز بعد وہ مثل غذا لوازم زندگی میں داخل ہو جاتی ہے۔ لباس اور مکان غریب لوگوں کو اگر میسر بھی آتا ہے تو صرف بقدر ضرورت۔ لیکن امرا ان کو تعیشات کی حد تک استعمال کرتے ہیں عیش پسند امرا کو آنے جانے میں سواری بغیر چارہ نہیں لیکن محنت پسند عوام اور غریب کو پیدل چلنے پھرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

بحث بالا سے بظاہر پڑھنے والے کے دل میں ایک قسم کی بد عقیدگی پیدا ہو جائے تو عجب نہیں اس کو ہر بات غیر معین سی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت کل پہلو دیکھ لینے سے وسعتِ نظر پیدا ہو کر واقعات سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور بالخصوص علم المعیشت میں یہ مغالطہ ہرگز پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے کہ علم ہندسہ و طبیعات کی طرح اس کے اصطلاحات اصول و قوانین بالکل قطعی اور معین ہیں ورنہ ایسی خوش عقیدگی کا نتیجہ علم اور واقعات میں کامل مطابقت نہ ہونے سے بالآخر سخت مایوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد کی بے بنیاد بد عقیدگی کرا دھرا سب برباد کر دیتی ہے۔ اسی احتیاط سے ہم اکثر جا بجا یہ جتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ معاشیات کے مسائل و اصطلاحات میں کامل تعین اور تیقن محال ہے اس کے قوانین تخمینی ہونے سے

زیادہ کا دعویٰ نہیں کر سکتے اور ان کا عمل گوناگوں شرائط کا ماتحت ہوتا ہے۔

مقدار قیمت اور تغیر پذیری طلب کے باہمی تعلق کی بابت جو عام اصول ہم نے اوپر دریافت کئے ہیں ان میں ضروریات لابد اور تعیشات کے مذکورہ بالا فرق خواص سے حسب ذیل ترمیم نمودار ہوتی ہے۔

(ل) جب کہ قیمت اعلیٰ ہو ضروریات لابد کی طلب میں بہت کچھ تغیر پذیری ہو سکتی ہے لیکن تعیشات میں بے حد کم۔ باعث فرق یہ ہے کہ ضروریات زیر بحث بوجہ لابد ہونے کے بحالت قیمت اعلیٰ بھی تعیشات کے مقابل میں بہت زیادہ خریدی جاتی ہیں اور لوگوں کو خریدے بغیر کوئی چارہ نہیں، جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے گی قیمت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ شئے مذکور ضرور خریدیں گے۔ پس اگر قیمت ایسی انتہائی حد سے آگے بڑھے گی تو طلب میں جبریہ تخفیف نمودار ہوگی اور اگر قیمت میں تخفیف ہوگی تو طلب میں معقول اضافہ ہوگا کیونکہ جو لوگ خریدنے کے بے حد متمنی تھے لیکن بوجہ عدم استطاعت خریدنے سے معذور تھے وہ بھی شئے مذکور تخفیف قیمت پر فوراً خریدنے لگیں گے۔ چونکہ ضروریات لابد کی طلب کم و بیش غیر اختیاری اور جبریہ سے ہوتی ہے اور اس کے برعکس تعیشات کی طلب خود اختیاری اور خوشی خواہ ہے۔ بمقابلہ تعیشات کے لوگ ضروریات لابد کی گرانی کے بہت زیادہ حد تک متحمل ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مقابلۃً ضروریات لابد کی طلب تعیشات کی طلب سے بحالت قیمت اعلیٰ زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔

(ب) قیمت متوسط کی حالت میں تعیشات کی طلب مقابلۃً اس وجہ سے زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے کہ اول تو ان کی احتیاج غیر سیری پذیر ہے گویا تخفیف قیمت سے بہت زیادہ اضافہ طلب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوم وہ ناگزیر نہیں یعنی ان کی طلب اختیاری ہے لہذا اضافہ قیمت سے ان کی طلب میں بہت کچھ تخفیف ممکن ہے۔ اس کے برعکس ضروریات

لابد کی طلب اس قدر تغیر پزیر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اول تو وہ ناگزیر ہی دوم احتیاجات متعلقہ سیری پزیر ہیں۔ سیری پزیر احتیاجات کی تعیشات میں بھی (مثلاً دودھ، گھی شکر) کم وبیش تغیر پزیری سے پائی جاتی ہی کروہ ناگزیر نہیں۔ کچھ ارزاں ہوجائیں تو لوگ زیادہ خریدنے لگیں اور گراں ہوئیں تو خریدنا چھوڑدیں۔

(ج) قیمت ادنیٰ میں ہر قسم کے چیزوں کی طلب غیر تغیر پزیر ہوتی ہی۔ لیکن پھر بھی مقابلۃً تعیشات کی طلب ضروریات لابد کی طلب سے کمتر غیر تغیر پزیر ہوگی یا یوں کہو کہ ضروریات لابد کی طلب مقابلۃً بیشتر غیر تغیر پزیر ہوگی۔ اس فرق کا باعث بھی احتیاج کی سیری پزیری و عدم سیری پزیری کا خاصہ ہی جو علی الترتیب ضروریات لابد اور تعیشات سے متعلق ہی۔

تغیر پزیری طلب کے متعلق اب دو نکتے جتانے اور ضروری معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ طریق بدل کا تغیر پزیری طلب پر اثر قابل توجہ ہی۔ بدل سے مراد ہی کسی ایک چیز کے بجائے وہی احتیاج رفع کرنے کی غرض سے دوسری چیز استعمال کرنا۔ مثلاً جوتوں میں بجائے چمڑا کپڑا استعمال کرنا۔ تعمیر میں بجائے کنکر کے چونے کے ریل کے کوئلہ کی راکھ لگانا۔ قحط میں بجائے غلہ کے بھوکے جانوروں کا گوشت کھانا۔ درختوں کی چھال، پتوں اور گھاس کے ریشے سے روئی اور ریشم کی مانند کپڑا بننا ہی۔ سائنس اور ایجادات کی بدولت شاید کوئی چیز ایسی ہو کہ جس کا بدل دریافت نہ کرلیا گیا ہو ورنہ اکثر چیزوں کے متعدد بدل مستعمل ہیں۔ موجودہ جنگ یورپ میں جرمنی کی لامحدود طاقت کا ایک سب سے بڑا راز اُس کا بدل میں کمال قرار پایا ہی صرف آلو سے جو جرمنی میں بافراط پیدا ہوتا ہی کھانے پینے کی ہر قسم کی چیزیں ساٹھ سے اوپر تیار کی جاتی ہیں جو گوشت اور گھی جیسی مختلف چیزوں تک کا بدرجۂ اعلیٰ کام دیتی ہیں۔ طریق بدل کی کثرت بھی معاشی ترقیات کے علامات و لوازم میں سے ہی۔ اس کا طلب کی تغیر پزیری پر اثر یہ پڑتا ہی کہ اگر کسی چیز کی قیمت میں اضافہ ہو تو بطریق بدل دوسری مقابلۃً ارزاں

چیزیں استعمال ہونے لگتی ہیں اور شے زیر بحث کی طلب میں بے حد تخفیف ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی چیز کی قیمت گھٹے تو وہ خود بطور بدل دوسری مقابلۃً گراں چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے گی، تخفیف قیمت سے بھی اس کی طلب میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا گویا طریق بدل ہر دو صورت میں کسی چیز کی طلب میں تغیر پزیری بڑھا دیتا ہے۔

واضح ہو کہ طلب میں اضافہ تین طرح پر ہو سکتا ہے جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال کر رہے ہیں اب وہ اس کو زیادہ زیادہ مقدار میں استعمال کریں۔ تعیشات کے واسطے جن کی احتیاج غیر سیری پزیر ہوتی ہے۔ اضافہ طلب کا یہ طریق نہایت کارگر ہے ضروریات لابد میں احتیاج سیری پزیر ہونے کے ایسے اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے نیز جو تعیشات احتیاجات سیری پزیری سے متعلق ہیں مثلاً دودھ، شکر، تنباکو وہ بھی اس اضافہ سے زیادہ مستفید نہیں ہو سکتیں۔ دوم جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال نہیں کرتے تھے وہ بھی اس کو استعمال کرنے لگیں ضروریات لابد تو صحت و زندگی کی خاطر جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے ہر کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ تعیشات سے بوجہ گرانی دستکش رہتے ہیں۔ پس اضافہ طلب کی یہ صورت بھی مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موافق ہے۔ تیسری صورت اضافہ طلب کی طریق بدل ہے کہ شے زیر بحث دوسری چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے یہ صورت ضروریات لابد اور تعیشات کے واسطے یکساں عام ہے۔ بحالت ارزانی جو مزدوری پیشہ لوگ گیہوں، گھی اور شکر استعمال کرتے ہیں ان میں سے اکثر گرانی میں جو، چنا، تیل اور گڑ استعمال کرنے لگتے ہیں قحط میں لوگ کثرت سے بھوکے جانوروں کا گوشت ہی گوشت کھاتے ہیں۔

تخفیف طلب کی بھی تین صورتیں ہیں جو اضافہ طلب کی مذکورۂ بالا صورتوں کے بالکل برعکس ہیں یعنی سابق والے لوگ کمتر مقدار میں استعمال کریں یا لوگوں کی کمتر تعداد

تعداد استعمال کرے یا دوسری چیزیں شے زیر بحث کی بجائے استعمال ہونے لگیں اول دو صورتیں مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موزوں ہیں اور تیسری ضروریات لابد کے واسطے بھی یکساں عام ہے واقعہ یہ ہے کہ اضافہ یا تخفیف طلب کی یہ تینوں شکلیں بالعموم مل جلی رہتی ہیں لیکن جو شکل سب سے عام ہوگی اس کا اثر بھی غالب رہے گا۔

تغیر پزیری طلب کے متعلق دوسرا نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ اکثر چیزوں سے متعدد احتیاجات پوری ہوتی ہیں مثلاً پانی کہ وہ پینے، کھانے، نہانے، دھونے اور چھڑکاؤ میں استعمال ہوتا ہے۔ مشین چلانے میں بھی اس کی بھاپ سے بہت کام لیا جارہا ہے۔ ان چند در چند احتیاجات میں سے بلحاظ خورونوش تو پانی قطعاً ضروریات لابد میں داخل ہے لیکن نہانے دھونے اور چھڑکاؤ جیسی احتیاجات کے ہمراہ وہ بتدریج تعیشات میں داخل ہو جاتا ہے، نہانا اگر زندگی کے واسطے مہینہ میں ایک مرتبہ ناگزیر ہو تو ہر روز نہانا تعیشات میں شمار ہوگا۔ پھر کپڑے اور مکان دھونے کا نمبر آتا ہے اور چھڑکاؤ اور مشین میں پانی کا استعمال تو صرف اول الذکر چاروں احتیاجات پوری ہونے کے بعد ممکن ہے غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر ایک ہی چیز سے بہت سی ضروریات حاصل ہوں جن میں سے بعض لابد ہوں اور بعض تعیشات تو ایسی چیز کی مجموعی طلب میں ضرور تغیر پزیری ہوگی۔ قیمت بڑھنے سے اس کا استعمال بطور ضروریات لابد تو بحال رہے گا۔ لیکن بطور تعیشات گھٹ جائے گا اور مجموعی نتیجہ تخفیف طلب ہوگا۔ اسی طرح پر قیمت گھٹنے سے اگرچہ بحد ضروریات لابد اس کی طلب وہی رہے گی۔ لیکن بحیثیت تعیشات اس کا استعمال بہت بڑھ جائے گا اور مجموعی نتیجہ اضافۂ طلب ہوگا لیکن جو چیزیں صرف ایک ہی احتیاج پوری کریں مثلاً گیہوں، گھی اور شکر، دودھ تنبا کو کہ صرف کھانے پینے کے کام آئیں وہ ضروریات لابد یا تعیشات میں سے جن میں بھی شمار ہوں اُن ہی کے مذکورہ بالا قوانین کی پابند ہوں گی۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کے

بڑھانا پڑے گا۔

(ج) کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی جتایا جا چکا ہے یہ بات پیش نظر رکھنی از حد ضروری ہے کہ قانون تقلیل افادہ و نیز قانون طلب میں کسی چیز کی طلب کی حالت معین فرض کر لی جاتی ہے۔ طلب کا دار و مدار آبادی، رسم و رواج اور لوگوں کے شوق و مذاق پر ہے نیز ایسی چیزوں کا جو شے زیر بحث کے بدل کے طور پر استعمال ہو سکیں طلب پر قابل لحاظ اثر پڑتا ہے، قانون طلب بیان کرتے وقت ان تمام حالتوں میں سکون فرض کرتے ہیں گویا ان میں کوئی قابل لحاظ تغیر پیدا نہیں ہوتا اور اس لئے شے زیر بحث کی طلب معین سی مانی جاتی ہے۔ مثلاً چار کا رواج کثرت آبادی، ملکی آب و ہوا، رسم و رواج، عام شوق و مذاق پر منحصر ہے کافی اور قہوہ کے رواج کی کمی بیشی کا بھی چار کے استعمال پر اثر پڑتا ہے اگر ان حالات کے رد و بدل سے چار کی طلب میں معقول اضافہ ہو تو قوانین تقلیل افادہ و طلب کا اثر ضعیف بلکہ قطعاً زائل ہو سکتا ہے اور اگر طلب بھی گھٹے تو ان قوانین کا عمل دس گنا قوی ہونا آسان ہے گویا طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی مخالف و معاون ہوتی ہے۔ لیکن قوانین بحالت مخالفت و معاونت اپنا عمل برابر جاری رکھتے ہیں۔ اس سے باز نہیں رہ سکتے۔ ان قوانین کا اثر دریافت کرتے وقت طلب کم و بیش معین فرض کی جاتی ہے اور ایسا مفروضہ کچھ زیادہ خلاف واقعہ بھی نہیں کیونکہ طلب میں بڑے بڑے تغیرات مدتوں بعد نمودار ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان ہر دو قوانین کا عملدرآمد ہر طرف نظر آتا ہے۔

کبھی کبھی طلب کی حالت جلد بھی بدل جاتی ہے اور قانون طلب کے عمل میں ضعف آجاتا ہے۔ مثلاً شروع فصل میں جب کہ ہر شخص کو شوق ہوتا ہے خربزہ اور انبہ جیسے

پھلوں کی قیمت بہت اعلیٰ ہوتی ہے اور عین ریزش کے زمانہ میں قیمت بہت گھٹ جاتی ہے اس کا باعث قانون تقلیل افادہ اور قانون طلب سے صاف ظاہر ہے لیکن آخر فصل میں جب کہ ان پھلوں کی اتنی ہی کمی ہو جاتی ہے جتنی کہ شروع فصل میں ان کو معمولی قیمت پر بھی لوگ خریدنے کی پروا نہیں کرتے۔ سوال ہوتا ہے کہ مقدار گھٹنے پر قیمت میں اضافہ کیوں نہیں ہوا وجہ یہ ہے کہ حالت طلب بدل گئی لوگوں کا کھاتے کھاتے جی بھر گیا۔ طبیعت سیر ہو گئی گویا شروع اور آخر فصل میں قانون طلب کا عمل بھی نمایاں نہیں ہوتا۔

یہ بھی اگر سننے میں آتا ہے کہ کسی چیز کی طلب بڑھنے سے اس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور طلب گھٹنے سے قیمت بھی گھٹ جاتی ہے یہ مقولہ صرف اس حالت میں صحیح ہے جبکہ مقدار رسد معین فرض کر لی جائے اول یہ کہ شے زیر بحث کی مقدار میں جلد اضافہ نہ ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ شے مذکور سریع الزوال ہو اور عرصہ تک اچھی حالت میں نہ رہ سکے۔ مثلاً کچھ قدیم چیزیں فروخت کی جائیں اگر محققین آثار قدیمہ اُن کے شائق اور خواہاں ہونگے تو زر و جواہر کے ہموزن فروخت ہونا عجب نہیں ورنہ کوئی اُن کا پرسان حال بھی نہ ہوگا۔ علیٰ ہذا پھل پھول، ترکاری، مچھلی اور برف جیسی عام استعمال کی چیزیں بھی جب کہ طلب کم ہو کوڑیوں کے مول فروخت ہونے لگتی ہیں کیونکہ فروخت نہ کرنے سے وہ جلد خراب ہو جاتی ہیں اور تھوڑی بہت جو کچھ قیمت ملتی ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جاتی ہے لیکن جب طلب بڑھتی ہے تو یہی چیزیں روپیوں کے حساب سے فروخت ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایسی چیزیں کہ جن کی رسد بطور مذکورۂ بالا معین ہو کم ہیں۔ بے شمار چیزوں کا تعلق زراعت اور صنعت و حرفت سے ہے تھوڑے عرصہ میں گھٹ بڑھ سکتی ہیں اور بطور ذخیرہ بلا خوف و خرابی رکھی جا سکتی ہیں، ان کی رسد کے اضافہ و تخفیف میں جس قدر عرصہ لگے تب تک تو مذکورۂ بالا مقولہ اُن پر بھی صادق آئے گا۔ لیکن اس کے بعد اُن کی قیمت قوانین تقلیل

حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہوں گی اور طلب کی کمی بیشی ان قوانین کے عمل کی محرک ہوگی براہ راست قیمت کی کمی بیشی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔ مثلاً اگر شئے زیر بحث قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے تو اضافہ طلب و اضافہ رسد سے اُس کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس بحالت قانون تکثیر حاصل قیمت میں تخفیف یقینی ہوگی، اسی طرح پر جب کہ طلب کی کمی سے رسد بھی گھٹے تو قانون تقلیل حاصل سے قیمت میں تخفیف ہو جانا عجب نہیں لیکن قانون تکثیر حاصل ضرور قیمت میں اضافہ کر دے گا۔

اس بحث سے مجملاً یہ اصول دریافت ہو گیا کہ فروشندہ کی جانب سے قیمت کیونکر قرار پاتی ہے یعنی کوئی چیز کس اصول کے مطابق کم سے کم قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جن چیزوں کی مقدار کم و بیش معین ہو اور ان میں جلد اضافہ نہ ہو سکے یا جو چیزیں جلد خراب ہو جائیں اور بطور ذخیرہ نہ رکھی جا سکیں۔ ان کی قیمت پر تو طلب کی کمی بیشی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ یعنی اُن کی قیمت بیشتر صرف قیمت طلب ہوتی ہے۔ لیکن دیگر بے شمار چیزیں جو کاشت اور صنعت و حرفت سے تیار ہوتی ہیں جن کی مقدار بھی بہت زیادہ تاخیر بغیر بڑھ سکے اور جو کچھ عرصہ بطور ذخیرہ بھی رہ سکیں اُن کی قیمت پر مصارف پیدائش کا بھی قابل لحاظ اثر پڑتا ہے اور مصارف پیدائش قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے تابع ہیں۔ پس طلب کی کمی بیشی کا صرف اتنا تعلق ہے کہ وہ قوانین تقلیل حاصل و تکثیر حاصل کے عمل کی محرک ہوتی ہے۔ ورنہ قیمت من جانب فروشندہ براہ راست انھیں ہر دو قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ تقسیم دولت میں جا بجا واضح ہو چکا ہے کہ قیمت من جانب فروشندہ براہ راست مصارف مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور اس کو اصطلاحاً قیمت رسد کہتے ہیں۔

در اصل زیر بحث یہ مقولہ تھا کہ طلب بڑھنے گھٹنے سے چیز کی قیمت بھی بڑھتی گھٹتی

ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ مقولہ اسی حالت میں صحیح ہوتا ہے جب کہ مقدار رسد معین فرض کرلی جائے یا چیز سریع الزوال ہو۔ اسی سلسلہ میں ہم قیمت رسد کے اصول بھی مجملاً بیان کر گئے۔ لیکن باوجود خوف طوالت ہم ان اصول سے مسئلہ قیمت کے تحت میں پھر بحث کرینگے کیوں کہ ان کا صاف طور پر ذہن نشین ہونا نہایت ضروری ہے یہاں ہم صرف ایک معمہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کے سلجھانے میں اس قدر بحث و مباحثہ کے بعد کوئی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ :

(الف) کسی چیز کی قیمت گھٹتی ہے تو اُس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور کسی چیز کی طلب بڑھ جانے سے اُس کی قیمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے اس کی طلب گھٹ جاتی ہے لیکن کسی چیز کی طلب گھٹنے سے اُس کی قیمت بھی گھٹ جاتی ہے۔

ان دونوں مقولوں کا مفہوم وہی ایک ہے گو بظاہر ان میں سے ہر ایک میں تضاد معلوم ہوتا ہے تخفیف و اضافۂ قیمت ایک ہی وقت میں اضافہ طلب کا باعث و نتیجہ علی الترتیب کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اضافہ و تخفیف قیمت کا بھی علی الترتیب تخفیف طلب کا باعث و نتیجہ ہو سکنا سمجھ میں نہیں آتا' اس معمہ کا حل مذکورالصدر بحث میں بالتفصیل موجود ہے۔ لیکن مزید سہولت کی نظر سے ہم یہاں اتنا اشارہ اور کیے دیتے ہیں کہ قیمت گھٹنے سے طلب بڑھنے یا قیمت بڑھنے سے طلب گھٹنے میں طلب کی حالت میں سکون فرض کر لیا جاتا ہے اور یہ نتائج قیمت بڑھنے گھٹنے سے قانون تقلیل افادہ و قانون طلب کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں لیکن طلب بڑھنے سے قیمت بڑھنے یا طلب گھٹنے سے قیمت گھٹنے میں رسد کو معین یا سریع الزوال خیال کرتے ہوئے حالت طلب میں رد و بدل تصور کرتے ہیں بالفاظِ دیگر اول دو حالتوں میں تغیر طلب کا

حصہ چہارم باب ۱۸

باعث تغیر قیمت ہے اور آخر دو حالتوں میں خود تغیر قیمت تغیر طلب کا نتیجہ ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوتا ہے کہ اضافہ طلب کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، اوّل جب کہ دیگر حالات کے تغیر سے اضافہ طلب نمودار ہو کر اضافہ قیمت کا باعث ہو، دوم جب کہ وہ حسب قانون تقلیل افادہ وقانون طلب تخفیف قیمت کا نتیجہ ہو۔ ان ہر دو جداگانہ قسم کے اضافہ طلب کو علی الترتیب اصطلاحاً **اضافہ طلب و کشائش طلب** کہیں گے۔ تخفیف طلب کے بھی یہی دو مفہوم ہو سکتے ہیں یعنی یا تو وہ اضافہ قیمت کا نتیجہ ہو یا دیگر حالات سے پیدا ہو کر تخفیف قیمت کا باعث ہو۔ ان ہر دو مفہوم کے لحاظ سے اس کو بھی علی الترتیب **تخفیف طلب وبست طلب** کہنا چاہیئے۔ اسی اصول کے مطابق رسد میں بھی بعینہ چار قسم کی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں اضافہ اور حقیقت رسد جو بطور خود پیدا ہو کر کمی وبیشی قیمت کا باعث ہو، کشائش وبست رسد جو طلب یا قیمت کی بیشی کمی سے نمودار ہو۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اضافہ طلب وکشائش رسد، اضافہ رسد وکشائش طلب تخفیف طلب وبست رسد، تخفیف رسد وبست طلب یہ دو دو تبدیلیاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور اول الذکر تبدیلی دوسری کا باعث ہوتی ہے۔

تغیر پزیری طلب

(۴) قانون تقلیل افادہ سے ہم کو یہ قانون طلب دریافت ہوا کہ کسی چیز کی قیمت گھٹنے سے اس کی طلب بڑھتی ہے اور قیمت بڑھنے سے طلب گھٹ جاتی ہے۔ لیکن واضح ہو کہ قیمت وطلب کی ان معکوس تبدیلیوں میں کوئی نسبت مستقیم نہیں کبھی قیمت کی ذرا سی تبدیلی طلب میں بہت بڑا فرق کر دیتی ہے اور کبھی معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے مثلاً ۲۰ - ۲۵ فی صدی قیمت گھٹنے سے طلب میں دو چند سہ چند اضافہ ہو سکتا ہے اور کبھی اس کے برعکس قیمت نصف بلکہ چہارم بھی ہو جائے تو بھی طلب میں کوئی

نمایاں فرق نہیں پڑتا۔ علیٰ ہذا کبھی قیمت کے صرف دس بیس فی صدی چڑھنے سے طلب بحد نصف بلکہ چہارم گھٹ جاتی ہی اور گاہے قیمت دوگنی سہ گنی بھی ہو جائے لیکن طلب میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس اختلاف کا باعث یہ ہی کہ قانون تقلیل افادہ کے عمل کی رفتار کبھی سست ہوتی ہی اور کبھی تیز۔ اس سستی اور تیزی کے شرائط تو ہم ابھی بیان کرینگے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہی کہ اگر رفتار سست ہی تو بہت زیادہ مقدار خریدی جاوے پر بھی قیمت کم گھٹے گی یا یوں کہو کہ قیمت تھوڑی سی بھی کم ہو جائے تو طلب بہت بڑھ جائے گی اور اگر رفتار تیز ہی تو تھوڑی سی مقدار بڑھنے پر قیمت بہت زیادہ گر جاوے گی یا بالفاظ دیگر باوجود قیمت بہت زیادہ تخفیف ہونے کے طلب میں نمایاں اضافہ نہ ہوگا۔ اب صاف ظاہر ہی کہ جب قیمت کی تھوڑی سی تخفیف سے طلب میں بہت سا اضافہ ہو تو اس کے برعکس قیمت کا تھوڑا سا اضافہ طلب کی بہت زیادہ تخفیف کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر چار کے ڈبے عمر کے بجاے ۱۵ ر کی شرح سے بہت زیادہ فروخت ہوں تو یقیناً ۱۵ ر کی بجائے عمر کی شرح سے بہت کم فروخت ہونگے۔ اب اگر قیمت کی قلیل تخفیف یا اضافہ سے طلب میں کثیر اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو اس واقعہ کو تغیر پزیری طلب اور طلب کو طلب تغیر پزیر کہیں گے علیٰ ہذا یہ بھی مثال سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہی کہ اگر قیمت کے کثیر تخفیف سے طلب میں قلیل اضافہ نمودار ہو تو قیمت کے کثیر اضافہ سے طلب میں قلیل تخفیف ہوگی مثلاً اگر للعہ ر کے بجاے عمر کے نرخ سے کوئی چیز صرف دس فی صدی زیادہ فروخت ہو تو عمر کے بجائے للعہ ر کے نرخ سے صرف تقریباً دس فی صدی کم فروخت ہوں گی۔ پس اگر قیمت کی کثیر تخفیف یا اضافہ سے طلب میں قلیل اضافہ یا تخفیف نمودار ہو تو ایسی طلب کو طلب غیر تغیر پزیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

طلب تغیر پزیر و غیر تغیر پزیر کے کچھ معیار مقرر نہیں کہ ان دونوں قسموں میں کوئی عام اور مستقل تفریق کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ تغیر پزیری تو طلب کا ایک عام خاصہ ہے اور اس کے بیشمار مدارج ہیں جتنی تغیر پزیری بدرجہ اعلیٰ پائی جائے گی یعنی قیمت کی تھوڑی تبدیلی سے طلب میں کوئی بڑا فرق نمودار ہوگا تو اسی قدر وہ طلب تغیر پزیر کہلانے کی زیادہ مستحق ہوگی اور اگر تغیر پزیری بدرجہ ادنیٰ پائی جائے یعنی قیمت کی بڑی تبدیلی سے بھی طلب میں نہایت معمولی فرق پیدا ہوا تو ایسی طلب غیر تغیر پزیر کہلائے گی حالانکہ ذرا سی تغیر پزیری اس میں بھی ضرور موجود ہے گویا طلب غیر تغیر پزیری و تغیر پزیر میں صرف تغیر پزیری کی کمی بیشی کا فرق ہے ورنہ تھوڑی بہت تغیر پزیری دونوں طلبوں میں موجود ضرور ہے۔

پس تغیر پزیری طلب کی مختصر تعریف یہ ہوگی کہ اگر قیمت تھوڑی گھٹنے سے طلب بہت بڑھے یا قیمت تھوڑی بڑھنے سے طلب گھٹے اور ثابت ہو چکا ہے کہ یہ دونوں حالتیں لازم ملزوم ہیں تو طلب بہت تغیر پزیر کہلائے گی۔ اس کے برعکس اگر قیمت بہت گھٹنے سے طلب کم بڑھے یا قیمت بڑھنے سے طلب کم گھٹے اور یہ حالتیں بھی لازم و ملزوم ہیں تو طلب کم تغیر پزیر یا غیر تغیر پزیر شمار ہوگی، اسی تعریف کو بدل کر یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر قیمت میں کچھ تخفیف ہونے سے طلب زیادہ بڑھے تو تغیر پزیر کہلائے گی اور اگر کم تو غیر تغیر پزیر علیٰ ہذا اگر قیمت میں کچھ اضافہ ہونے پر طلب میں بہت تخفیف ہو تو طلب تغیر پزیر ہے ورنہ غیر تغیر پزیر
ہم نے قصداً تغیر پزیری طلب کو کئی کئی طرز سے بیان کیا ہے۔ بظاہر تو اس سے دقت اور پیچیدگی بڑھتی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن درحقیقت اس طریق سے یہ قانون بہت عمدہ طور پر ذہن نشین ہوگا۔ البتہ ذرا غور و توجہ شرط ہے۔ تغیر پزیری طلب ایک عام مشاہدہ ہے اور اس کے واقع ہونے سے تو کسی کو انکار ہو نہیں سکتا، دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ تغیر پزیری کن

حصہ چہارم
باب ۱۸

کن قوانین کی پابندی ہی کیا ایسی چیزوں کے جن میں تغیر پذیری زیادہ یا کم ہو چند عام اور مستقل علامات قرار پا سکتے ہیں کیا کوئی ایسا ذریعہ ہے کہ جس سے تغیر پذیر طلب کا پہلے ہی سے تخمینہ اور اندازہ کیا جا سکے۔ علمی تحقیقات اور عملی تجربہ سے تغیر پذیری طلب کے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکی ہیں پیش کی جاتی ہیں۔

یوں تو دولت مندی و افلاس کے مدارج کا کوئی شمار نہیں۔ لیکن مالی حالت کے بے شمار قلیل فرق نظر انداز کر کے چند طبقے ایسے قرار پا سکتے ہیں کہ ان کی مالی حالت میں بمقابلہ یکے با دیگرے عام فرق نمایاں ہو مثلاً خوش حال، متوسط الحال اور تنگ دست ان طبقوں میں کوئی مستقل حد فاصل قائم کرنی تو محال ہی۔ بہت سے لوگ طبقہ اول کے ادنیٰ زمرہ میں اور طبقہ دوم کے اعلیٰ ممبروں میں یکساں شمار ہو سکیں گے۔ لیکن پھر بھی علاوہ ان لوگوں کے جن کی کسی طبقہ میں شمولیت محقق نہ ہو سکے۔ ہر طبقہ کے گروہ کثیر کی مالی حیثیت میں مقابلتہً نہایت بین فرق نظر آئے گا، مالی حالت کی طرح قیمت کے مدارج بھی شمار سے باہر ہیں، ایک پائی سے لے کر کروڑ ہا روپیہ تک کے نرخ سے چیزیں فروخت ہوتی ہیں لیکن قلیل فرق نظر انداز کر کے مالی طبقوں کی طرح قیمت کے بھی ہم تین عام درجے مقرر کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ۔ اعلیٰ سے مراد ایسی قیمت ہی کہ جو خریدار کی حیثیت سے بہت زیادہ ہو لوگ اس قیمت پر چیزیں نہ خرید سکتے ہوں۔ متوسط قیمت وہ ہی کہ لوگوں کو گراں نہ گزرے اور ادنیٰ قیمت سے چیزوں کی بے حد ارزانی مراد ہی کہ ہر کوئی دل بھر کر خرید سکے۔ صاف ظاہر ہی کہ قیمت کے یہ مدارج محض اضافی ہیں مستقل نہیں ہو سکتے۔ خوش حال طبقے کی نظر میں جو قیمت ادنیٰ ہی۔ تنگدستوں کے نزدیک وہ ضرور اعلیٰ ہوگی، متوسط الحال طبقہ جس قیمت کو اعلیٰ قرار دے خوش حال طبقہ اُس قیمت کو متوسط سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح پر تنگدستوں کی متوسط قیمت۔ متوسط الحال کو ادنیٰ

معلوم ہوگی۔ غرض کہ ایک ہی قیمت خریداروں کی مالی حیثیت کے مطابق اعلیٰ۔ متوسط اور ادنیٰ محسوس ہوتی ہے۔ مالی حالت اور قیمت کے مدارج اور اُن کے باہمی تعلق تو عام مشاہدہ میں ہیں۔ ان سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن احتیاطاً اول اُن کو ذہن نشین کر کے اب ہم تغیر پذیری طلب پر ان کا اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ واضح ہو کہ اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب عموماً غیر تغیر پذیر ہوتی ہے اور متوسط قیمت والوں کی تغیر پذیر، وجہ غور کرنے سے خود سمجھ میں آسکتی ہے۔ اعلیٰ قیمت چونکہ خریداروں کی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتی ہے اس کے اضافہ یا تخفیف کا اُن کی خریداری پر قابل لحاظ اثر نہیں پڑتا ہے۔ وہ چونکہ ایسی چیزیں شاذ و نادر ہی خریدتے ہیں۔ اضافہ قیمت سے اُن کی قلیل طلب میں اور کیا تخفیف ہو سکتی ہے اور چونکہ قیمت اُن کے نزدیک نہایت گراں ہوتی ہے۔ اس کی تخفیف سے بھی طلب میں کوئی نمایاں اضافہ ہونا دشوار ہے۔ اس کے برعکس ادنیٰ قیمت والی چیزیں اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ اگر اُن کی قیمت میں اضافہ بھی ہو جائے تو لوگوں کو یہ اضافہ بار محسوس نہ ہوگا اور حسب سابق خریداری جاری رکھیں گے اور چونکہ بوجہ ارزانی ہر کوئی دل بھر کر خرید سکتا ہے۔ مزید ارزانی سے اُن کی طلب میں اضافہ ہونے کی بہت کم گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت کی افراط و تفریط کی دونوں حالتوں میں اشیاء متعلقہ کی طلب غیر تغیر پذیر کہلا سکے۔ پس تحقیق ہوا کہ بالعموم اعلیٰ اور ادنیٰ قیمت والی چیزوں کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے۔ لیکن متوسط قیمت والی چیزوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایسی چیزیں نہ تو اس قدر گراں ہوتی ہیں کہ لوگ ان سے دست کش رہیں اور قیمت بڑھنے پر اُن کی قلیل طلب میں کوئی تخفیف نہ ہو اور قیمت گھٹنے پر بھی لوگ اس کی مزید خریداری کی ہمت نہ کر سکیں اور نہ اس قدر ارزاں ہوتی ہیں کہ قیمت بڑھنے پر بھی لوگ ان کو گراں محسوس نہ کریں اور بقدر سابق خریدے جائیں اور اگر قیمت اور بھی گھٹ جائے تو زیادہ اس

وجہ سے نہ خرید سکیں کہ سابق قیمت پر ہی وہ خوب دل بھر کر خرید رہے تھے اور طلب میں اضافہ
حصہ چہارم کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی بلکہ متوسط قیمت اس قدر معتدل ہوتی ہے کہ تھوڑے
باب ۱۸ سے اضافہ سے وہ گراں اور تھوڑی سی تخفیف سے ارزاں محسوس ہونے لگتی اور قیمت
کی تھوڑی سی تبدیلی کا طلب پر نمایاں اثر پڑتا ہے گویا متوسط قیمت والی چیزوں کی طلب
تغیر پزیر ہوتی ہے۔ ہر ملک میں کسی چیز کی طلب اس کے باشندوں کی طلب کا مجموعہ ہوتی ہے
اور بلحاظ مالی حالت باشندوں کے مختلف طبقے ہوتے ہیں اور ہر طبقہ کا معیار قیمت اعلیٰ
و متوسط و ادنیٰ جدا جدا ہیں جس قدر زیادہ باشندوں کی نظر میں کسی چیز کی قیمت متوسط
ہوگی اتنی اس کی طلب بھی تغیر پزیر ہوگی۔

اب تک ہم نے صرف قیمت کی بیشی اور کمی کا تغیر پزیری طلب پر اثر دریافت کیا۔ اب ہم یہ
دکھانا چاہتے ہیں کہ چیزوں کی نوعیت کا بھی تغیر پزیری طلب سے قریبی تعلق ہے۔ واضح ہو کہ
ضروریات کے بھی بلحاظ اہمیت و شدت بے شمار مدارج ہیں۔ ان میں سے بعض از حد لابد اور
ناگزیر ہیں مثلاً کھانا، پانی، لباس، مکان کہ محنت و زندگی کا اُن پر سراسر دار مدار ہے اور
بہت سی ایسی ہیں کہ اگر ہم اُن کی عادت نہ ڈالیں تو ہم کو اُن کے نہ ملنے سے کوئی قابل لحاظ
تکلیف نہ ہو بلکہ اکثر کا وہم و گمان بھی ہمارے دل میں نہ گزرے ؎ انچہ ما در کار داریم اکثرے
در کار نیست۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کو **ضروریات لابد** اور آخر الذکر کو **تعیشات** سے تعبیر کرتے ہیں
ضروریات لابد اور تعیشات میں ایک از حد نتیجہ خیز فرق ہے جو معلوم ہوتا ہے کہ خود قدرت
نے مصلحتاً پیدا کیا ہے جو احتیاجات ضروریات لابد سے متعلق ہیں اُن کو رفع کئے بغیر چارہ
نہیں اور وہ ایک مقدار سے تمام و کمال رفع بھی ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس تعیشات والی
احتیاجات پوری نہ بھی ہو سکیں تو کچھ زیادہ مضائقہ نہیں۔ لیکن پوری کرنے کا جس قدر
اہتمام کیا جاتا ہے وہ ھل من مزید پکارتی ہیں احتیاجات اول الذکر اصطلاحاً

سیری پزیر اور دوم غیر سیری پزیر کہلائیں گی۔ مثلاً بھوک پیاس کو لو قحط سالی اور خشک سالی میں جان بچانے کی خاطر جہاں تک استطاعت ہوتی ہے لوگ کھانا یا پانی خریدتے ہیں نیز غلہ خواہ کتنا ہی ارزاں ہو جائے اور پانی خواہ کتنا ہی وافر کیوں نہ ہو ایک مقدار معین سے زیادہ آدمی ایک وقت میں کھا پی نہیں سکتا۔ کچھ کھانا اور ایک آدھ گلاس پانی کے بعد آدمی اس وقت اس قدر سیری محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر اس کو مجبور بھی کیجئے تو زیادہ کھا پی نہ سکے غلہ اور پانی کا اگر کچھ ذخیرہ رکھا جاتا ہے تو آیندہ محض احتیاجات کے خیال سے بوقت سیری اس کی موجودگی و عدم موجودگی یکساں ہے۔ لیکن احتیاجات تعیشات کی حالت بالکل برعکس کی سی ہے۔ اگر تعیشات گراں ہوں تو لوگ اُن کی پروا بھی نہیں کرتے لیکن اگر وہ ارزاں ہو جائیں تو خریدتے خریدتے نہیں تھکتے۔ فیشن ایبل جنٹلمین کے پاس حسب استطاعت درجنوں بوٹ، سوٹ ٹائی، کالر، جراب، تصاویر، چھڑیاں، میز، کرسیاں، فرش فروش اور ہر قسم کا فرنیچر ہو۔ تب بھی اُن کا دل نہیں بھرتا ہر وقت ان چیزوں کے اضافہ کی فکر میں لگے رہتے ہیں اور جہاں کوئی چیز پسند آئی خرید لی یہ سب چیزیں مثل ذخیرہ غلہ و پانی آیندہ احتیاجات کی غرض سے نہیں فراہم کی جاتیں بلکہ ایک ہی وقت میں ان سب کی موجودگی سے لطف آتا ہے۔ لیکن تعیشات کی مقدار کتنی ہی بڑھ جائے احتیاجات متعلقہ کو مثل بھوک و پیاس پوری سیری کبھی نصیب نہیں ہوتی بلکہ مصداق آتش شوق تیز تر گردد احتیاجات کی شدت میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ امیر خواہ بقول گنوار۔ ہزار گھی ہی گھی پئیں اور گڑ ہی گڑ کھائیں لیکن اُن کی احتیاج بھوک و پیاس کی اتنی ہی مقدار بلکہ کم سے رفع ہو جاتی ہے جتنی کہ غریب کی۔ اس کے برعکس اُن کی احتیاجات تعیشات غریب کے مقابلہ میں لاکھوں گنا زیادہ مقدار سے بھی پوری نہیں ہوتیں۔ اسی سلسلہ میں یہ نکتہ جتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غیر سیری پزیر احتیاجات کی ضروریات تو بالعموم تعیشات ہیں لیکن سیری پزیر احتیاجات کی ضروریات میں سے

حصہ چہارم
باب ۱۸

بھی بعض داخل تعیشات ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ ناگزیر نہیں مثلاً شکر، دودھ اور میوہ جات، تعیشات کی اس تفریق کی اہمیت آگے چل کر اضافہ طلب کے مختلف مفہوم کے سلسلہ میں واضح ہوگی۔

ضروریات لابد اور تعیشات کی کوئی قطعی طور پر جدا جدا فہرست نہیں بنائی جاسکتی۔ کھانا، پینا یہ دو ضروریات تو بیشک دنیا بھر میں یکساں شدید و ناگزیر ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ باقی بیشمار ضروریات شدت و نوعیت کے لحاظ سے ملکی آب و ہوا۔ رسم و رواج اور مالی حالت سے متعلق ہیں وہی ایک چیز کسی کے نزدیک از حد ناگزیر ضروریات میں شامل ہے اور کوئی اس کو نہایت فضول خرچی تعیشات میں شمار کرتا ہے۔ سرد ممالک میں غریب سے غریب کو بھی چاء پینی پڑتی ہے۔ گرم ممالک میں اختیاری ہے۔ یہی حال جوتے اور بیش خرچ ادنی لباس کا ہے اول اول تنباکو یا شراب محض شوقیہ استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن چند روز بعد وہ مثل غذا لوازم زندگی میں داخل ہوجاتی ہے۔ لباس اور مکان غریب لوگوں کو اگر میسر بھی آتا ہے تو صرف بقدر ضرورت۔ لیکن امرا ان کو تعیشات کی حد تک استعمال کرتے ہیں۔ عیش پسند امرا کو آنے جانے میں سواری بغیر چارہ نہیں لیکن محنت پسند عوام اور غریب کو پیدل چلنے پھرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔

بحث بالا سے بظاہر پڑھنے والے کے دل میں ایک قسم کی بدعقیدگی پیدا ہوجائے تو عجب نہیں اس کو ہر بات غیر معین سی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت کل پہلو دیکھ لینے سے وسعت نظر پیدا ہوکر واقعات سمجھنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور بالخصوص علم المعیشت میں یہ مغالطہ ہرگز پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے کہ علم ہندسہ و طبیعات کی طرح اس کے اصطلاحات اصول و قوانین بالکل قطعی اور معین ہیں ورنہ ایسی خوش عقیدگی کا نتیجہ علم اور واقعات میں کامل مطابقت نہ ہونے سے بالآخر سخت مایوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد کی بے بنیاد بدعقیدگی کر ادھرا سب برباد کردیتی ہے۔ اسی احتیاط سے ہم اکثر جابجا یہ جتانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ معاشیات کے مسائل و اصطلاحات میں کامل تعین اور تیقن محال ہے اس کے قوانین تخمینی ہونے سے

زیادہ کا دعویٰ نہیں کر سکتے اور ان کا عمل گوناگوں شرائط کا ماتحت ہوتا ہے۔

مقدار قیمت اور تغیر پذیری طلب کے باہمی تعلق کی بابت جو عام اصول ہم نے اوپر دریافت کئے ہیں ان میں ضروریات لابد اور تعیشات کے مذکورہ بالا فرق خواص سے حسب ذیل ترمیم نمودار ہوتی ہے۔

(ل) جب کہ قیمت اعلیٰ ہو ضروریات لابد کی طلب میں بہت کچھ تغیر پذیری ہو سکتی ہے لیکن تعیشات میں بے حد کم۔ باعث فرق یہ ہے کہ ضروریات زیر بحث بوجہ لابد ہونے کے بحالت قیمت اعلیٰ بھی تعیشات کے مقابل میں بہت زیادہ خریدی جاتی ہیں اور لوگوں کو خریدے بغیر کوئی چارہ نہیں، جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے گی قیمت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ شے مذکور ضرور خریدیں گے۔ پس اگر قیمت ایسی انتہائی حد سے آگے بڑھے گی تو طلب میں جبریہ تخفیف نمودار ہوگی اور اگر قیمت میں تخفیف ہوگی تو طلب میں معقول اضافہ ہوگا کیونکہ جو لوگ خریدنے کے بے حد متمنی تھے لیکن بوجہ عدم استطاعت خریدنے سے معذور تھے وہ بھی شے مذکور تخفیف قیمت پر فوراً خریدنے لگیں گے۔ چونکہ ضروریات لابد کی طلب کم و بیش غیر اختیاری اور جبریہ سے ہوتی ہے اور اس کے برعکس تعیشات کی طلب خود اختیاری اور خوشی خواہ ہے۔ بمقابلہ تعیشات کے لوگ ضروریات لابد کی گرانی کے بہت زیادہ حد تک متحمل ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مقابلۃً ضروریات لابد کی طلب تعیشات کی طلب سے بحالت قیمت اعلیٰ زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے۔

(ب) قیمت متوسط کی حالت میں تعیشات کی طلب مقابلۃً اس وجہ سے زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے کہ اول تو ان کی احتیاج غیر سیری پذیر ہے گویا تخفیف قیمت سے بہت زیادہ اضافہ طلب کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ دوم وہ ناگزیر نہیں یعنی اُن کی طلب اختیاری ہے لہذا اضافہ قیمت سے اُن کی طلب میں بہت کچھ تخفیف ممکن ہے۔ اس کے برعکس ضروریات

لابدی کی طلب اس قدر تغیر پزیر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اول تو وہ ناگزیر ہے دوم احتیاجات متعلقہ سیری پزیر ہیں۔ سیری پزیر احتیاجات کی تعیشات میں بھی (مثلاً دودھ، گھی شکر) کم وبیش تغیر پزیری سے پائی جاتی ہے کہ وہ ناگزیر نہیں۔ کچھ ارزاں ہوجائیں تو لوگ زیادہ خریدنے لگیں اور گراں ہوئیں تو خریدنا چھوڑ دیں۔

(ج) قیمت ادنیٰ میں ہر قسم کے چیزوں کی طلب غیر تغیر پزیر ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی مقابلۃً تعیشات کی طلب ضروریات لابدی کی طلب سے کمتر غیر تغیر پزیر ہوگی یا یوں کہو کہ ضروریات لابدی کی طلب مقابلۃً بیشتر غیر تغیر پزیر ہوگی۔ اس فرق کا باعث بھی احتیاج کی سیری پزیری و عدم سیری پزیری کا خاصہ ہے جو علی الترتیب ضروریات لابد اور تعیشات سے متعلق ہے۔ تغیر پزیری طلب کے متعلق اب دو نکتے جتانے اور ضروری معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ طریق بدل کا تغیر پزیری طلب پر اثر قابل توجہ ہے۔ بدل سے مراد ہے کسی ایک چیز کے بجائے وہی احتیاج رفع کرنے کی غرض سے دوسری چیز استعمال کرنا۔ مثلاً جوتوں میں بجائے چمڑا کپڑا استعمال کرنا۔ تعمیر میں بجائے کنکر کے چونے کے ریل کے کوئلہ کی راکھ لگانا۔ قحط میں بجائے غلہ کے بھوکے جانوروں کا گوشت کھانا۔ درختوں کی چھال، پتوں اور گھاس کے ریشے سے روئی اور ریشم کی مانند کپڑا بننا ہے۔ سائنس اور ایجادات کی بدولت شاید کوئی چیز ایسی ہو کہ جس کا بدل دریافت نہ کرلیا گیا ہو ورنہ اکثر چیزوں کے متعدد بدل مستعمل ہیں۔ موجودہ جنگ یورپ میں جرمنی کی لامحدود طاقت کا ایک سب سے بڑا راز اس کا بدل میں کمال قرار پایا ہے صرف آلو سے جو جرمنی میں بافراط پیدا ہوتا ہے کھانے پینے کی ہر قسم کی چیزیں ساٹھ سے اوپر تیار کی جاتی ہیں جو گوشت اور گھی جیسی مختلف چیزوں تک کا بدرجہ اعلیٰ کام دیتی ہیں۔ طریق بدل کی کثرت بھی معاشی ترقیات کے علامات و لوازم میں سے ہے۔ اس کا طلب کی تغیر پزیری پر اثر یہ پڑتا ہے کہ اگر کسی چیز کی قیمت میں اضافہ ہو تو بطریق بدل دوسری مقابلۃً ارزاں

چیزیں استعمال ہونے لگتی ہیں اور شے زیر بحث کی طلب میں بے حد تخفیف ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی چیز کی قیمت گھٹے تو وہ خود بطور بدل دوسری مقابلۃً گراں چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے گی، تخفیف قیمت سے بھی اس کی طلب میں بہت زیادہ اضافہ ہوگا گویا طریق بدل ہر دو صورت میں کسی چیز کی طلب میں تغیر پزیری بڑھا دیتا ہے۔

واضح ہو کہ طلب میں اضافہ تین طرح پر ہوسکتا ہے جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال کر رہے ہیں اب وہ اس کو زیادہ زیادہ مقدار میں استعمال کریں۔ تعیشات کے واسطے جن کی احتیاج غیر سیری پزیر ہوتی ہے۔ اضافہ طلب کا یہ طریق نہایت کارگر ہے ضروریات لابد میں احتیاج سیری پزیر ہونے کے ایسے اضافہ کی گنجائش بہت کم ہے نیز جو تعیشات احتیاجات سیری پزیری سے متعلق ہیں مثلاً دودھ، شکر، تنباکو وہ بھی اس اضافہ سے زیادہ مستفید نہیں ہوسکتیں۔ دوم جو لوگ پہلے سے شے زیر بحث کو استعمال نہیں کرتے تھے وہ بھی اس کو استعمال کرنے لگیں ضروریات لابد تو صحت و زندگی کی خاطر جہاں تک بھی استطاعت ساتھ دے ہر کوئی حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ تعیشات سے بوجہ گرانی دستکش رہتے ہیں۔ پس اضافہ طلب کی یہ صورت بھی مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موافق ہے۔ تیسری صورت اضافہ طلب کی طریق بدل ہے کہ شے زیر بحث دوسری چیزوں کے بجائے استعمال ہونے لگے یہ صورت ضروریات لابد اور تعیشات کے واسطے یکساں عام ہے۔ بحالت ارزانی جو مزدوری پیشہ لوگ گیہوں، گھی اور شکر استعمال کرتے ہیں ان میں سے اکثر گرانی میں جو، چنا، تیل اور گڑ استعمال کرنے لگتے ہیں قحط میں لوگ کثرت سے بھوکے جانوروں کا گوشت ہی گوشت کھاتے ہیں۔

تخفیف طلب کی بھی تین صورتیں ہیں جو اضافہ طلب کی مذکورۂ بالا صورتوں کے بالکل برعکس ہیں یعنی سابق والے لوگ کمتر مقدار میں استعمال کریں یا لوگوں کی کمتر تعداد

تعداد استعمال کرے یا دوسری چیزیں شے زیر بحث کی بجائے استعمال ہونے لگیں اول دو صورتیں مقابلۃً تعیشات کے واسطے زیادہ موزوں ہیں اور تیسری ضروریات لابد کے واسطے بھی یکساں عام ہے واقعہ یہ ہے کہ اضافہ یا تخفیف طلب کی یہ تینوں شکلیں بالعموم ملی جلی رہتی ہیں لیکن جو شکل سب سے عام ہوگی اس کا اثر بھی غالب رہے گا۔

تغیر پذیری طلب کے متعلق دوسرا نکتہ قابل توجہ یہ ہے کہ اکثر چیزوں سے متعدد احتیاجات پوری ہوتی ہیں مثلاً پانی کہ وہ پینے، کھانے، نہانے، دھونے اور چھڑکاؤ میں استعمال ہوتا ہے۔ مشین چلانے میں بھی اس کی بھاپ سے بہت کام لیا جارہا ہے۔ ان چند در چند احتیاجات میں سے بلحاظ خورونوش تو پانی قطعاً ضروریات لابد میں داخل ہے لیکن نہانے دھونے اور چھڑکاؤ جیسی احتیاجات کے ہمراہ وہ بتدریج تعیشات میں داخل ہو جاتا ہے، نہانا اگر زندگی کے واسطے مہینہ میں ایک مرتبہ ناگزیر ہو تو ہر روز نہانا تعیشات میں شمار ہوگا۔ پھر کپڑے اور مکان دھونے کا نمبر آتا ہے اور چھڑکاؤ اور مشین میں پانی کا استعمال تو صرف اول الذکر چاروں احتیاجات پوری ہونے کے بعد ممکن ہے غور کرنے سے واضح ہوگا کہ اگر ایک ہی چیز سے بہت سی ضروریات حاصل ہوں جن میں سے بعض لابد ہوں اور بعض تعیشات تو ایسی چیز کی مجموعی طلب میں ضرور تغیر پذیری ہوگی۔ قیمت بڑھنے سے اس کا استعمال بطور ضروریات لابد تو بحال رہے گا۔ لیکن بطور تعیشات گھٹ جائے گا اور مجموعی نتیجہ تخفیف طلب ہوگا۔ اسی طرح پر قیمت گھٹنے سے اگرچہ بحد ضروریات لابد اس کی طلب وہی رہے گی۔ لیکن بحیثیت تعیشات اس کا استعمال بہت بڑھ جائے گا اور مجموعی نتیجہ اضافہ طلب ہوگا لیکن جو چیزیں صرف ایک ہی احتیاج پوری کریں مثلاً گیہوں، گھی اور شکر دودھ تمباکو کہ صرف کھانے پینے کے کام آئیں وہ ضروریات لابد یا تعیشات میں سے جن میں بھی شمار ہوں اُن ہی کے مذکورہ بالا قوانین کی پابند ہوں گی۔ اول الذکر قسم کی چیزوں کے

مقابلہ میں بہرحال ان کی طلب کمتر تغیر پذیر ہو گی۔

تغیر پذیری طلب کی بحث نہ صرف ضروری بلکہ دلچسپ بھی ہے اور بلا لحاظ طوالت ہم نے کل ضروری پہلو پیش نظر کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعات پر غور کرنے سے اگر ہمراہنر نہیں تو ایک بڑی حد تک تغیر پذیر طلب مذکورۂ بالا اصول کی پابند نظر آئے گی۔

موتی جواہرات کی طلب تغیر پذیر اس وجہ سے بہت کم ہے کہ جماعت کثیر کے نزدیک وہ انتہا درجہ تعیشات میں داخل ہیں اور اُن کی قیمت بھی اعلیٰ ہے۔

شکر کی طلب تغیر پذیر اور نمک کی غیر تغیر پذیر اس وجہ سے ہے کہ شکر کی قیمت متوسط ہے اور وہ داخل تعیشات ہے اور نمک کی قیمت ادنیٰ ہے اور نیز وہ ضروریات لابد میں سے ہے یہی حال دودھ اور پانی کی طلب کا ہے۔ جن ملکوں میں پانی بہت وافر نہ ہو وہاں اس کی طلب ضرور تغیر پذیر ہو گی۔

تمباکو کی طلب بھی تغیر پذیر ہے۔ کیونکہ اس کی قیمت متوسط ہے اور وہ داخل تعیشات ہے۔ چنانچہ اکثر محض اخلاقی خیال سے نہ کہ آمدنی کی غرض سے ٹیکس قائم کرکے اس کی قیمت بڑھائی جاتی ہے تاکہ اس کا مضر استعمال کم ہو۔

معاشیات کے مسائل سلجھانے میں وسعتِ نظر از حد ضروری ہے اگر کل ضروری پہلو پیش نظر نہ رکھے جائیں تو تحقیقات کا نتیجہ لا تقربوا الصلوٰۃ کا مصداق ہونا تعجب خیز نہ ہو گا۔ اگر صرف چند پہلو حسب مطلب یکجا کرکے کوئی بظاہر قطعی مسئلہ مرتب کر لیا جائے تو تجربے اور مشاہدات کی ہوا سے مثل حباب ٹوٹ جائے گا۔ مسئلہ بلا سے ادھورا ہو لیکن قرین حقیقت ضرور ہونا چاہیئے ناممکل صحیح مسئلہ مکمل ناغلط مسئلہ سے ہزار درجے بہتر ہے ہم نے اسی غرض سے بلا لحاظ طوالت ہر مسئلہ کے کل ضروری پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اوّل اوّل اگر پڑھنے والے اس کے سمجھنے میں کچھ محنت بھی کرنی پڑے گی تو اس کے معاوضہ میں ان کو صحیح معلومات

 حاصل ہوگی۔ لیکن مبہم و نکمل نما مسائل سے تو خطرناک مغالطہ کا اندیشہ وابستہ ہے۔

 (۵) مسئلہ قیمت کے کل اساسی اصول بیان ہوچکے اب صرف بازار کا مفہوم اور اُس کے متعلق چند ضروری باتیں سمجھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد ہم مبادلہ کے مرکزی مبحث قیمت پر توجہ کریں گے۔

بازار سے عرف عام میں تو مراد ایسی جگہ ہے جہاں بہت سے لوگ جمع ہوکر خرید و فروخت کریں۔ شہروں میں تو اس قسم کے مستقل بازار ہیں۔ ہر قسم کے سامان کی دوکانیں ہر روز لگی رہتی اور دوکان دار صبح سے شام تک خریداروں کے ہاتھ سودا سلف بیچتے رہتے ہیں دیہات میں ہفتہ وار پینٹھ لگتی ہے نیز شہروں میں سالانہ نمائشیں ہوتی ہیں یہ سب بازار عرفی کی مختلف شکلیں ہیں لیکن معاشیات میں بازار کا مفہوم کچھ اور زیادہ ہے۔ اصطلاحاً بازار سے مراد وہ کل خطہ ہے جس کے اندر اندر ایک وقت میں ایک چیز کی قیمت ہر جگہ برابر ہو اگر کچھ فرق ہو تو وہ بمقدار مصارف آمد و رفت ہو اور بس ایسا خطہ خواہ تمام روئے زمین پر محیط ہو یا چند ملکوں تک وسیع ہو یا کسی ملک یا اس کے حصّہ یا صرف کسی شہر یا گاؤں تک محدود ہو۔ جن جن مقامات میں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنے ہی فاصلہ پر کیوں نہ ہو کسی چیز کی ایک ہی وقت میں قیمت مساوی پائی جائے اور اگر فرق ہو تو مقدار مصارف آمد و رفت کے برابر ہو تو وہ کل اس چیز کے ایک ہی بازار میں شامل شمار کیے جائیں گے گویا ان کل مقامات تک وہ بازار وسیع مانا جائے گا مثلاً گیہوں ہندوستان میں ۳ روپیہ من فروخت ہو امریکہ میں ۴ روپیہ من انگلستان میں ۵ روپیہ من اور ہندوستان سے امریکہ اور امریکہ سے ولایت گیہوں لیجانے کا صرفہ ایک روپیہ من ہو اور ہندوستان سے براہ راست ولایت بھیجنے کا صرفہ ۲ روپیہ من ہو تو یہ تینوں ملک گیہوں کا ایک بازار شمار ہوں گے۔ اگر روئی ہندوستان مصر اور امریکہ میں ایک ہی نرخ سے فروخت ہو یا اگر کہیں کم و بیش ہو تو بس اسقدر کہ باہر بھیجنے یا باہر سے منگانے کے صرفہ کے

برابر ہو تو یہ تینوں ملک روئی کا ایک بازار مانے جائیں گے۔ لیکن اگر آم۔ خربوزہ۔ دودھ۔ دہی گاؤں میں ارزاں فروخت ہوں اور شہروں میں گراں اور قیمت کا فرق مصارف آمدورفت سے کم ہو یا زیادہ تو ہر ایک ایسا گاؤں اور شہر باوجود بے حد قریب ہونے کے ان چیزوں کا جدا جدا بازار شمار ہوگا۔ اس کل بحث سے واضح ہوا ہوگا کہ معاشی بازار کی خصوصیت لابد مساوات قیمت ہے نہ کہ قیام دکانات یا اجتماع خریداران و فروشندگان۔ بازار کا علمی مفہوم بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کی وسعت و تنگی کے اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں۔

وسعت بازار کی پہلی شرط آزادیِ مقابلہ ہے یعنی فروشندگان اور خریداران اپنے کاروبار کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں۔ اُن کو رسد اور طلب کی مقدار کا اندازہ ہو، نہ صرف قرب جوار بلکہ دور دراز مقامات میں بھی اُن کے کاروبار کی جو حالت ہو اس سے ہر وقت باخبر رہیں۔ سودا خواہ کہیں پٹے خریداران کم سے کم اور فروشندگان زیادہ سے زیادہ نرخ پر معاملہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں اس کوشش اور کشمکش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مقابلہ کے دباؤ سے ہر جگہ نرخ ہموار ہو جائے گا اور قیمت کی حالت سطح آب کی سی ہوگی۔ عالمگیر امن و امان معاشی ترقیات اور سہولت آمدورفت و خط و کتابت کی بدولت مقابلہ کا اثر بہت وسیع اور قوی ہو جانے سے بازاروں میں بھی بلا کی وسعت پیدا ہو گئی ہے اور بعض تو تمام دنیا پر مسلط ہیں۔ مساوات قیمت اور توسیع بازار کے واسطے مقابلہ شرط اولین تو ضرور ہے۔ اگر مقابلہ نہ ہو تو دو پاس پاس مقامات میں وہی ایک چیز مختلف نرخ سے فروخت ہوتی رہے اور اگر فرق قیمت مصارف آمدورفت سے زیادہ بھی ہو تو نہ خریدار اپنے سے دوسرے مقام کی ارزانی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور نہ فروشندے اپنے سے دوسرے مقام کی گرانی سے۔ جہاں قیمت کم ہے وہاں کے خریدار نفع میں ہیں اور جہاں قیمت زیادہ ہے وہاں کے فروشندے۔ بحالت مقابلہ یہ فرق قائم نہ رہ سکتا دونوں جگہ کا نرخ مل کر یوں ہموار ہو جاتا جیسا کہ قلابے سے ملے ہوئے دو حوضوں کا پانی۔

لیکن واضح ہو کہ چیز کی خرید فروخت میں مقابلہ کی یکساں گنجایش نہیں۔ بعض چیزیں تو مقابلے کے واسطے اس قدر موزوں ہیں کہ ان کے کاروبار میں ہم دنیا کے ہر خطے سے مقابلہ کرسکتے ہیں اور بعض اس قدر ناموزوں کہ باوجود ہزار کوشش ہم مقابلہ سے معذور رہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ بازار کی وسعت و تنگی نہ صرف مقابلہ ہونے نہ ہونے پر منحصر ہے بلکہ اس کا چیزوں کی نوعیت سے بھی اس قدر قریبی تعلق ہے کہ مقابلہ کو بھی اس کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ چہارم

جن چیزوں کی خرید و فروخت میں بے حد مقابلہ کی گنجایش ہے اور لہذا جن کے بازار نہایت وسیع ہوسکتے ہیں اور ہیں ان میں خواص ذیل ہونا لازمی ہے قوت مقابلہ اور وسعت بازار انہی خواص کی نسبت سے ہوگی۔

(ا) **عمومیت طلب**۔ اس چیز کی تقریباً ہر ملک میں مانگ ہونی چاہیئے۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے جب کہ ہر جگہ اس کا استعمال ہوتا ہو مثلاً سونا۔ چاندی۔ گیہوں۔ شکر۔ اون۔ روئی۔

(ب) **شناخت پذیری**۔ اس چیز کی خوبی میں ایسا تعین اور یکسانی ہونی چاہیے کہ اس کے مدارج قرار پاسکیں اور تھوڑے نمونہ سے چیز کی خوبی کا پتہ چل جائے مثلاً سونا۔ چاندی ایک ماشہ سے منوں کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے اور اگر کوئی فرق ہو تو بلا دقت پتہ چل جاتا ہے سونے اور چاندی کے مانند گیہوں اور روئی کے نمونے پورے طور پر قابل اطمینان نہیں ہوسکتے تھے لیکن چونکہ ان دونوں کی مانگ عالمگیر ہے ان کے نمونے بھی ایک عجیب طریق سے بہت کافی حد تک قابل اطمینان بنائے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ سالہا سال کے تجربہ اور کوشش سے اپنے آپ کو گیہوں روئی جیسی عام طلب والی چیزوں کا ماہر اور مبصّر بنا لیتے ہیں۔

یہ لوگ ان چیزوں کی خوبی کا درجہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً قسم اول۔ دوم۔ وسوم ان کی رائے عموماً نہایت مستند اور قابل اعتماد مانی جاتی ہے۔ لوگ اپنا اپنا مال اُن کے پاس لاتے ہیں اور بلحاظ خوبی یہ مال کا درجہ قرار دیکر مال والوں کو ایک پروانہ دیدیتے ہیں کہ فلاں نمبر

کا اس قدر مال ملو کہ فلاں ہماری تحویل میں موجود ہے۔ اور مال اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔ حصہ چہار
اس طرح پر بہت سے لوگوں کا مال لے لیکر درجہ وار بڑے بڑے ذخیرے فراہم کر لیتے ہیں باب ۱
ئیاں درجہ والے مال کی سب مقداریں ملادی جاتی ہیں۔ اور ذخیرے میں مال کی کوئی تفریق نہیں رہتی۔ مثلاً بیس آدمی اگر درجۂ اول کے گیہوں کی مختلف مقداریں لائیں تو وہ سب مل کر درجۂ اول کا ایک انبار بن جائیں گی مال والے محض ماہرین ومبصرین کے دیئے ہوئے پروانے بازار میں پیش کرتے ہیں اور خریدار پروانوں کے بھروسہ پر مال خرید لیتے ہیں اور مال ماہرین کے ہاں سے بھجوا دیا جاتا ہے۔ اس خدمت کے صلہ میں ماہرین کو دستوری ملتی ہے مال ہمیشہ پروانے کے مطابق نکلتا ہے اگر ایسا نہو تو مبصرین کا اعتبار اُٹھ جائے اور ان کا کاروبار تباہ ہو جائے خود اپنی کاروبار کی ترقی کی خاطر وہ نہایت احتیاط اور توجہ سے مال کی خوبی تشخیص کر کے پروانہ دیتے ہیں تاکہ بازار میں وقعت واعتماد بڑھے کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ بطور خود مال خریدنے کی بجائے ان کی معرفت خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

نمونے کے قابل اطمینان ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ محض نمونہ دیکھکر دور دراز مقامات سے بلاخدشہ فرمائش بھیج سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یا خریدار چیز دیکھنے آئے یا کل چیز برائے ملاحظہ اس کے پاس جائے صاف ظاہر ہے کہ اس طریق سے کاروبار چلنا محال ہے۔

(ج) **انتقال پذیری**۔ یعنی چیز اس قابل ہو کہ دور دراز مقامات تک بھیجی جا سکے اس کی دو شرطیں ہیں اول یہ کہ وہ دیرپا ہو اور گل سڑ کر جلد ناکارہ نہ ہو جائے تاکہ دیگر مقامات پہنچنے میں جو وقت صرف ہوتا ہے اس میں وہ صحیح و سالم رہے اور خریدار کے پاس عمدہ حالت میں پہنچے۔ دوم یہ کہ اس کے وزن اور جسامت کے مقابلے میں اس کی قیمت عمدہ ہو تاکہ مصارف آمد و رفت قیمت کا ایک جزو قلیل رہیں۔ سونا چاندی اس لحاظ سے سب سے بہتر ہیں کہ ان کا وزن و جسامت دونوں نہایت کم اور مقدار قیمت بہت زیادہ۔ گیہوں روئی اور شکر کا وزن د

جسامت بھی موافق ہو اور اُن کی قیمت مصارفِ آمدورفت کی متحمل ہو سکتی ہے لیکن اگر معمولی اینٹیں یا پتھر دُور بھیجے جائیں تو مصارفِ آمدورفت اصلی قیمت سے بھی کہیں بڑھ جائینگے۔ پس جو چیزیں بوجہ زیادہ وزنی جسیم اور کم قیمت ہونے کے دُور نہ بھیجی جاسکیں اُن کی قیمت میں مقابلۃً دو جگہ بہت فرق قائم رہ سکتا ہے کیونکہ مصارفِ آمدورفت اس فرق سے بھی زائد ہوتے ہیں۔ مصارفِ آمدورفت جتنے کم ہوں گے قیمت میں فرق کم رہ سکے گا۔ اور چیز جس قدر کم وزن چھوٹی اور بیش قیمت ہوگی مصارفِ آمدورفت کم ہوں گے گویا ایسی چیزوں کی خرید و فروخت میں مقابلہ قوی ہوگا اور ان کا بازار وسیع ہوگا۔

قوتِ مقابلہ اور وسعتِ بازار کے واسطے کسی چیز میں مذکورہ بالا تینوں خواص کم و بیش موجود ہونے لازمی ہیں پس صاف ظاہر ہے کہ جن چیزوں میں اُن کے برعکس خواص پائے جائیں یعنی اُن کی طلب مخصوص اور محدود ہو ان میں شناخت پذیری اور انتقال پذیری مفقود ہو تو اُن کے کاروبار میں مقابلہ ضعیف ہوگا۔ اور اُن کا بازار تنگ و مختصر۔ مثلاً پھل پھول ترکاری گوشت۔ گویا ایک طرف توچند عالمگیر بازار ہیں اور دوسری طرف مقامی بازار اور اُن کے بین بین بے شمار بازار ہیں جن کی وسعت مختلف ہے۔ مقابلہ کا وسعتِ بازار پر جو اثر پڑتا ہے مقابلہ میں جو آج کل سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں اور مقابلہ کے واسطے چیزوں میں جو خواص لازمی ہیں یہ سب جاننے کے بعد بعض نرخوں کی عالمگیر مساوات اور بعض کے بے شمار اختلافات جو ہر طرف نظر آتے ہیں سمجھنے میں سہولت ہوگی اور واقعات سے مذکورہ بالا اصول کی تطبیق بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگی۔

۵۔ جب ہم ایک چیز کا دوسری چیز سے براہِ راست مبادلہ کریں مثلاً ایک سیر گھی کے معاوضہ میں دس سیر گیہوں یا سیر بھر دُودھ کے بدلے میں یا دو بھر شکر تو یہ چیزیں اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلائیں گی۔ گویا قدر سے مراد دوسری چیزوں کی وہ مقدار ہے

جو ہماری چیز کے مبادلہ میں مل سکے لیکن جیسا کہ اہمیت مبادلہ کے تحت میں اوپر بتایا جا چکا ہے اور نیز آئندہ بعنوان زر بالتفصیل بیان کیا جائے گا۔ آج کل چیزوں کا چیزوں سے براہ راست مبادلہ شاذونادر ہی ہوتا ہے بغرض سہولت ایک خاص چیز ایجاد کی گئی ہے جو اصطلاحاً زر کہلاتی ہے۔ ہر شخص اپنی چیز کا بخوشی اُس سے مبادلہ کرنے پر تیار ہوتا ہے گویا مبادلہ میں زر ہر شخص کو قبول ہے زر کا استعمال اس قدر عام ہو گیا ہے کہ کسی دو چیزوں کے مبادلہ میں بطور ثالث اس کی وساطت ناگزیر ہے۔ چنانچہ زر کی وساطت ہی کے باعث مبادلہ کا عمل واحد اب خرید فروخت کے عمل میں منقسم ہو گیا۔ اگرچہ زر بھی خود ایک چیز ہے لیکن دنیا کی باقی تمام چیزوں سے وہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ مبادلہ میں دوسری چیزیں تو صرف بشرط احتیاج قبول کی جا سکتی تھیں لیکن اس کی مقبولیت عام ہے اور مبادلہ میں ہر شخص اس کا خواہاں نظر آتا ہے پس اگر کسی چیز کا ہم زر سے مبادلہ کریں خواہ وہ چیز خریدیں یا فروخت کریں تو زر کی وہ مقدار جو معاوضہ میں دیجائے اصطلاحاً قیمت کہلائیگی۔ مثلاً سیر بھر گھی اور دس سیر گیہوں ایک دوسرے کی قدر تھے لیکن ایک ایک روپیہ ان دونوں کی قیمت ہوتی ہے۔

اسی طرح سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر شکر جو ایک دوسرے کی قدر تھے ان کی قیمت بھی دو دو آنے ہو گی۔

آج کل قیمت کا رواج عام ہے لیکن اس کے ذریعہ سے ہم کسی دو یا زیادہ چیزوں کی باہمی قدر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً دودھ دو آنے سیر فروخت ہو گھی کا نرخ روپیہ سیر ہو۔ شکر روپیہ کی چار سیر ملے اور نمک ۱۶ سیر تو ایک روپیہ معیار قرار دینے سے معلوم ہوا کہ آٹھ سیر دودھ۔ سیر بھر گھی ۴ سیر شکر اور ۱۶ سیر نمک ایک دوسرے کے ہم قدر ہیں۔ اور ایک ایک روپیہ ان سب کی جداگانہ قیمت۔

صاف ظاہر ہے کہ قیمت قدر کی ایک خاص شکل ہے، فرق یہ ہے کہ جو چیز معاوضہ میں بطور قیمت قبول کی جاتی ہے اُس کی مقبولیت عام ہے اور وہ اصطلاحاً زر کہلاتی ہے۔ گویا قیمت وہ قدر ہے جو مبادلہ میں بشکل زر قبول کی جائے۔

مبادلہ میں جو زر دیا جائے وہ تو اس چیز کی قیمت قرار پایا اور وہ چیز اس مقدار زر کی قدر کہلائے گی۔ مثلاً جب کہ ایک روپیہ سیر بھر گھی کی قیمت ہے تو سیر بھر گھی ایک روپیہ کی قدر شمار ہوگا۔ صاف ظاہر کہ کسی چیز کی قیمت بڑھنے سے زر کی قدر گھٹتی ہے اور قیمت اُترنے سے زر کی قدر چڑھتی ہے مثلاً اگر گھی کا نرخ سیر کے بجائے تین پاؤ فی روپیہ رہ جائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپیہ کے بجائے عہ ہو جائے تو روپیہ کی قدر بجائے ایک سیر کے تین پاؤ گھی رہ گئی گویا موجودہ عہ کی قدر وہی ہے جو سابق میں ایک روپیہ کی تھی یعنی سیر بھر گھی اسی طرح اگر گھی کا نرخ سیر بھر کی بجائے ڈیڑھ سیر فی روپیہ ہو جائے یا یوں کہو کہ ایک سیر گھی کی قیمت روپیہ کے بجائے دس آنے رہ جائے تو روپیہ کی قدر ایک سیر کے بجائے ڈیڑھ سیر گھی ہو گئی۔ گویا موجودہ دس آنے کی قدر وہی ہے جو پہلے ایک روپیہ کی تھی یعنی سیر بھر گھی۔

حاصل کلام یہ کہ قیمت اشیا اور قدر زر کی تبدیلیاں بالکل ایک دوسرے کے برعکس ہوتی ہیں چیزوں کے علاوہ زر کی قلت و کثرت سے بھی ان تبدیلیوں کا نہایت قریبی مگر دقیق اور پیچیدہ تعلق ہے۔ جس کی ہم آیندہ زر کے سلسلہ میں تشریح کریں گے۔

چیزوں کی قدر و قیمت اور زر کی قدر کے سلسلہ میں یہاں مختصراً یہ بتانا بھی بے محل نہ ہوگا کہ زر کی نہ صرف قدر بلکہ قیمت بھی ہوتی ہے۔ البتہ زر کی قیمت کا ایک خاص جداگانہ مفہوم ہے۔ زر کی قیمت سے مراد شرح سود ہے جو زر مستعار پر ملے۔ چنانچہ گرانی زر سے اصطلاحاً یہ مراد ہوتی ہے کہ عام طور پر روپیہ قرض ملنے میں دقت پیش آئے اور شرح سود نسبتاً اعلیٰ طلب کی جائے اس کے برعکس ارزانی زر کے معنی یہ ہیں کہ لوگ بکثرت قرض دینے پر آمادہ ہوں اور شرح سود

حصہ چہارم باب ۱۸
بھی ادنیٰ رہے، ان مسائل سے ہم آیندہ بھی بحث کریں۔ زر کی قدر و قیمت کی طرف یہاں صرف اشارہ برمحل معلوم ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ زر کا بھی آلیس میں مبادلہ ہوتا ہے۔ روپیہ سے روپیہ اور پیسہ سے پیسہ یا گنّی سے گنّی تو کوئی بدلتا نہیں کیونکہ ان میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن روپیہ سے پیسے اور گنّی سے روپئے ضرور بدلے جاتے ہیں۔ گویا مختلف قسم کے زر کا باہمی مبادلہ ہوتا ہے ایسے مبادلہ کی شرح کے اصول ہم آیندہ زر کے تحت میں بیان کریں گے، یہاں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ جب کہ زر کا معاوضہ زر دیا جائے تو وہ بھی اصطلاحاً ایک دوسرے کی قدر کہلاتے ہیں۔ نہ کہ قیمت۔ مثلاً سولہ آنے روپیہ کی قدر ہیں اور گنّی کی قدر پندرہ روپیہ کلدار ہیں۔

واضح ہو کہ مبادلہ کی اصلی غرض حصول ضروریات ہے جس چیز کی ہم کو ضرورت نہ ہو یا کم ہو اس کے مبادلہ میں ہم ایسی چیز لینا چاہتے ہیں کہ جس کی ہم کو ضرورت یا بیشتر ضرورت ہے مبادلہ میں زر محض بطور ایک سہولت افزا آلہ یا وسیلہ کے استعمال ہوتا ہے پس درحقیقت توجہ طلب تو چیزوں کی قدر ہونی چاہیے۔ لیکن چونکہ معاوضہ کا مروجہ معیار قیمت ہے۔ لہذا قدر و قیمت کا رشتہ بتانے کے بعد ہم بھی قدر کی بجائے قیمت سے بحث کریں گے۔ نیز قدر و قیمت کے مزید تعلقات زر کے بیان میں واضح کریں گے اور اسی طرح پر مبادلہ کا اساسی مسئلہ صاف ہونے کی اُمید کی جاسکتی ہے۔

مسئلہ قیمت
۷۔ صاف ظاہر ہے کہ قیمت مبادلہ پر مبنی ہے۔ جب کسی چیز کا مبادلہ ہی ممکن نہ ہو تو اس کی قیمت کیوں کر قرار پاسکتی ہے اور مبادلہ کے واسطے جو شرائط لازمی ہیں وہ مقدمہ میں بعنوان استبدلال بالتفصیل بیان ہو چکی ہیں۔ ان کا ماحصل یہ ہے کہ مبادلہ کے واسطے اوّل کسی چیز میں افادہ شرط ہے۔ دوم اس چیز کی قلت بھی لازمی ہے۔ قلت سے مراد ہے کسی چیز کا بمقدار طلب دستیاب نہ ہونا۔ چنانچہ خود قلت میں افادہ کی شرط مضمر ہے۔ اگر کسی چیز

حصہ چہارم
باب ۱۳

میں افادہ ہی نہ ہو تو پھر لوگ اس کو طلب کیوں کرنے لگے اور پھر قلت کے کیا معنی یہاں یہ نکتہ سمجھنا خالی از لطف نہ ہوگا، قلت اور ندرت دو جداگانہ حالتیں ہیں۔ اگر کوئی چیز کتنی ہی کثیر مقدار میں پیدا ہو لیکن پھر بھی بلحاظ طلب ناکافی ہو۔ یعنی اس کی رسد طلب سے کم رہے تو اس کی قلت مانی جائے گی، اس کے برعکس اگر کسی چیز کی نہایت تھوڑی مقدار موجود ہو لیکن اس کی طلب نہ ہو تو ایسی حالت قلت شمار نہیں ہو سکتی بلکہ ندرت کہلائے گی، ہوا اور دھوپ میں انتہا افادہ موجود ہے مگر چونکہ ان کی مقدار لامحدود ہے اور وہ ہر شخص کو میسر ہیں، بوجہ قلت نہ ہونے کی اُن کی کوئی قیمت بھی نہیں، کم و بیش یہی حال لب دریا پانی اور اندرون جنگل لکڑی کا ہے۔ اگر کل کرہ ارض سونے کا ہوتا تو سونا مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت ہوتا یا اگر غلہ آسمان سے بکثرت برستا تو پھر کوئی کسی سے نہ خریدتا۔ گیہوں اور روئی جیسی چیزیں جن کی طلب عالمگیر ہے اربوں اور کھربوں ہی من پیدا ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ان کی ایسی افراط نہیں کہ لوگوں کو حسب طلب بطور خود دستیاب ہو سکیں بلکہ ان میں بھی تعین مقدار اور ملکیت کی صفات موجود ہیں۔ یعنی باوجود فی نفسہ مقدار بڑی ہونے کے بلحاظ طلب ان کی قلت ہے اور اسی وجہ سے ان کی قیمت اُٹھ جاتی ہے۔ بیس برس پرانی صدہا من شراب میں قلت اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ اس کی رسد طلب سے کم ہے۔ لیکن صرف ایک سیر دودھ جو بیس برس بوتل میں بند رکھا ہو باوجود اس قدر کم مقدار ہونے کے صفت قلت سے معرّا ہے۔ کیوں کہ اس کی طلب ہی نہیں جو کچھ اس میں ہے صرف ندرت ہی ندرت ہے۔ علیٰ ہذا اگر وڑہا گائے بکریوں کے ہوتے ہوئے اُن کی قلّت ہے۔ حالانکہ بعض وحشی جانوروں میں جن کی تعداد بہت تھوڑی ہوگی صرف ندرت ہو سکتی ہے۔ ان کی کوئی قلّت نہیں۔ گلاب چمبیلی اور بہت سے خوشبودار درخت اور بیلیں بکثرت اُگائی جاتی ہیں لیکن پھر بھی بہ حیثیت مجموعی اُن کی قلت ہے۔ اپنی اپنی قسم کے تھوڑے تھوڑے بہت سے پودے اور گھاسیں اُگتی ہیں جن کی کوئی قلت نہیں محسوس ہوتی ان میں

ندرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حاصل کلام یہ کہ ندرت سے فی نفسہ کسی چیز کی کمی مراد ہی اور وہ عمومیت کی متضاد ہی۔ لیکن قلت محض ایک صفت اضافی ہی۔ ان سے کسی چیز کی کمی فی نفسہ بلکہ بلحاظ طلب مراد ہے۔ اور وہ کثرت کی متضاد ہی۔

یہ ایک معاشی مقولہ ہے کہ قیمت کا دار مدار محض قلت پر ہے۔ اگر کسی چیز کی قلت زیادہ ہو قیمت بھی زیادہ ہوگی اور اگر قلت کم ہو تو قیمت بھی کم۔ قلت کا مذکورۂ بالا مفہوم کہ اس میں افادہ بھی مضمر ہے اور نیز قلت و ندرت کا فرق سمجھنے کے بعد قانون تقلیل افادہ کو پیش نظر رکھ کر اس مقولے کی صحت میں کوئی شک نہیں رہنا چاہیئے۔ اگر سچ پوچھو تو اس مقولے نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہی۔ لوازم مبادلہ۔ قانون تقلیل افادہ۔ قانونِ طلب و رسد اور اصول شرح قیمت یہ سب باتیں اس مقولے میں داخل ہیں، پہلے تین اجزا تو بیان ہو چکے ہیں صرف حوالہ کافی ہونا چاہیئے۔ البتہ چوتھے جزو یعنی شرح قیمت سے ہم ذیل میں جداگانہ مفصل بحث کرتے ہیں۔

قیمت مبادلہ پر مبنی ہے اور مبادلہ کے واسطے دو فریق لازمی ہیں چنانچہ خریدار اور بیچنے والے کے باہمی جھگڑنے جھگڑانے سے چیز کی قیمت طے ہوتی ہے۔ خریدار گھٹانے کی کوشش کرتا ہی بیچنے والا حتی الامکان قیمت بڑھانے میں زور لگاتا ہی اور فریقین کی کشمکش سے کوئی ایسی قیمت قرار پا جاتی ہی جس پر دونوں رضامند ہو جائیں اگر دونوں رضامند نہ ہو سکیں تو سودا نہ پٹے گا اور نہ کوئی قیمت قرار پائے گی۔ پس اصول شرح قیمت دریافت کرنے کے لئے یکے بعد دیگرے خریدار و فروشندہ دونوں فریق کے نقطہ نظر کی تحقیق لازمی ہی۔

خریدار کا طرز عمل تو صاف ہے۔ خریدنے میں وہ قانون تقلیل افادہ کا پیرو ہوتا ہی اور قیمت طلب یعنی خریدار کی پیش کردہ قیمت کسی مقدار کے افادہ مختتم سے کم یا اس کے مساوی ہوتی ہی اس طرح یہ خریدار کو زائد افادہ حاصل ہو وہ اصطلاحاً نفع المصرف کہلاتا ہی اس اجمال

حصہ چہارم باب ۱۴
کی تفصیل بعنوان قانون تقلیل افادہ موجود ہی جس کا اعادہ سراسر بے جا طوالت ہوگا۔

اب رہا دوسرا فریق یعنی بیچنے والا اس کا طرز عمل ذرا پیچیدہ اور تشریح طلب ہی جس کم سے کم قیمت پر فروشندہ مال دینے کو آمادہ ہو جائے وہ اصطلاحاً قیمت رسد کہلاتی ہی عام مقولہ ہی کہ قیمت رسد مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہی اور بظاہر بات بھی صاف ہے مصارف پیدائش سے کم قیمت پر فروخت کرنے سے بیچنے والے کا سراسر نقصان ہی اور لوگ کاروبار نفع کی خاطر کرتے ہیں نہ کہ نقصان برداشت کرنے کو لہٰذا کاروبار کی شرط اوّل یہی ہی کہ قیمت مصارف پیدائش کے برابر ضرور وصول ہوتی رہے ورنہ چند ہی روز میں کاروبار بند ہو جانا یقینی ہی۔ واضح ہو کہ بحیثیت مجموعی یہ مقولہ ضرور صحیح اور درست ہے۔ لیکن اوّل تو اس میں دو مستثنیات توجہ طلب ہیں۔ دوم بلحاظ تنگی و وسعت وقت اس مقولہ کے عمل میں اور نیز مصارف پیدائش کے مفہوم میں قابل لحاظ فرق پیدا ہو جاتا ہی چنانچہ ان نکات کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

اوّل مستثنیات کو لیجئے۔ حقیقت یہ ہی کہ قیمت کا دارومدار قلت پر ہی اور قلت کے اسباب مختلف ہیں بعض حالتوں میں قلت محض اتفاقی ہوتی ہی۔ مثلاً قدیم کرم خوردہ کتابیں بوسیدہ نقشے اور تصویریں زنگ آلودہ سکّے۔ اگر کوئی ان کا طالب نہ ہو تو ان میں ندرت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن جب محققین آثار قدیمہ میں اس کی مانگ ہو تو ساتھ ہی قلت نمودار ہو گی۔ اور قیمت کا کتنا ہی بڑھ جانا عجب نہیں۔ صاف ظاہر ہی کہ ان چیزوں کی قیمت قیمت طلب پر منحصر ہے یعنی خریدار جس قدر دینے پر رضامند ہو سکیں۔ جب ان چیزوں کو بنے ہوئے صدہا برس گزر چکے اُن کے موجودہ مالکوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کتنے کتنے کو خریدی ہو نگی۔ اور جب کہ ایسی چیزیں کسی صرفہ سے بھی تیار نہ ہو سکیں تو قیمت رسد اور مصارف پیدائش کا لحاظ خارج از بحث ہی۔ دوم جب کہ کوئی چیز بحالت اجارہ پیدا ہو نہ کہ بحالت مقابلہ تو اس صورت

میں بھی قیمت رسد کا مصارف پیدائش کے مساوی ہونا یقینی نہیں، اغلب یہ ہو کہ وہ مصارف پیدائش سے زیادہ ہوگی۔ چنانچہ اجارہ دار کے نقطۂ نظر سے اجارہ میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہو کہ قیمت حسب دلخواہ قرار دی جاسکتی ہو، اجارہ میں قیمت رسد کس اصول کے مطابق قرار پاتی ہو یہ بطور خود ایک جداگانہ مسئلہ ہو اور آگے چل کر بعنوان اجارہ ہم اس سے مفصل طور پر بحث کریں گے یہاں صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ اجارہ کی حالت میں بھی قیمت رسد کا مصارف پیدائش کے مساوی ہونا ضروری نہیں بلکہ اس سے زیادہ ہونا اغلب ہو۔ البتہ تیسری حالت میں یعنی جبکہ قلت کا باعث نہ اتفاق ہو نہ اجارہ بلکہ مصارف پیدائش ہوں تو قیمت رسد ضرور مصارف پیدائش کے مساوی ہوگی۔

مذکورالصدر ہر دو مستثنیات سے واضح ہوا کہ اوّل تو یہ مقولہ کہ قیمت رسد مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہے ان چیزوں سے متعلق ہو جو پیدا کی جاسکیں اور جن کی پیداوار میں اضافہ و تخفیف ممکن ہو۔ دوم اس مقولہ کی صحت صرف بحالت مقابلہ یقینی ہو جب کہ ہر کوئی اپنے حریف کو زک دینے اور اپنے مال کی بکری بڑھانے کی غرض سے قیمت گھٹاتے گھٹاتے مصارف پیدائش تک لے آتا ہو۔ بلکہ مقابلہ کے جوش میں کبھی کبھی حریف مصارف پیدائش سے بھی قیمت کم کر گزرتے ہیں۔ اگرچہ ایسی کمی صرف چند روزہ ہوتی ہو بہرحال اجارہ کی طرح مقابلہ میں قیمت رسد کا مصارف پیدائش سے زیادہ ہونا ممکن نہیں۔ اور مساوی ہونا اغلب ہو۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وسعت وقت کا اس قول کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہو اور مصارف پیدائش کے مفہوم میں کیا فرق نمودار ہوتا ہو۔

جب کہ وقت اس قدر تنگ ہو کہ چیزوں کی پیداوار میں حسب دلخواہ کمی بیشی نہ کی جاسکے اور چیزیں بھی سریع الزوال ہوں تو ایسے وقت کے اندر قیمت بیشتر طلب پر منحصر ہوتی ہو۔ قیمت رسد کا اثر بہت ضعیف ہوتا ہو۔ آم امرود بیر وغیرہ پھلوں کی پیداوار باغات

حصہ چہارم باب ۱۵

کی تعداد پر منحصر ہے اور باغ مدتوں میں تیار ہوتے ہیں اور مدتوں ہی بے کار۔ پس ہر فصل میں جتنے پھل پیدا ہونے ہوئے ہو گئے اور اُن کی قیمت قیمت طلب کے تابع ہوتی ہے۔ اسی طرح پر خربوزے تربوز جب کھیت میں بو دیئے گئے تو پھر اُن میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا اور اُن کی قیمت فصل پر قیمت طلب کے مطابق رہتی ہے۔ خواہ طلب ایک حالت پر برقرار ہے اور ان پھلوں کی بہت کم یا بہت زیادہ مقدار پیدا ہو یا مقدار پیداوار برقرار رہے اور طلب میں بہت زیادہ اضافہ یا تخفیف ہو جائے یا یہ دونوں تبدیلیاں کسی ترکیب سے ایک ساتھ نمودار ہوں ہر حالت میں نتیجہ وہی ایک ہوگا یعنی قیمت طلب سے قیمت قرار پائے گی۔ یوں تو شہروں میں دودھ دہی ایک مقررہ نرخ سے فروخت ہوتے ہیں لیکن فرض کرو کہ ہفتہ بھر کے واسطے بوجہ شادی و تیوہار اُن کی طلب یکایک بڑھ جائے تو ظاہر ہے کہ اتنے تھوڑے عرصے میں لوگ نئی گائے بھینس خرید کر دودھ دہی کی مقدار نہیں بڑھا سکتے، نتیجہ یہ ہے کہ قیمت بہت چڑھ جائے گی۔ اسی طرح پر اگر چند روز کے واسطے بوجہ خرابی موسم ان کی بکری بہت گھٹ جائے تو لوگ گائے بھینس جدا نہیں کر سکتے اور دودھ دہی پیسہ سیر بھی بک جائے تو عجب نہیں چونکہ یہ دونوں سریع الزوال ہیں، فروخت نہ کرنے میں سراسر نقصان ہے۔ لہذا جو کچھ بھی دام اُٹھ آئیں قیمت ہے۔ اسی طرح پر اگر سوء اتفاق سے گھوسیوں کی بہت سی بھینس گُم یا بیمار ہو جائیں یا برائے فروخت چند روز کے واسطے باہر سے بہت سی بھینس آجائیں تب بھی دودھ کی قیمت علی الترتیب بہت چڑھ اتر جائے گی۔ گویا خواہ طلب میں تبدیلی ہو یا رسد میں یا دونوں میں نتیجہ وہی ایک ہوگا قیمت طلب کا غلبہ رہے گا۔ برف کا کارخانہ ہر روز ایک مقدار تیار کرتا ہے۔ اب اگر کسی روز یکایک برف کی مانگ بہت بڑھ یا گھٹ جائے یا برف بہت زیادہ یا کم مقدار میں تیار ہو تو بہر صورت اس کی قیمت قیمت طلب کی تابع ہوگی۔

اوپر کی مثالوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ علی الترتیب چند سال، ایک فصل دو ایک ماہ دو ایک روز تک اشیا مذکورہ کی مقدار پیداوار میں کوئی حسب دلخواہ ردوبدل کرنا دشوار

ہی یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ طلب بڑھتی دیکھ کر اپنی طرف سے پیداوار بڑھا دیں اور گھٹتی دیکھ کر گھٹا دیں بلکہ اوقات مذکورہ کے اندر جو مقدار پیدا ہوتی ہی وہ پیدا ہو جاتی ہی اور قیمت محض طلب پر منحصر رہ جاتی ہے قیمت طلب جو کچھ ہو وہی چیز کی قیمت قرار پائے گی قیمت رسد کو دخل دینے کی مجال نہیں ہوتی اب یہ اتفاق پر منحصر ہی کہ قیمت طلب قیمت رسد سے بڑھ کر فروشندہ کو مالا مال کر دے یا گھٹ کر اس کا دیوالہ نکال دے۔

حاصل کلام یہ کہ سریع الزوال چیزوں کی قیمت اتنے تھوڑے عرصہ کے اندر اندر کہ اُن کی مقدار پیداوار میں حسب دلخواہ کوئی کمی بیشی نہ کی جا سکے۔ گویا مقدار پیداوار کم و بیش معین سی ہو قیمت طلب کے ماتحت ہوتی ہی۔ قیمت رسد کا اس وقت کے اندر اندر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ ایسے مختصر وقت کے اندر والی قیمت کو اصطلاحاً بازاری قیمت کہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہی کہ بازاری قیمت قیمت طلب کی پیرو ہوتی ہی اور اس میں بڑے بڑے فرق ممکن ہیں۔ پھل پھول اور ترکاریوں کی فصل بھر قیمت بدلتی رہتی ہی۔ عید تیوہار اور سہالگ کے موقعوں پر دودھ دہی کی قیمت دُگنی چوگنی ہو جانا معمولی بات ہی۔ یہی برف پیسہ سے لے کر روپوں تک بک جاتی ہی۔

تلون مزاجی بازاری قیمت کا خاصہ ہی۔ لیکن پھر بھی بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد یعنی مصارف پیدائش کے مساوی ہونا ضروری ہی۔ کیوں کہ اگر اتنے عرصہ تک کہ مقدار رسد میں کمی بیشی کی جا سکے، بازاری قیمت کا اوسط قیمت رسد سے زیادہ رہا تو مقابلہ کے زور میں لوگ رسد بڑھا دیں گے اور بصورت دیگر رسد گھٹا دیں گے مثلاً اوپر کی چار مثالوں میں بحالت بیشی اوسط بازاری قیمت بر قیمت رسد لوگ دس بارہ برس میں نئے نئے باغات لگا دیں گے دو ایک فصل میں باڑیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ گھوسی اپنا گلہ بڑھائیں گے اور کارخانہ زیادہ برف تیار کرنے لگے گا۔ اور اگر اوسط کم پڑا تو عمل اس کے برعکس ہوگا۔

اب اگر اس دوران میں طلب اپنی سابق حالت پر قائم رہی تو رسد کی بیشی کمی کے بعد

حصہ چہارم
باب ۱۵

بازاری قیمت کا اوسط مصارف پیدائش کے لگ بھگ پڑے گا۔ اگرچہ قیمت طلب کے زیر اثر بازاری قیمت اب بھی کافی تغیر پذیر رہے گی۔ اور اگر اصلاح رسد کے بعد طلب میں کوئی اور دیرپا بڑا تغیر ہو جائے تو نہ معلوم اوسط قیمت اور مصارف پیدائش میں کیا تعلق قائم ہو۔

جو چیزیں مقابلۃً زیادہ دیرپا ہیں مثلاً سونا چاندی۔ لکڑی۔ غلہ۔ کپڑا۔ جوتہ اور بہت سی مصنوعات بازاری قیمت تو اُن کی بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ قیمت طلب کی یوں سراسر پیرو نہیں ہوتی بلکہ قیمت رسد سے بھی تعلق کم و بیش ضرور لگا رکھتی ہے اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ایسی چیزوں کے کچھ مدت تک ذخیرے رہ سکتے ہیں اور اگر کوئی رد و بدل از حد قوی اور دیرپا نہ ہو تو کمی بیشی طلب و رسد کی زو ذخائر پر پڑتی ہے اور اس قدر پُر اثر ثابت نہیں ہوتی جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں۔ طلب بڑھنے یا رسد گھٹنے سے مقابلۃً بازاری قیمت میں کمتر فرق نمودار ہوتا ہے اور علیٰ ہذا طلب گھٹنے یا رسد بڑھنے سے عام مشاہدہ ہے کہ مذکور الصدر جیسی دیرپا چیزوں کی قیمت میں کہیں مدتوں بعد کوئی بڑا اور دیرپا فرق پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ سالہا سال تک قیمت ایک سطح پر قائم رہتی ہے۔ بازاری قیمت کے تغیرات بہت ادنیٰ قسم کے ہوتے ہیں اور اگر کوئی غیر معمولی فرق نمودار بھی ہوا تو وہ بہت جلد زائل ہو جاتا ہے اور قیمت پھر معمولی سطح پر آرہتی ہے۔ ایک سادہ مثال لو۔

مقدار گیہوں	قیمت طلب	قیمت رسد
۱۲۰۰ من	۲ روپیہ من	۴ روپیہ من
۱۰۰۰ ״	۲½ ״ ״	۳½ ״ ״
۶۰۰ ״	۳ ״ ״	۳ ״ ״
۵۰۰ ״	۴ ״ ״	۲½ ״ ״
۳۰۰ ״	۵ ״ ״	۲ ״ ״

قانون تقلیل افادہ اور قانون تقلیل حاصل پیش نظر رکھنے سے بلحاظ مقدار گیہوں قیمت طلب و رسد کے فرق سمجھنے میں دقت نہ ہو گی۔ اوپر کی مثال میں مقدار رسد ۷۰۰ من کے قریب رہیگی اور قیمت تقریباً ۳ روپیہ من۔ اگر مقدار رسد صرف ۵۰۰ من ہوئی تو مقابلہ کے جوش میں اس کو بڑھا کر اور اگر مقدار ۱۰۰۰ من ہو تو بخوف نقصان اس کو گھٹا کر ۷۰۰ من کر دیں گے اور قابل ذخیرہ ہونے کی وجہ سے ایسی چیزوں کی رسد میں کمی بیشی اس قدر دقت طلب نہیں جتنی کہ سریع الزوال چیزوں میں۔ اوپر کی مثال میں یہ حالت کہ مقدار رسد و طلب یعنی ۷۰۰ من ایک ہی قیمت یعنی ۳ روپیہ من پر برابر برابر ہوں۔ اصطلاحاً **توازن طلب و رسد** کہلاتی ہے۔ اور وہ قیمت کہ جس پر دونوں مقدار مساوی قرار پائیں یعنی ۳ روپیہ۔ اصطلاحاً **قیمت متوازن** اور خود یہ مقدار **مقدار متوازنہ** کہلاتی ہے۔ واضح ہو کہ کامل توازن طلب و رسد کم ممکن ہے۔ اگر کبھی نمودار بھی ہوتا ہے تو محض اتفاقی طور پر اور بہت جلد زائل ہو جاتا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ رسد ۷۰۰ من کے اور قیمت ۳ روپیہ کے قریب قریب رہتی ہے۔ کبھی کچھ زیادہ کبھی کم۔ قانون تقلیل افادہ و تقلیل حاصل مل کر ہر تبدیلی کی اصلاح جلد کر دیتے ہیں اور چیزوں کے دیرپا ہونے کی وجہ سے ایسی اصلاح سہل بھی ہے۔ ان چیزوں کی قیمت کا حال قطب نما کی سوئی کا سا ہے کہ سکون تو بہت کم ہو مگر بالعموم ادھر ادھر ہٹ ہٹ کر جلد جلد مرکز یعنی قیمت متوازن کی طرف لوٹتی رہے۔ ایسی قیمت جس کی تبدیلیاں عرصہ تک مختصر حدود کے اندر اندر رہیں اصطلاحاً **قیمت معمولی** کہلاتی ہے مثلاً چند سال سے گیہوں کی قیمت معمولی ۴ اور ۵ روپیہ من کے درمیان چلی آتی ہے۔

قیمت متوسط اور قیمت معمولی کا فرق صاف ظاہر ہے اگر ۱۰۰ چیزیں ۳ روپیہ کے نرخ سے ۴۰۰ ایک روپیہ بارہ آنہ کے نرخ سے اور ۱۵۰۰ ؏ کے نرخ سے فروخت ہوں تو قیمت معمول ایک روپیہ کہلائے گی۔ اور قیمت متوسط $\left\{\frac{(۱۰۰\times۳)+(۴۰۰\times۱\frac{۳}{۴})+۱۵۰۰}{۱۰۰+۴۰۰+۱۵۰۰}\right\} = \frac{۳۰۰+۷۰۰+۱۵۰۰}{۲۰۰۰}$

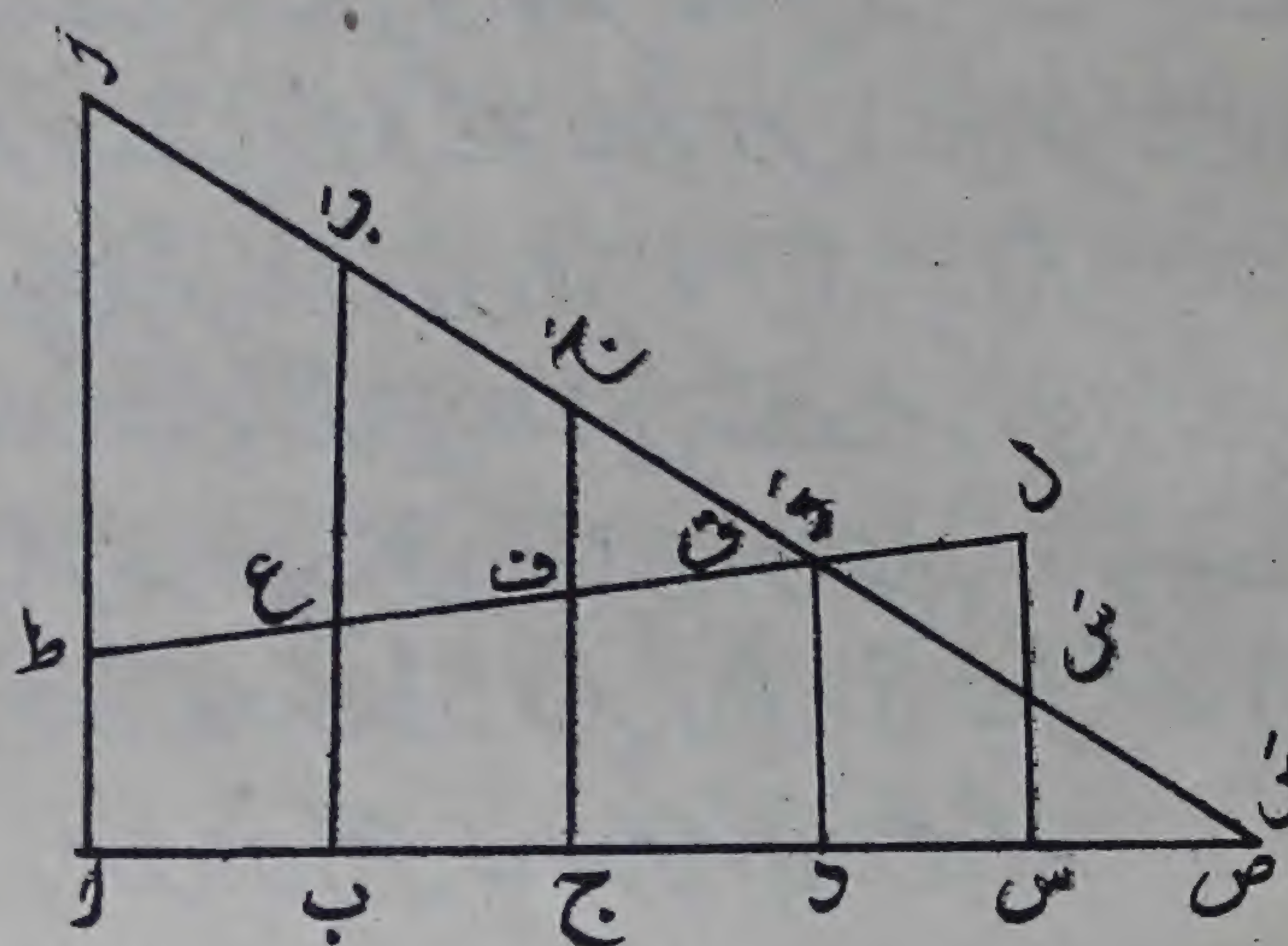
$\frac{۲۵۰۰}{۲۰۰۰}$ ۱ؑ۴ ہو گی۔

حصہ چہارم باب ۱۳

اوپر کے بیان سے واضح ہو گا کہ دیرپا چیزوں کی ٹھیٹ بازاری قیمت کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں ہوتی اُن کی قیمت بلیشتر قیمت معمولی ہوتی ہی اس کے برعکس سریع الزوال چیزوں کی قیمت معمولی کم پائی جاتی ہی ان میں بازاری قیمت کا بہت دور دورہ ہی اقیمت معمولی تو قیمت متوسط کے آس پاس رہتی ہی۔ اور بازاری قیمت اس سے دور دور لیکن قیمت متوسط ہر حالت میں مصارف پیدائش کے مساوی ہوتی ہی اگر نہیں ہی تو کچھ عرصہ میں ہو جاتی ہی لیکن حقیقت یہ ہی کہ طلب و رسد میں ہر آن اس قدر بے شمار اور طرح طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ اُن کا احاطہ محال ہی ہم ایسی تبدیلیوں کی مجموعی حالت اور اُن کے اغلب نتایج کا اندازہ کر سکتے ہیں اور بس چنانچہ مذکورۂ بالا اصول قیمت اگر ہر جداگانہ تفصیل سے موافقت نہ کریں تو اس کا باعث خصوصیات حالات ہوں گے ورنہ عام حالات کم و بیش ضرور مطابق نکلیں گے اور معاشی اصول و قوانین عام حالات کی مطابقت سے زیادہ کا دعویٰ بھی کم کر سکتے ہیں۔

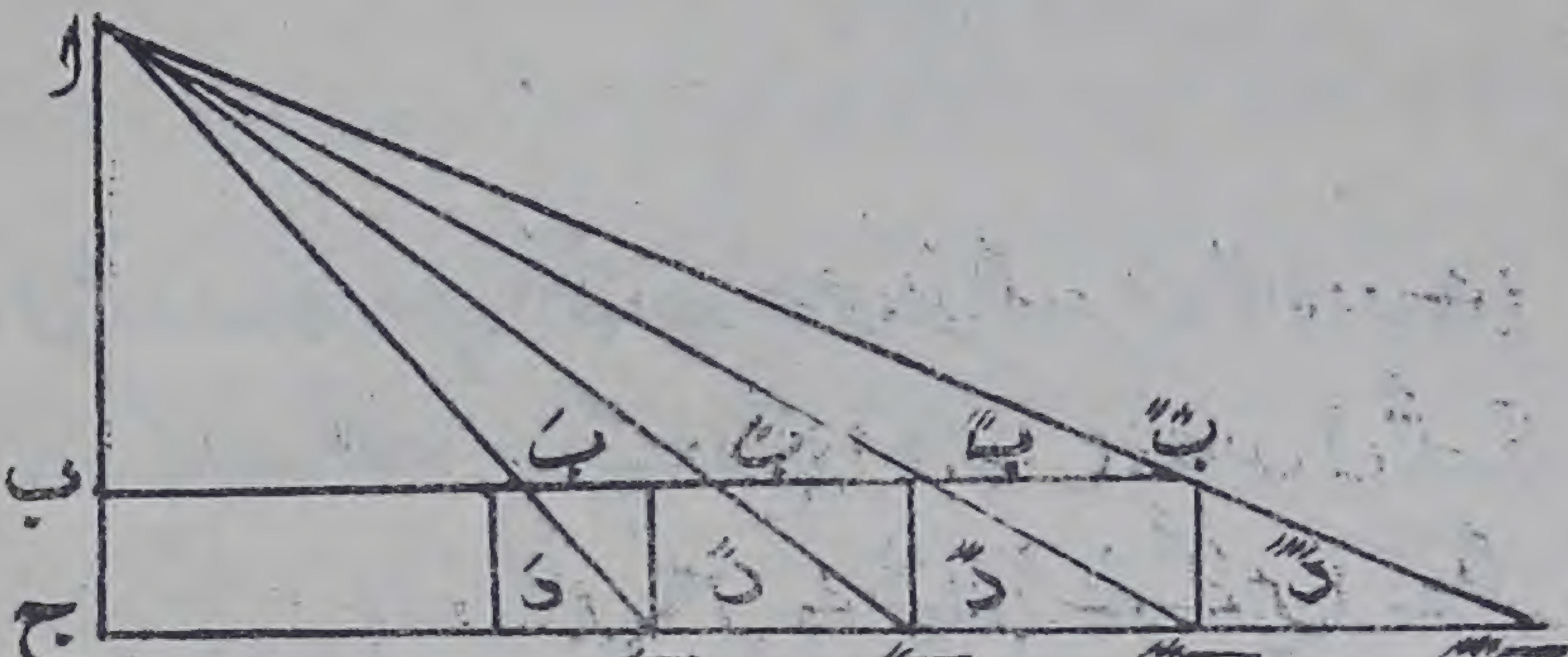
قیمت طلب یعنی وہ زیادہ سے زیادہ قیمت کہ جس پر لوگ کوئی چیز خرید نا پسند کریں افادہ مختتم کے مساوی ہوتی ہی اور قیمت رسد یعنی وہ کم از کم قیمت کہ جس پر لوگ کوئی چیز پیدا کرتا گوارا کریں مصارف مختتم کے برابر ہونی چاہیئے اس سے قبل بتایا جا چکا ہی کہ جب کسی چیز کی ایک ہی مقدار کا افادہ مختتم مصارف مختتم کے برابر ہو یعنی کسی مقدار کی قیمت طلب اور رسد بھی ہر دو ایک ہوں بالفاظ دیگر ایک ہی قیمت پر مقدار رسد و طلب برابر ہو جائے جیساکہ اوپر کی مثال میں ۳ روپیہ من کے نرخ سے ۷۰۰۰ من گیہوں تو ایسی حالت توازن طلب و رسد اور ایسی قیمت قیمت متوازن اور ایسی مقدار مقدار متوازنہ کہلاتی ہی، اب افادہ مختتم اور مصارف مختتم کے تعلقات دریافت کرنا چاہتے ہیں اگر کسی چیز کی پیدائش قانون تقلیل حاصل کی پابند ہو جیسی کہ زرعی پیداوار تو افادہ مختتم اور مصارف مختتم کی حرکت ایک دوسرے کے برعکس ہو گی۔ مقدار رسد کے اضافے سے افادہ مختتم گھٹے گا تو مصارف مختتم بڑھیں گے۔

حصہ چہارم بحالت تخفیف مقدار رسد نتیجہ برعکس ہوگا۔ ان معکوس کمی بیشی میں ایک مقام ایسا آئیگا کہ
افادۂ مختتم اور مصارف مختتم برابر ہو جائیں گے اور اس کو اصطلاحاً **مقام توازن** کہتے ہیں۔ باب ۵
توازن طلب ر سد قیمت متوازن اور مقدار متوازنہ اسی مقام توازن سے متعلق ہیں اور قیمت
معمولی بھی اسی مقام کے قرب وجوار میں گھومتی رہتی ہی، اوپر کی مثال میں ہم نے پیداوار
کو قانون تقلیل حاصل کے تابع فرض کیا ہی، ایسی حالت میں افادہ مختتم و مصارف مختتم کے
تعلقات اور معکوس حرکات شکل ذیل سے اور بھی واضح ہوں گے۔



ا سے ص تک رسد کے جزعہ ہیں اا ب ب سے ص ص تک ہر جزعہ کا افادہ ہے جو
قانون تقلیل افادہ کے بموجب گھٹکر ص پر غائب ہو جاتا ہی ا ط ب ع سے س ل تک ہر
جزعہ کے مصارف پیدائش ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے اثر سے بڑھتے گئے ہیں اَ سے لیکر
ص تک شش خط افادہ اور ط سے لے کر ل تک خط مصارف کہلائے گی۔
شکل سے واضح ہوگا کہ خط افادہ و خط مصارف رسد کے د جزعہ پر ایک دوسرے کو کاٹتے

ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ جرعہ د کا افادہ اس کے مصارف پیدائش کے برابر ہو۔ گویا د دَ قیمت صہ چلم
طلب اور د قَ قیمت رسد ایک دوسرے کے ہم وزن ہیں رسد میں جرعہ د مقام توازن ہے ا د باثبا
مقدار متوازن ہے اور د قَ یا د دَ قیمت متوازن۔ صاف ظاہر ہے کہ چونکہ جرعہ کا س کا افادہ س
سَ۔ اس کے مصارف س ل سے کم ہے لہذا مقدار ا س کی قیمت طلب قیمت رسد سے
کم رہے گی اور بخوف نقصان۔ رسد گھٹ کر مقدار ا د پر آ رہے گی اس کے برعکس
جرعہ ج کا افادہ ج جَ اس کے مصارف ج ف سے زیادہ ہے۔ گویا جرعہ ج تک قیمت
طلب قیمت رسد سے زیادہ رہے گی لہذا جوشش مقابلہ میں مقدار رسد ا ج سے بڑھ کر
ا د ہو جائے گی رسد تو مقدار ا د کے قرب وجوار میں رہے گی اور قیمت معمولی د قَ
یا د دَ کے آس پاس لیکن اگر پیداوار قانون استقرار حاصل کی پابند ہے اگرچہ ایسا شاذ و نادر
ہوتا ہے تو مصارف ہموار ہونگے ایسی حالت میں مصارف مختتم خارج از بحث ہیں جس
مقدار کا افادہ مختتم مصارف پیدائش کے برابر ہو وہی مقدار رسد قرار پا جائے گی افادہ
مختتم کے گھٹنے بڑھنے سے صرف مقدار رسد میں کمی بیشی ہوتی رہے گی قیمت اپنی جگہ پر
قائم رہے گی یہ اصول ذیل کی شکل سے اور بھی بخوبی واضح ہوگا۔

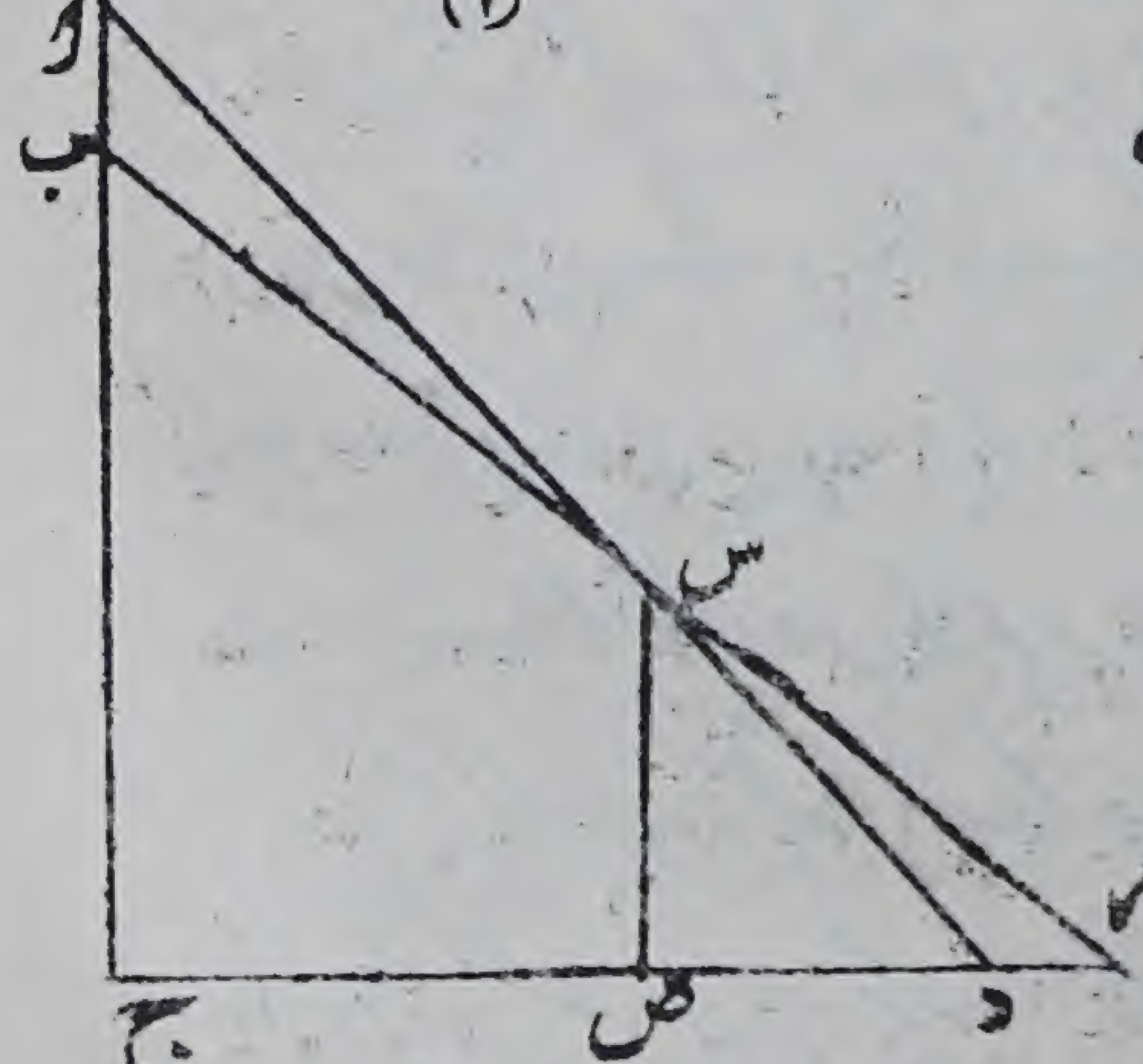


اس شکل میں کشش ب بَ خط مصادقہ ہے جو بوجہ قانون استقرار حاصل بقدر ب

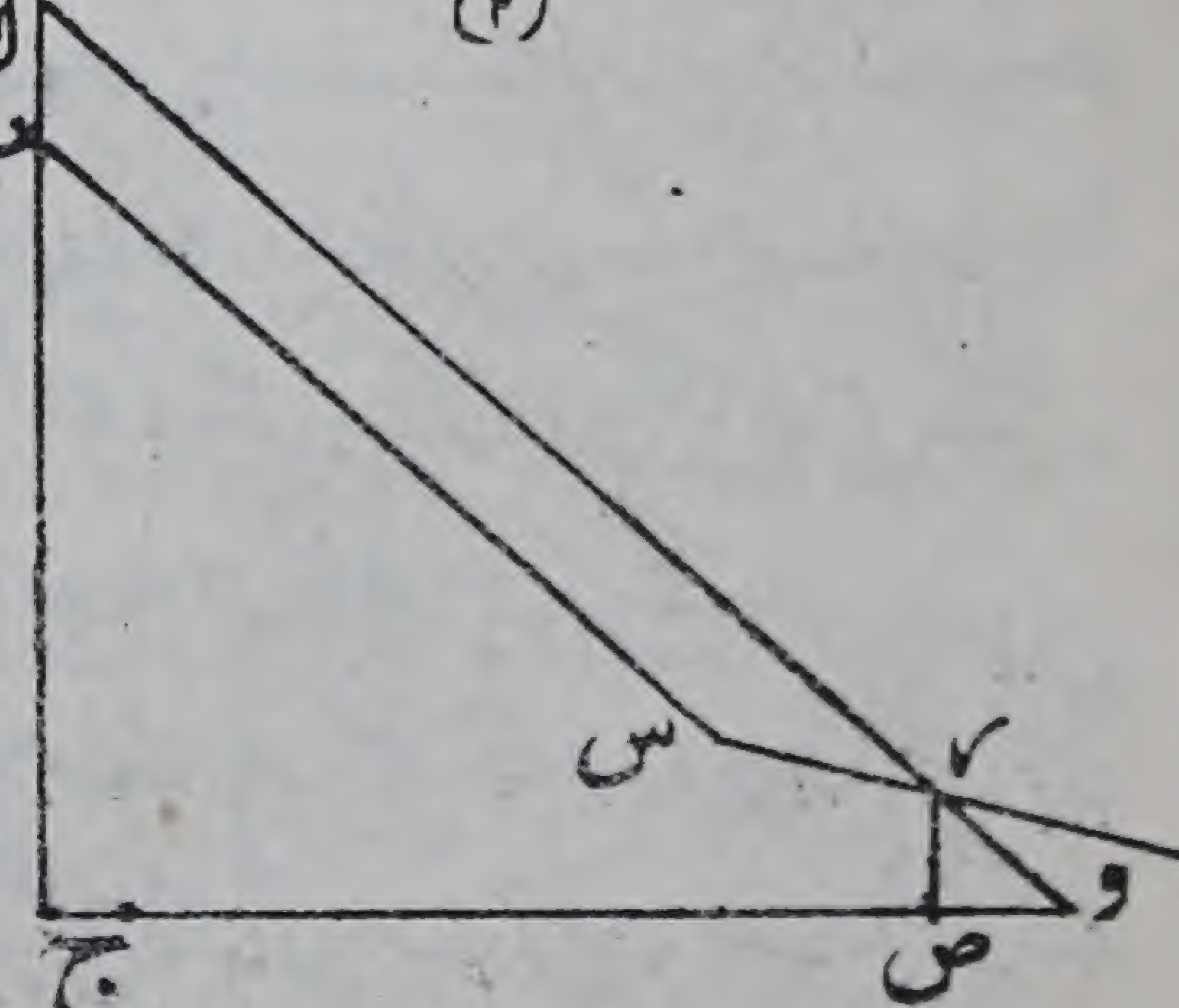
ج ہموار چلی گئی ہے اجَ اجً اجٌ اجٍ رفتار قانون تقلیل افادہ کی تیزی اور سستی کے مطابق مختلف خطوط افادہ ہیں جن کے مطابق علی الترتیب رسد بمقدار ج د۔ ج۔ دً ج۔ دٌ قرار پائے گی۔ گویا قیمت اپنی جگہ پر قائم رہے گی افادہ مختتم کے گھٹنے بڑھنے سے مقدار رسد میں کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

تیسری حالت یہ ہے کہ پیداوار قانون تکثیر حاصل کی پیرو ہو اس صورت میں افادہ مختتم اور مصارف پیدایش ایک ہی جانب ساتھ ساتھ رجحان کریں گے یعنی مقدار رسد بڑھنے سے افادہ اور مصارف دونوں گھٹیں گے اور مقدار گھٹنے سے نتیجہ برعکس ہوگا بہر حال افادہ اور مصارف کی حرکت کا رُخ ایک ہی جانب ہوگا اب یا تو قانون تقلیل افادہ کی رفتار زیادہ ہونے سے خط مصارف کو کہیں کاٹ کر رسد روک دے گا یا طریق پیدایش کے ترقی کرتے کرتے منتہائے کمال کو پہنچ جانے کے بعد مزید پیداوار پر قانون تکثیر حاصل کا عمل گھٹ کر قانون تقلیل حاصل کا عمل غلبہ شروع کرے گا تو ایسی حالت میں خط مصارف رخ بدل کہیں خط افادہ کو کاٹے گا اور وہیں رسد بھی رک جائے گی یہ دونوں صورتیں علی الترتیب ذیل کی شکلوں سے بخوبی واضح ہونگی۔

(۱)



(۲)



 شکل اول میں خط افادہ اُ د ۔ خط مصارف ب س کو بمقام س کاٹ کر مقدار رسد ج س تک
 محدود کر دے گا ۔ شکل دوم میں خط مصارف ب س بمقام س رُخ بدل کر خط افادہ اُ د کو مقام س پر کاٹ کر مقدار رسد ج س تک معین کر دے گا تیسری صورت کہ قانون تکثیر حاصل کی رفتار زیادہ تیز رہے یا اس پر قانون تقلیل حاصل کا کبھی غلبہ نہ ہو یعنی خط مصارف کبھی رُخ نہ بدلے خلاف تجربہ اور خلاف قیاس ہے اور بفرض محال ایسا ہو بھی سکے تو افادہ بالآخر غائب ہو کر رسد کو ضرور روک دے گا لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ رسد اس درجہ بڑھا کر لوگ اس کی قیمت قطعاً زائل کر دیں ۔ بہرحال اس صورت میں کوئی طرز عمل معین نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ رسد کو اس حالت میں بھی کہیں رُکنا ضرور پڑے گا ۔ رہا سوال قیمت کا سو اس صورت میں چونکہ قانون تقلیل حاصل پر قانون تکثیر حاصل کا غلبہ ہے اور مقابلہ کا جوش خروش قیمت کا تعین ان بڑے بڑے کارخانہ داروں کے ہاتھ میں رہے گا ۔ جو قانون تکثیر حاصل سے پورا پورا افادہ اُٹھا رہے ہیں اور مقابلے کے جوش خروش میں اپنے مال کی طلب بڑھانے اور کاروبار کو ترقی دینے کی خاطر وہ کم سے کم قیمت پر مال فروخت کریں گے جسقدر قیمت گھٹائیں گے اُن کا مال زیادہ بکے گا ۔ اور جسقدر مال زیادہ بکے گا اُسی قدر قیمت گھٹانے کی گنجایش نکلے گی اور ساتھ ساتھ منافع بھی بڑھتا چلا جائے گا ۔ چھوٹے چھوٹے کارخانہ دار جن کو قانون تکثیر حاصل کے فوائد اس درجہ میسر نہ ہوں ۔ چند روز نہایت کم منافع پر بلکہ نقصان سے مال فروخت کریں گے اور بالآخر تاب مقابلہ نہ لا کر کاروبار بند کر دیں گے ۔ چھوٹے کارخانہ دار کو بھلا وہ تقویت کہاں میسر ہے جو چھوٹے کاشتکار کو حاصل ہے کہ قانون تقلیل حاصل کے طفیل سے وہ بڑے کاشتکاروں کا ہم پلہ ہے اور وہ اس کا کچھ نہیں کر سکتے ۔

حاصل کلام یہ کہ قیمت طلب کا تو بہر صورت افادہ مختتم کے مساوی ہونا یقینی لیکن قیمت رسد کی حالتیں مختلف ہیں ۔ جب کہ پیداوار قانون تقلیل حاصل کی پابند ہو تو قیمت مصارف مختتم کے

مساوی ہوگی اگر قانون استقرار حاصل کا عمل ہو تو قیمت معین رہے گی۔ افادہ مختتم کی کمی بیشی سے صرف مقدار رسد میں فرق پڑے گا اور اگر قانون تکثیر حاصل کا دور دورہ ہے تو قیمت نہ تو کم سے کم مصارف پیدائش کے مساوی ہوگی اور نہ زیادہ سے زیادہ کے بلکہ ایسے کارخانہ دار جو بڑی مقدار تیار کرتے ہوں اس کی قیمت اپنے ہاں کے مصارف کے مطابق قرار دیں گے اور مقابلے کے جوش میں حتی الامکان اس کو گھٹانے کی تدبیر نکالتے رہیں گے ایسے کارخانوں کو اصطلاحاً کارخانہ ہائے معیاری اور اُن کے مصارف کو مصارف معیاری کہیں گے لیکن وہ مصارف خود اس قدر تغیر پذیر ہوں گے اُن کے مطابق کوئی قیمت معمولی قرار پانا دشوار ہے۔ پھر ایسی قیمت جس عرصہ تک بھی ایک درجہ پر قائم رہے اگر اس سے کسی کارخانے کے مصارف کم ہیں تو چونکہ وہ بازار کی مانگ پوری نہیں کرسکتا۔ قیمت گھٹانے کے بجائے بڑے کارخانوں کی مقررہ قیمت پر خوشی خوشی اپنا مال فروخت کرڈالے گا اور جس کارخانے کے مصارف پیدائش قیمت سے زیادہ ہوں تو چونکہ بہت سا مال دوسرے کارخانے دار اور بھی کم مصارف پر تیار کرسکتے ہیں۔ اس کا مال ناگزیر نہیں اور نہ وہ اپنے مصارف کے لحاظ سے زیادہ قیمت کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ قہر درویش برجان درویش۔ مجبوراً اس کو بھی اپنا مال بڑے کارخانے داروں کی مقرر کی ہوئی قیمت سے فروخت کرنا پڑے گا۔ چند روز بقا کی سعی لاحاصل بعد بالآخر کاروبار ختم کرنا پڑے گا اور میدان چند بڑے بڑے کارخانے داروں کے ہاتھ میں آجائے گا اب یا تو وہ دوراندیشی سے کام لیکر کاروبار کے متعلق آپس میں کچھ سمجھوتا کرلیں گے کہ جس میں ان سب کا فائدہ ہو یا جوش مقابلہ میں ایک دوسرے کو زک پہنچاتے پہنچاتے قانون بقائے اصلح کی مطابق صرف ایک دو باقی رہ کر کل کاروبار کے مالک بن بیٹھیں گے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں وہی ایک ہوگا یعنی مقابلہ ٹوٹ کر اجارہ قائم ہوجائے گا۔ اور لطف یہ ہے کہ مقابلہ جو اجارہ کی بیخکنی کا دم بھرتا ہے خود ہی کامیاب ہوکر اجارہ قائم کردیتا ہے مقابلہ اور اجارہ سے ہم آیندہ

حصہ چہارم باب ۱۵

جداگانہ بحث کریں گے یہاں مجمل ذکر ضروری اور کافی معلوم ہوا قصہ مختصر یہ کہ قیمت معمولی ایک طرف تو قیمت طلب کے مساوی ہوتی ہے اور قیمت طلب افادہ مختتم کے برابر دوسری طرف وہ قیمت رسد کے بھی ہم پلہ ہوتی ہے بحالت کمی ہیئتی مقابلہ کی بدولت رسد کے تغیر و تبدل سے یہ فرق خود زائل ہو جائے گا۔ رہی قیمت رسد وہ مصارف پیدائش کے مطابق قرار پاتی ہے۔ ایسے مصارف سے مراد خواہ مصارف مختتم ہوں جیسا کہ قانون تقلیل حاصل کے ساتھ یا مصارف مستقر جیسا کہ قانون استقرار حاصل کے ساتھ یا مصارف معیاری جیسا کہ قانون تکثیر حاصل کے ساتھ۔ قیمت معمولی کا قیمت رسد سے سہ گونہ تعلق واضح کرنیکے بعد اب یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بلحاظ وسعت وقت مصارف پیدائش کی مدیں اور شمار مصارف کی بنا بھی بدل جاتی ہے چنانچہ اسی نکتہ کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں۔

مصارف پیدائش کی دو مدیں مانی جاتی ہیں مصارف مقدم اور مصارف تضمینی اور ان دونوں کے مجموعے کو مصارف کلی کہتے ہیں مصارف کی یہ تقسیم بھی اور بہت سے معاشی اصطلاحات کی تقسیم کی مانند غیر مکمل ہے۔ ان کی جداگانہ فہرستیں مرتب کرنی دشوار ہیں۔ رسم و رواج کے مطابق اکثر کاروبار میں ان کا مفہوم جداگانہ ہے۔ ایک ہی مد کہیں قسم اول میں داخل ہے اور کہیں قسم دوم میں بہرحال باوجود تفصیل اختلافات کے اس قدر تحقیق ہے کہ ایسے مصارف جو محض شے زیر بحث کی خاطر برداشت کیے جائیں مثلاً پیداوار خام کی قیمت اور مزدوروں کی اُجرت تیل کوئلہ اور مشین چلانے کے دیگر مصارف و نیز مصارف فرسودگی یہ سب مصارف مقدم میں داخل ہیں۔ کیونکہ اگر وہ چیز تیار نہ کی جاتی تو یہ مصارف بھی پیش نہ آتے۔ لیکن ایسے مستقل مصارف جو محض اس چیز کے واسطے مخصوص نہ ہوں اگرچہ اس چیز کی تیاری میں اُن سے مدد ملے لیکن یہ چیز تیار نہونے کی حالت میں بھی غالباً وہ برداشت کیے جاتے مثلاً کارخانے کے منیجر اور دیگر اعلیٰ ملازمین کی تنخواہ جو عام مزدوروں کی طرح روز

نہیں بدلے جاتے۔ مشین وغیرہ کے اصل کا سود جو چیز تیار نہ ہونے کی حالت میں بھی دینا پڑتا۔ مصارف تقسیمی شمار ہوتے ہیں۔ اس تفریق کی ضرورت یہ ہے کہ مصارف مقدم ملے بغیر تو کوئی کارخانہ دار چیز تیار کر کے دے ہی نہیں سکتا۔ لیکن سرد بازاری کی حالت میں مصارف تقسیمی کا کوئی حصہ چھوڑا جا سکتا ہے اگرچہ ایسا کرنے میں بھی آیندہ نرخ خراب ہو جانے کے اندیشہ سے کارخانے دار کو تامل ہوگا۔ بہر حال یہ ممکن ہے اگرچہ غیر اغلب سہی کہ مصارف مقدم کے مساوی قیمت پر کوئی کارخانہ مال تیار کر دے۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تو گاہے گاہے صرف تھوڑے زمانہ تک ہو سکتا ہے۔ عرصہ دراز تک صرف مصارف مقدم کی مساوی قیمت پر مال فروخت کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مصارف تقسیمی ناقابل برداشت بن کر کارخانے کو بٹھا دیں گے جب مصارف کاروبار سے نکلیں گے ہی نہیں تو کارخانے دار اپنے گرہ سے کیوں ادا کرے گا اور کب تک بلکہ ہوتا یہ ہے کہ مصارف مقدم تو ہر صورت میں ملتے ہیں، رہے مصارف تقسیمی وہ اگر کہیں کم تو کہیں زیادہ اور اس طرح پر بلحاظ چند ماہ یا سال قیمت کا ایسا اوسط پڑتا ہے کہ مصارف کلی مل جاتے ہیں گویا بلحاظ زمانہ مختصر تو قیمت صرف مصارف مقدم کے مساوی ہو سکتی ہے لیکن بلحاظ زمانہ وسیع قیمت کا مصارف کلی کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ورنہ کاروبار چلنا محال ہے۔

مصارف کی مدات اوپر واضح ہو چکیں اب مصارف کی بنا لیجئے اس پر بھی وسعت وقت کا قابل توجہ اثر پڑتا ہے۔

بازاری قیمت یعنی کسی چیز کی قیمت بلحاظ اس قدر تنگ وقت کے کہ اس کی رسد میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کی جا سکے مصارف پیدایش سے کچھ تعلق نہیں وہ تو قیمت طلب کی پیرو ہے۔ خواہ قیمت رسد سے کم رہے یا زیادہ دودھ دہی پھل پھول ترکاری اور برف جیسی سریع الزوال چیزوں میں بازاری قیمت کا خاص زور رہے۔

حصہ چہارم باب ۵

رہی قیمت معمولی یعنی قیمت بلحاظ اس قدر وسیع وقت کے کہ رسد میں حسب دلخواہ کمی بیشی کی جا سکے ۔ وہ مصارف پیدائش کا بھی اتباع کرتی ہے۔ قیمت طلب و قیمت رسد دونوں کا اس پر بار پڑتا ہے۔ کبھی ایک کا پلڑا جھک جاتا ہے کبھی دوسرے کا۔ اس صورت میں وسعت وقت کے دو درجے ہو سکتے ہیں۔ اول اتنا وقت کہ صرف موجودہ کارخانوں کے کام میں اضافہ یا تخفیف کر کے دوم اتنا عرصہ کہ نئے کارخانے جاری یا موجودہ کارخانے سراسر بند کر کے رسد میں اضافہ یا تخفیف کی جائے ۔ بنظر سہولت صرف اضافہ رسد کی حالت میں وقت کے مذکورہ بالا درجوں کا مصارف پیدائش پر اثر مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کرو کہ تحقیق طور پر صرف چھ ماہ یا برس دو برس کیواسطے جوتوں کی مانگ بہت بڑھ جائے تو اتنے عرصہ تک نہ تو موجودہ ذخیرہ پر اکتفا کیا جائے گا کہ تعین رسد سے بازاری قیمت نمودار ہو جائے اور نہ اتنے دنوں کے واسطے نئے کارخانے جاری کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ہوگا یہ کہ اوقات کار حتی الامکان بڑھ کر موجودہ کارخانوں ہی سے زیادہ مال تیار ہونے لگے گا اور موجودہ ذرائع پیدائش سے زیادہ کام لیکر جو مصارف پڑیں قیمت بھی کم و بیش اس کے مطابق قرار پائے گی ۔

لیکن اگر تحقیق طور پر دس بارہ سال کے واسطے جوتوں کی مستقل مانگ بڑھ جائے تو موجودہ کارخانوں سے زیادہ کام لینے پر اکتفا نہ کر کے نئے نئے کارخانے جاری کر دیئے جائیں گے اور اُن کے اجرا کے مصارف کے لحاظ سے قیمت قرار پائے گی ۔

المختصر بازاری قیمت مصارف پیدائش سے بے سروکار ہوتی ہے اور قیمت معمولی مصارف پیدائش کے مطابق بحالت اضافہ رسد مصارف پیدائش یا تو موجودہ ذرائع پیدائش سے زیادہ کام لینے کے مصارف سے قرار پاتے ہیں یا اگر وقت اور بھی ہو تو جدید ذرائع پیدائش جاری کرنے کے مصارف سے قرار پائیں گے۔ تخفیف رسد میں عملدرآمد اس کے برعکس ہوگا۔

واضح ہو کہ تعین قیمت کی ان تینوں صورتوں کے علاوہ ایک چوتھی صورت اور بھی ہے وہ یہ کہ دنیا میں جو بے شمار اور گوناگوں تغیرات اور انقلابات ہوتے رہتے ہیں اُن کا بھی قیمت معمولی پر بتدریج لیکن یقینی طور پر اثر پڑتا رہتا ہے اور بڑھتے بڑھتے ہر ایک دو نسل بعد وہ نہایت واضح طور پر نظر آنے لگتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ وقت کے بلحاظ وسعت چار مدارج ہیں کم۔ بیش۔ بیشتر۔ بیشترین۔ اور ہر وقت کے عرصہ کی قیمت جداگانہ ہوگی۔ وقت کا قیمت پر اثر ایک نہایت دقیق اور پیچیدہ مسئلہ ہے اس کی تحقیقات کا سرا خاص طور سے مارشل جیسے عالم معیشت کے سر ہے۔ ہم نے بھی حیرانی افزا تفصیل و طوالت ترک کر کے مختصر اور سلیس طور پر قیمت کا پہلو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اوپر کی بحث سے اندازہ ہو جائے گا کہ مسئلہ قیمت میں کتنے پہلو توجہ طلب ہیں۔ قانون تقلیل افادہ و قانون طلب کا مفہوم اور مفروضہ بازار کی ضرورت سمجھنا۔ کمی بیشی رسد۔ اجارہ و مقابلہ۔ وقت کی تنگی و فراخی۔ سریع الزوالی و دیرپائی اشیاء۔ اور ہر سہ قوانین پیدائش کا قیمت اور مصارف پیدائش کے تعلق پر اثر دریافت کرنا اور نیز بلحاظ وسعت وقت خود مصارف پیدائش کی مدوں اور اس کے شمار کی بنا میں ردوبدل پیش نظر رکھنا قیمت کی عام حالت سمجھنے کے واسطے لابد ہے مگر جداگانہ قیمت تو اس قدر اثرات و اسباب کی آفریدہ ہوگی کہ ان سب کا استحصار محال ہے۔ اکثر جتایا جا چکا ہے کہ جس قدر وسعت نظر سے کام لیا جائے گا مسائل معاشیات میں صفت تعین گھٹتی گی۔ لیکن اُن کی صحت میں اضافہ ہوگا یعنی معلومات غیر معین معلوم ہونے کے ساتھ زیادہ قرین حقیقت بھی نظر آئے گی۔ اس کے برعکس تنگ نظری سے مسائل میں تعین کا محض دھوکا ہونے لگتا ہے اور جلد ہی ایسی معلومات خلاف واقعات اور بعید از حقیقت ثابت ہوتی ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ قیمت گوناگوں شرائط کی پابندی کے ساتھ طلب و رسد کی کشاکشی سے قرار پاتی ہے ان دونوں کے باہمی اثرات ناقابل تفریق ہیں اور بلحاظ عمل کسی کا تقدم یا تاخر قرار دینا محال

حصہ چہارم باب ۸ — ہی زیادہ سے زیادہ اتنا کہا جا سکتا ہی کہ بحالت قانون تقلیل حاصل اضافہ رسد پر اضافہ طلب مقدم ہی۔ لیکن بحالت قانون تکثیر حاصل اضافہ رسد کشائش طلب کا باعث بھی ہو سکتا ہی۔

مبادلہ کی اہمیت کے تحت میں ہم نے اشارہ کیا تھا کہ تقسیم دولت بھی مبادلہ کی ایک خاص صورت ہی اور یہی چنانچہ دیگر سامان کی طرح محنت اور خدمات اصل کی بھی خرید و فروخت ہوتی ہے اور اُن کی قیمت اصطلاحاً اجرت اور سود کہلاتی ہی۔ ان کی بھی بازاری قیمت اور قیمت معمولی دونوں قسم کی ہوتی ہی۔ منجانب خریدار وہ بہرصورت افادہ مختتم کی تابع ہوتی ہی اور منجانب فروشندہ مصارف پیدائش کی پیرو۔ شرح اُجرت۔ شرح سود و شرح منافع کی بحث اسی قول کی تفصیل ہی اور اس قدر معاشی معلومات کے بعد غور کرنے سے یوں بھی اس قول کی صحت سمجھ میں آنی دشوار نہ ہونی چاہیے۔

رہی زمین اس کی خرید فروخت کی حالت اس چیز کی سی ہی کہ جس کی قلت اتفاقی ہو اور جس کی رسد میں کوئی قابل لحاظ تخفیف یا اضافہ نہ ہو سکے۔ اور لگان قدرت کا ایک عطیہ ہے کسی چیز کا معاوضہ یا قیمت نہیں۔

قیمت کے متعلق اب صرف ایک نقطہ بتانا باقی ہی جو دلچسپ بھی ہی اور ضروری بھی۔ وہ یہ کہ مختلف چیزوں کی قیمتوں کا ایک دوسری پر کیا اثر پڑتا ہے اور کیونکر قیمتوں کے باہمی رشتے اکثر اسقدر وسیع دقیق اور پیچ در پیچ ہوتے ہیں کہ ان سب کا پتہ چلنا محال ہی لیکن چند اصول ذیل میں واضح کیے جاتے ہیں جس سے قیمتوں کے عام تعلقات سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہی۔

طلب مشترک و طلب مرکب — (۸) روٹی کھانے کے واسطے چاہیے گویا روٹی سے براہ راست بھوک کی احتیاج رفع ہوتی ہی۔ لباس پہننے کے واسطے درکار ہی اس سے بھی تحفظ بدن کی احتیاجیں براہ راست پوری ہوتی ہیں۔ مکان رہنے کے واسطے ضروری ہی وہ بھی قیام و آسائش کی احتیاج پوری کرتا ہی۔ کتاب پڑھنے کے واسطے مطلوب ہوتی ہی ایسی تمام چیزوں کی طلب جن سے براہ راست

کوئی احتیاج پوری ہو اصطلاحاً طلب بلا واسطہ کہلاتی ہے گیہوں۔ آٹا پیسنے کی چکی۔ ایندھن اور روٹی پکانے کے برتن جو روٹی کی تیاری کے واسطے ناگزیر ہیں۔ روئی۔ ریشم۔ اون۔ تاگا کاتنے اور کپڑا بننے کی مشین۔ سوئی قینچی۔ کپڑا سینے کی مشین جو لباس کی تیاری میں ناگزیر مدد دیتی ہے اینٹ۔ چونہ۔ لکڑی۔ لوہا۔ راج۔ بڑھئی۔ لوہار۔ مزدور جو عمارت بنانے میں کام آئیں۔ اور کاغذ۔ روشنائی۔ پریس جو کتاب طیار کرے۔ سب چیزیں خود تو براہِ راست کوئی احتیاج رفع نہیں کرتیں لیکن ایسی چیزوں کی تیاری میں ناگزیر مدد دیتی ہیں جن سے براہ راست کوئی احتیاج پوری ہو سکے لہذا یہ سب چیزیں بالواسطہ احتیاج رفع کرتی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک کی طلب بھی اصطلاحاً **طلب بالواسطہ** کہلاتی ہے۔ بالفاظ مختصر جو چیزیں تیار ہو کر براہِ راست کوئی احتیاج رفع کریں اُن کی طلب تو بلا واسطہ کہلاتی ہے اور ایسی چیز تیار کرنے میں جو جو پیداوار خام اور ذرائع پیدائش کام آئیں اُن میں سے ہر ایک کی طلب بالواسطہ شمار ہوگی۔ مثلاً چھاتہ کی طلب بلا واسطہ ہے لیکن کپڑا۔ لوہا۔ لکڑی جس سے چھاتہ تیار ہو اُن کی طلب بالواسطہ کہلائے گی اسی طرح پر جوتہ کی طلب بلا واسطہ اور چمڑے۔ ڈورے کیل۔ پالش اور جوتہ بنانے کے ضروری اوزار کی طلب بالواسطہ ہوتی ہے۔

غور کرنے سے واضح ہوگا کہ جو جو پیداوار خام اور ذرائع پیدائش کسی چیز کی تیاری میں کام آئیں اُن کا سلسلہ اس قدر وسیع ہے کہ کہیں کہیں نامتناہی سا معلوم ہوتا ہے لیکن عملی اور نیز علمی تحقیقات کے واسطے سلسلہ کے تھوڑے سے قریب ترین حصہ پر اکتفا کرنا ضروری بھی ہے۔ اور مفید بھی۔ سلسلہ کا اتنی دور تک بڑھانا کہ حیرانی کن طوالت پیدا ہو جائے سراسر عبث ہے۔

جب کہ متعدد چیزیں مل جل کر ایک چیز تیار کریں یعنی جب کہ کسی چیز کی تیاری میں بہت سی چیزوں کی شرکت ہو تو ایسی کل چیزوں کی مجموعی طلب اصطلاحاً **طلب مشترک** کہلاتی ہے

گویا سب چیزوں کی جداگانہ طلب بالواسطہ کو مجموعی طور پر طلب مشترک کہتے ہیں یا یوں کہئے کہ طلب بالواسطہ طلب مشترک کے اجزا ہیں اور طلب بلاواسطہ اُن کا ست یا عطر۔

بالواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت تو عام اصول قیمت کے مطابق قرار پاتی ہے اور یہی حال بلاواسطہ طلب والی چیزوں کا بھی ہے نیز ظاہر ہے کہ آخرالذکر چیز کی قیمت اول الذکر کی قیمتوں کا مجموعہ ہوتی ہے اب یہ تحقیق کرنا مقصود ہے کہ اگر چند چیزیں مل جل کر ایک چیز تیار کرتی رہیں تو ایسی حالت میں ان میں سے کسی چیز کی قیمت بڑھنا کن کن صورتوں میں ممکن ہے۔ اضافہ قیمت کس حد تک قابل برداشت ہو سکتا ہے نیز یہ کہ اس حد سے تجاوز کرنے کا دوسری چیزوں کی قیمت پر کیا اثر پڑے گا۔

بہ شرائط ذیل کسی بالواسطہ طلب والی چیز کی قیمت میں بوجہ تخفیف رسد بہت کچھ اضافہ ممکن ہے۔

(ا) اول یہ کہ من جملہ تمام بالواسطہ طلب والی چیزوں کے وہ چیز بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری کے واسطے سراسر یا تقریباً ناگزیر ہو اور اس کا کوئی بدل بہت زیادہ قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکے۔

(ب) دوم جس چیز کی تیاری میں چیز معلومہ کام آئے اس کی طلب بھی تغیر پذیر ہونی چاہیئے تاکہ قیمت بہت زیادہ بڑھنے پر بھی طلب میں تخفیف کم ہو۔ اس خصوصیت کی ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس چیز کا کوئی بدل بہت قیمت پر بھی میسر نہ آسکے۔

(ج) سوم چیز معلومہ کی قیمت بلاواسطہ طلب والی چیزوں کی قیمت کا ایک چھوٹا جزو ہو تاکہ اول الذکر قیمت کا بہت زیادہ اضافہ بھی آخرالذکر قیمت میں تھوڑا سا معلوم ہو۔ مثلاً اگر پہلی قیمت دوسری کی صرف ۵ فی صدی ہو تو اس کے سہ گنا ہونے پر بھی دوسری قیمت میں اضافہ بقدر ۱۰ فی صدی نظر آئے گا جو کچھ زیادہ نہیں۔

(د) چہارم اگر چیز معلومہ کے علاوہ دوسری چیزیں جو بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری میں کام آئیں وافر ہوں اور کسی دوسرے کام میں بہت کم آسکیں تاکہ تھوڑی سی تخفیف طلب سے اُن کی قیمت بھی گھٹ جائے تو ایسی تخفیف قیمت میں سے چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ کی اور بھی گنجائش نکل آئے گی۔

اگر حالات مذکورۂ بالا شرائط کے برعکس ہوں یعنی چیز معلومہ ناگزیر نہ ہو یا معمولی قیمت اس کا بدل مل سکے یا جس چیز کی تیاری میں وہ کام آئے اُس کی طلب تغیر پذیر ہو یا اُس کا معمولی قیمت پر بدل میسر آجائے یا چیز معلومہ کی قیمت تیار شدہ چیز کی قیمت کا بڑا حصہ ہو یا بالواسطہ طلب والی دوسری چیزیں اور کام آسکیں تو باوجود تخفیف رسد چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ نہ ہو سکے گا۔ نیز واضح ہو کہ مذکورۂ بالا اضافہ قیمت کچھ عرصہ تک تو ضرور قائم رہے گا۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گوناگوں معاشی تغیرات کے ہاتھوں کچھ دنوں بعد اس کا کیا حشر ہو۔

جن جن صورتوں میں اضافہ قیمت ممکن ہے اُن کو دریافت کرنے کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ کس حد تک یہ اضافہ دوسری چیزوں کے حق میں قابل برداشت ہو سکتا ہے تاکہ باوجود اپنے میں سے ایک کی قیمت میں اضافہ ہونے کے وہ مل جل کر چیزوں کی تیاری جاری رکھیں اور کس حالت میں یہ اضافہ اس قدر گراں بار ہو جائے گا کہ وہ چیزیں بلاواسطہ طلب والی چیز کی تیاری چھوڑ کر جدا ہونے پر مجبور ہو جاویں اور یا تو بے کار پڑی رہیں یا نہایت ادنیٰ کاموں میں جا لگیں قابل برداشت اضافہ قیمت کی حد کے متعلق اصول یہ ہے کہ تیار شدہ چیز کی قیمت دوسری بالواسطہ طلب والی چیزوں کی مجموعی قیمت سے جس قدر بڑھ سکے گی اُسی قدر چیز معلومہ کی قیمت میں اضافہ ممکن ہوگا۔ مثلاً تین چیزوں سے جن کی قیمت ۴ر ۸ر اور ۱۲ر ہے ایک چیز تیار کی جائے اور ایسی سو چیزیں عہ کے حساب سے فروخت ہو جائیں۔ اب فرض کرو کہ ۴ر قیمت والی چیز کی رسد میں اس قدر تخفیف ہو جائے کہ صرف ۵۰ چیزیں تیار ہو سکیں اور اُن کا نرخ بڑھ کر ۲ا ہو جائے

باقی دو چیزوں کی قیمت تو وہی ۸ر آنہ اور ۱۲ر قائم رہے گی بلکہ بوجہ تخفیف طلب کچھ گھٹ جائے تو عجب نہیں پس تیار شدہ چیز کی قیمت کا اضافہ (۶ر، ۸ر) ۸ر پہلی چیز کی قیمت ۱۴ر میں شریک ہو کر اس کو ۱۲ر تک بڑھا دے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اسی چیز کی رسد کی تخفیف سے طیار شدہ چیز کی رسد میں بھی تخفیف پیدا ہوئی اور اُسی کی بدولت قیمت میں اضافہ ہوا پس وہی چیز اس اضافہ کی مالک بھی بنے گی۔

جس صنعت و حرفت میں جرمن ساخت کے رنگ وغیرہ استعمال ہوتے ہیں اور ان میں مذکور الصدر شرائط بھی کسی حد تک پوری ہوتی ہیں تو بوجہ تخفیف رسد رنگ وغیرہ تیار شدہ چیزوں کی قیمت اور چیز معلومہ کی قیمت کا اضافہ اوپر کے اصول کا پابند نظر آئے گا۔ غور کرنے سے ایسی متعدد موزوں مثالیں نظر آسکتی ہیں۔

اب اگر چیز معلومہ کی قیمت بوجہ از حد تخفیف رسد اسقدر بڑھ جائے کہ کسی تیار شدہ چیز کی قیمت کے اضافہ میں سے اس کا کل اضافہ نہ نکل سکے اور نہ دوسری چیزوں کی تخفیف قیمت سے اس کی تلافی ہو تو اُس چیز کی تیاری بند کرنی پڑے گی اور دوسری چیزیں محض بے بسی کی حالت میں جدا ہو جائیں گی۔ اور جب وہ کسی کام ہی نہ آئیں گی تو پھر اُن کی قیمت کہاں سے آئے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی قیمت کا خون چیز معلومہ کی گردن پر ہے جس نے اپنی قیمت بڑھا کر ان سب کو جدا اور بے کار کر دیا اور خود اب بھی چند خاص خاص کاموں میں شریک رہ کر اس قدر اعلیٰ قیمت وصول کر رہی ہے۔

سنا ہے امریکہ میں ہوشیار باورچی کی بہت قلت ہے اور اس کی اُجرت بھی نہایت اعلیٰ ہوتی ہے باورچی کی تنخواہ زیادہ ہونے کا نتیجہ ہے کہ اکثر قسم کے گوشت اور ترکاریاں نہایت ارزاں ملتی ہیں کیونکہ اُن کی طلب کم ہوتی ہے اس کے برعکس فرانس میں ہوشیار باورچی مناسب اُجرت پر بکثرت مل سکتے ہیں اور انھیں گوشت اور ترکاریوں کی فرانس میں قیمت بھی خاصی ملتی ہے۔

کیوں کہ یہاں پر اُن کی طلب ہی۔ طلب نہ ہونے اور ہونے کا راز اور قیمت کی کمی بیشی کا باعث دراصل باورچی کی اُجرت کی بیشی کمی میں مضمر ہی۔ تیار شدہ کھانے کی قیمت کے لحاظ سے امریکہ میں اس کی اجرت گراں بار ہی اور فرانس میں قابل برداشت، ہندوستان میں بہت سی کارآمد چیزیں محض اس وجہ سے ناکارہ پڑی ہوئی ہیں کہ اُن سے چیزیں تیار کرنے والوں کی قلت ہی اور اُن کی اجرت اس قدر زیادہ ہی کہ تیار شدہ چیز کی قیمت اس کی متحمل نہیں ہوسکتی اگر اُجرت کم ہوتی تو جو چیزیں اب کوڑیوں کے مول بھی نہیں بکتیں۔ اُن سے لاکھوں روپیہ کا قیمتی سامان تیار ہوا کرتا ہی "دمڑی کی گڑیا ٹکا سر منڈائی" یہ مثل اسی واقعہ یعنی چیز معلومہ کی قیمت گراں بار ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

حصہ چہارم باب ۱۸

طلب بالواسطہ والی چیزوں کی قیمت میں جو کمی بیشی ہوتی رہتی ہی مذکورالصدر اصول کی روشنی میں ان کو مطالعہ کرنے سے عجیب و غریب اور نہایت دلچسپ و نتیجہ خیز معلومات حاصل ہوسکتی ہے جو عملی کاروبار میں بھی قابل قدر ثابت ہوگی۔

طلب مشترک سے ایسی کل چیزوں کی طلب بالواسطہ کا مجموعہ مراد ہی جو کسی طلب بلاواسطہ والی چیز کی تیاری میں کام آئیں۔ لیکن جس طرح چند چیزوں سے مل کر ایک چیز تیار ہوتی ہے اسی طرح ہر ایک چیز جداگانہ چیزوں کے بنانے میں کام آتی ہی۔ یعنی چند جدا جدا بلاواسطہ طلب والی چیزوں کے بنانے میں ایک ہی بالواسطہ طلب والی چیز استعمال ہوتی ہی مثلاً چمڑا کئی کام آتا ہے۔ اس سے جوتے ہینڈ بیگ۔ سوٹ کیس۔ بستر بند۔ گھوڑوں کے ساز، کاٹھی سپاہیوں کی پیٹیاں اور کل چلانے کی مال اور رسے تیار ہوتے ہیں۔ چمڑے کی ان کل طلبوں کے مجموعے کو اصطلاحاً **طلب مرکب** کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان طلبوں میں سے اگر کسی میں معقول اضافہ ہوجائے تو باقی شعبوں کی رسد میں تخفیف ہونے سے حسب گنجایش کل شعبوں میں چمڑے کی قیمت بڑھ جائے گی۔ طلب مرکب کا یہ اصول اس قدر صریح اور سادہ ہی کہ مزید تشریح کا محتاج نہیں واضح ہو کہ یہاں بھی عرصۂ وقت مختصر فرض کیا جاتا ہی۔ ورنہ زیادہ وسیع عرصہ میں چمڑے

کی قیمت کیا قرار پائے کوئی نہیں بتا سکتا۔

حصہ چہارم باب ۱۶ ۹۔ اکثر چند چیزیں ایک ساتھ مل کر پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً چمڑا گوشت اور ہڈی۔ غلہ اور بھوسا ایسی چیزوں کے رسد کے مجموعے کو جو ایک ہی ساتھ مل کر پیدا ہوں اصطلاحاً **رسد مشترک** کہتے ہیں۔ اس کی حالت بعینہ طلب مشترک کی سی ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ طلب مشترک والی متعدد چیزیں مل کر ایک چیز تیار کرتی ہیں اور رسد مشترک والی متعدد چیزیں مل کر ایک چیز سے پیدا ہوتی ہیں۔

گائے بھینس یا بکری سے گوشت چمڑا اور ہڈی ایک ساتھ مل کر حاصل ہوتے ہیں۔ اب اگر چمڑے کی طلب میں اضافہ ہو اس کی قیمت بڑھے تو زیادہ ڈھور ذبح ہونے لگیں گے۔ گوشت اور ہڈی کی رسد میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونے سے اُن کی قیمت گھٹ جائیگی۔ ایسی صورت میں چمڑے کی قیمت کا اضافہ، گوشت اور ہڈی کی قیمت کی مجموعی تخفیف سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر ضروری ہے ورنہ چمڑے کی رسد میں کشائش محال ہے۔

جب کہ **قانون غلہ** کی رو سے ولایت میں غلہ کی درآمد بند تھی مصارف کاشت بیشتر غلہ سے اور کمتر بود ہائے غلہ کے تنکوں کی قیمت سے حاصل ہوتے تھے۔ لیکن جب سے قانون مذکور منسوخ ہو کر غلہ کی درآمد شروع ہوئی ولایت میں غلہ کی قیمت گھٹ گئی جس کی وجہ سے رقبہ کاشت بھی تنگ ہو گیا۔ ولایت میں غلہ کے ساتھ تنکوں کی رسد بھی گھٹ گئی اور تنکے ٹوپیوں اور ٹوکریوں کے بنانے میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ غلہ کی قیمت گھٹنے کے ساتھ ساتھ بوجہ تخفیف رسد تنکوں کی قیمت میں اضافہ ہوا جس نے قیمت غلہ کی تخفیف کی تلافی کر دی۔ چنانچہ ولایت میں جو کسان غلہ بوتا ہے وہ مصارف کاشت کا ایک معقول حصہ تنکوں کی قیمت سے اور باقی غلہ سے وصول کرتا ہے۔

اس کے برعکس جن ملکوں سے غلہ ولایت جانا شروع ہوا وہاں بوجہ اضافہ رسد ایسے

تنکوں کی قیمت گھٹ گئی۔ اور بوجہ اضافہ طلب غلہ کی قیمت میں جو اضافہ ہوا اس نے تنکوں کی قیمت کی تخفیف پوری کردی۔ جب تک برآمد گوشت کا رواج نہ ہوا۔ آسٹریلیا میں گوشت کوڑیوں کے مول فروخت ہوتا رہا۔ اور بھیڑوں کی کل قیمت اُن کی اُون سے وصول ہوتی رہی جو بمقدار کثیر دیگر ممالک کو بھیجی جاتی تھی۔ جب سے انگلستان میں درآمد اُون شروع ہونے سے مقامی اون کی قیمت گھٹی بھیڑوں کا پالنا بھی کم ہوگیا ساتھ ساتھ تازہ گوشت کی رسد میں بھی تخفیف نمودار ہونے سے اس کی قیمت میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہو کہ اب گوشت کی خاطر ولایت میں بھیڑ کو بہت موٹا کرنے کی کوشش کی جاتی ہو خواہ ایسا کرنے سے اُون کی مقدار اور خوبی میں کچھ کمی اور نقص کیوں نہ آجائے وجہ یہ ہو کہ اب بھیڑ کی قیمت حسب سابق اُون سے اس قدر وصول نہیں ہوتی جتنی کہ گوشت سے۔ ان مثالوں سے واضح ہوا کہ بالعموم رسد مشترک والی چیزوں میں سے کسی ایک یا بعض کی قیمت کی تبدیلی سے باقی کی قیمت میں برعکس تبدیلی نمودار ہوکر تبدیلیوں کے مجموعی اثر کو بہت معتدل بنا دیتی ہو اور قیمت کی ایسی معکوس تبدیلیاں لازم ملزوم سی ہوتی ہیں اور جس چیز کی تبدیلی پر قیمت کا اثر غالب ہوتا ہو رسد اُسی کی پیروی کرتی ہو۔ مگر دوسری چیزیں اضافہ رسد سے قیمت گھٹتی اور تخفیف سے بڑھ جاتی ہو۔

طلب مشترک اور رسد مشترک کی طرح طلب مرکب کی بھی ہم پلہ **رسد مرکب** ہوتی ہے ایک چیز بنانے میں متعدد چیزیں جدا جدا کام آسکتی ہیں۔ مثلاً کاغذ ہو کہ چیتھڑوں۔ درخت کی چھالوں اور گھاسوں سے تیار ہوتا ہو۔ چمڑا کپڑا ایلکہ چند روز سے کاغذ کا پٹھا بھی جوتوں میں لگایا جاتا ہو۔ رسد مرکب والی چیزیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں بطور بدل کام دے کر ان میں سے ہر ایک کی قیمت کے اضافہ میں مانع ہوتی ہیں اور کسی ایک کی قیمت کی تخفیف دوسروں کی تخفیف کا باعث ہوسکتی ہے۔

گیہوں جو چنا جوار باجرہ اور مکا جیسے غلوں کی قیمت کا ایک دوسری پر برابر اثر پڑتا ہے

ایک کی ارزانی سے باقی بھی کم وبیش ارزاں ہوجاتے ہیں اور کسی ایک یا بعض کے اضافۂ قیمت کو باقیوں کی موجودگی کم وبیش روکتی رہتی ہی۔

حصہ چہارم
باب ۱۵

اس کل باب کا لب لباب یہ ہی کہ اگر چیزوں کی قلت محض غیر اختیاری ہے اور اُن کی رسد میں بیشی کمی نہیں ہوسکتی تو اُن کی قیمت قیمت طلب کی مطیع رہے گی ورنہ بصورت دیگر اُن کی قیمت قلیل عرصہ کے واسطے تو محض قمیت طلب کی پابند ہوسکتی ہی مگر زیادہ عرصہ کے اندر وہ مصارف پیدائش کی بھی پیرو ہوجائے گی، رہیں وہ چیزیں جن کی رسد میں کمی بیشی بحالت اجارہ ہوتی ہی۔ اُن کی قیمت کے اصول سے ہم اگلے باب میں بحث کرتے ہیں۔

باب اُنّیس

مقابلہ و اجارہ

تجزیہ (۱) مقابلہ (۲) اجارہ (۳) ٹکس یا امداد کا اجارہ پر اثر

کاروبار چلانے کے دو طریق ہیں مقابلہ یا اجارہ۔ کسی زمانہ میں اجارے کا بہت رواج تھا انقلاب فرانس کے بعد سے مقابلہ کا زور بندھا۔ آج کل حسب حالات ہر دو طریق مروج پائے جاتے ہیں دونوں میں خوبیاں بھی ہیں اور نقص بھی قطعی طور سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا دشوار ہے۔ اُن کے خواص کی ہم ذیل میں مختصر تشریح کرتے ہیں۔

۱۔ مقابلہ سے کسی کاروبار کی ایسی حالت مراد ہے کہ لوگ بلا روک ٹوک اور دقت اس میں شریک ہو کر اپنے ہم پیشوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر سکیں۔ حریفوں کے مقابلہ میں اپنے کاروبار کو چمکانے کی سو سو ترکیبیں نکالی جاتی ہیں اور ترقی کی جد و جہد میں قانون بقائے اصلح کا دور دورہ رہتا ہے۔

مقابلہ کی سب سے بڑی مسلمہ خوبی تو یہ ہے کہ وہ ترقی کا زبردست محرک و معاون ہے میدان کاروبار میں حریفوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کا نتیجہ بیشتر معاشی ترقی ہوتا ہے نت نئی ایجاد و اختراع اور ارزانی اشیا یہ سب مقابلہ کا عام نتیجہ نظر آتا ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ مقابلہ آزادی پر مبنی ہے اور آزادی ایک نہایت بیش قدر نعمت ہے۔ سوم مقابلہ اپنے پاؤں سے خود چلتا ہے اس کو کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں حاصل کلام یہ کہ مقابلہ کاروبار کا قدرتی طریق ہے اس میں ترقی کا جوش اور موقع دونوں پائے جاتے ہیں اور وہ قانون وغیرہ کی عارضی

مقابلہ

اعانت سے بھی مستغنی ہی۔

حصہ چہارم باب ۱۹

جب کہ لوگ طریق اجارہ کی بے عنوانیوں سے تنگ آگئے تھے اور مقابلہ کا نیا نیا رواج ہوا تو وہ خوبی مجسم سمجھا جانے لگا۔ لیکن کوئی طریق کیوں کر سراسر بے عیب ہو سکتا ہی۔ کچھ عرصہ کے تجربہ سے اس میں بھی نقص نمودار ہو گئے۔ حتیٰ کہ ایک گروہ اس کا اس قدر مخالف بن گیا کہ اس کو آلہ تباہی قرار دیا۔ چنانچہ اشتراک کا منشا انفرادی املاک اور کاروبار ختم کرنے سے مقابلہ روکنا نہیں تو اور کیا ہی۔ سابق مداحوں کی مانند جدید معترض بھی مبالغہ سے کام ضرور لیتے ہیں۔ موافق مطلب پہلو تو دکھائے اور مخالف نظر انداز کر دئے۔ لیکن اصلیت ہمیشہ غیر جانب دارانہ تحقیق سے دریافت ہوتی ہی۔ خصوصاً معاشی مسائل کی بحث میں تو "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" کے اصول پر چلنے کی بیحد ضرورت اور گنجایش ہی۔ مقابلہ کے چند نقائص جو عملی تجربہ سے دریافت ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس میں شک نہیں کہ مقابلہ کے دباؤ سے قیمت اشیا، گھٹتے گھٹتے مصارف پیدائش کے برابر آ رہتی ہی۔ لیکن خود مقابلہ کی خاطر اکثر خاص مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں جو مصارف پیدائش میں شمار ہو کر ان کی مقدار اور لہذا قیمت پیداوار بڑھا دیتے ہیں۔ خریداروں کو متوجہ کرنے کی خاطر بڑے بڑے حریف کارخانے لاکھوں بلکہ کروڑہا روپیہ صرف اشتہارات اور کلینڈروں پر صرف کر دیتے ہیں مزید برآں ملکوں ملکوں اُن کے ایجنٹ دورہ لگاتے پھرتے ہیں اور ذاتی طور پر مل کر خریداروں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ لپٹن کی چاء۔ پیرس کا صابون اسٹیفن کی روشنائی۔ حکیم صاحب کی گولیاں اور ایسے ہی بہت سے اشتہارات ہیں جن سے ہر ریلوے اسٹیشن کے در و دیوار آراستہ رہتے ہیں، جن کے دلکش کلینڈر ہر دکان پر آویزاں نظر آتے ہیں۔ نوبت یہ آگئی ہی کہ بعض چیزوں کی قیمت میں مصارف اشتہار بقدر چہارم پائے گئے اور چوں کہ اشتہارات سے بکری بڑھتی ہی کارخانے اس مد میں دل کھول کر دولت

لٹاتے ہیں۔

(ب) جیسا کہ منافع کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہی خردہ فروشوں کی دکانیں زائد از ضرورت کا نتیجہ ہمیشہ اضافہ قیمت ہوتا ہی۔ گویا اس حالت میں مقابلہ سے بجائے ارزانی کے گرانی بڑھتی ہی۔ قصبات کے حلوائی۔ نان بائی۔ پنواڑی۔ پنساری۔ بزاز اور جوتا فروش جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتے ہیں تو خریداری گھٹنے کی وجہ سے اُن کو مجبورًا شرح منافع بڑھانی پڑتی ہے جس کا لازمی نتیجہ گرانی ہوتی ہی۔ لیکن چونکہ چند پیسے آنے یا زیادہ سے زیادہ دس پانچ روپیہ کافی خریدار کا روبار ہوتا ہی لوگوں کو گرانی کمتر محسوس ہوتی ہی۔

اسی اصول کے لحاظ سے کسی زمانہ میں آبادی کے مطابق حلوائیوں اور نان بائیوں کی دکانات کی تعداد قانونًا مقرر کردی جاتی تھی۔ آج سے تیس برس قبل فرانس کے دارالسلطنت شہر پیرس میں ایسی دکانوں کا اوسط فی ۸۰۰ باشندہ ایک تھا لیکن آج کل فی ۴۰۰ باشندہ ایک ہی۔ حساب سے تخمینہ لگایا گیا ہی کہ محض دکانات کی کثرت کی بدولت کھانا ۴۰ فی صدی زیادہ گراں فروخت ہوتا ہی پروفیسر لیرا ؤ بیو لو نے اپنی کتاب پولیٹکل اکانمی میں اس واقعہ سے مفصل بحث کی ہی

(ج) تخفیف قیمت کی کوشش کا کبھی کبھی چیز کی خوبی پر نہایت ناپسندیدہ اثر پڑتا ہے بہت سستا مال تیار کیا جاتا ہی جو دیکھنے میں تو عمدہ ہی لیکن برتنے میں ناقص ثابت ہوتا ہی چنانچہ مقابلہ کی جنگ میں آمیزش یا ملاوٹ نہایت کارگر آلہ ثابت ہوا ہی۔ گھی کے بجائے تیل اور چربی، تمباکو کے بجائے نہایت مضرت رساں گھاس اور پتے۔ چرم نما کپڑے بلکہ کاغذی پٹھے ریشم اور اون کے بجائے درختوں کے ریشے حتیٰ کہ مصنوعی مکھن اور انڈے تک فروخت ہو رہے ہیں۔ اگر اصول بدل کی پیروی میں کوئی نئی چیز بنظر ترقی رائج کی جائے تو مضائقہ نہیں لیکن جب کہ محض سستی قیمت سے خریداروں کو للچانے کی نیت سے چیزوں

کی خوبی برباد کی جائے تو اوّل تو خود خریداروں کو وہ ناگوار گزرتی ہے۔ دوم اگر نہ بھی گزرے تو اکثر مضر ہونے کی وجہ سے وہ ہر طرح پر قابل اعتراض ہوتی ہے اور ضرورتاً سرکار کو بذریعہ قانون تعزیری اس کی بندش کرنی پڑتی ہے۔ گویا خریدار بھی ہر حالت میں اپنے نفع نقصان کو نہیں سمجھ سکتا کبھی سستی چیز بخوبی خرید کر بھی وہ اپنے کو نقصان پہنچا لیتا ہے اور اسی صورت میں اس کو سرکاری نگرانی اور اعانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سستی گھڑیوں۔ سستے چشموں سستے سگرٹ میں جن کو لوگ شوق سے خریدتے ہیں ہر سال کروڑ ہا روپیہ ضائع ہوتا ہے اور مقابلۃً خریداروں کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ چیزوں کی خوبی برباد کر کے اُن کو ارزاں بنانا اکثر خریدار کے حق میں مضر ثابت ہوتا ہے اور مقابلہ کے جوش میں مذکورۂ بالا طرز عمل بہت اختیار کیا جاتا ہے۔

(د) مقابلہ کے جوش میں کبھی ضرورت سے زیادہ مال تیار کر لیا جاتا ہے اور قانون طلب و رسد کے مطابق قیمت پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے اور کل حریفوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے خوش حال کارخانے تو اس کے متحمل ہو جاتے ہیں مگر کمزور دم توڑ دیتے ہیں اس طرح پر بہت سا اصل ضائع ہوتا رہتا ہے۔

(ر) مقابلہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اپنے کاروبار کو ہر ممکن لحاظ سے ترقی دینے کی کوشش کرے تاکہ حریفوں کے مقابل بہت سا مال عمدہ اور ارزاں فروخت کر سکے ایسا مقابلہ ہمیشہ معاشی ترقی کا سرچشمہ ثابت ہوتا ہے، اور ملک کے حق میں نہایت مفید ہے۔ دوسرا مقابلہ جس کا بدقسمتی سے رواج بڑھ رہا ہے اصطلاحاً مقابلہ گلو تراشں کہلاتا ہے۔ اس کی خاصیت اس کے نام سے ظاہر ہے۔ ایسے مقابلہ کا منشا ہر ممکن طریق سے حریف کو زک دینا اور تباہ کرنا ہوتا ہے حتیٰ کہ خود بھی نقصان برداشت کر لیا جاتا ہے تاکہ جب حریف سے میدان خالی ہو جائے تو موجودہ نقصان کی تلافی بھی ہو سکے اور حسب دلخواہ منافع حاصل ہو۔

اس مقابلہ کا طریق یہ ہی کہ نئے حریف کو پریشان و برباد کرنے کی خاطر مصارف پیدائش سے بھی کمتر قیمت پر مال فروخت کرتے ہیں۔ بڑے قدیم کارخانوں کو ایسا کرنے میں بمقابل نئے کارخانوں کے دو وجہ سے کم مضرت پہنچتی ہی ان کا مال دور دراز بازاروں تک فروخت ہوتا ہی اور جس بازار میں حریف مقابل ہوتا ہی صرف یہی نرخ گھٹا دیتے ہیں یا اُن کے کارخانوں میں علاوہ سامان زیر مقابلہ کے اور مال بھی تیار ہوتا ہی اور وہ باقی مال کی سابق قیمت برقرار رکھتے ہیں بلکہ بشرط امکان بڑھا دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ مقابل کا دباؤ نسبتاً نئے حریف پر بہت زیادہ پڑتا ہی اور قدیم پر کم۔ طرح طرح کے دباؤ ڈال کر خردہ فروشوں کو بھی حریف کا مال خریدنے سے روکا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ لے دے کر کمپنیوں کے ملازموں سے سازباز کرلی جاتی ہی کہ اُن کا مال بمقابل دوسروں کے جلد روانہ کیا جائے اور تجارت میں وقت ہی تو بہت بڑی چیز ہے چند گھنٹوں کی عجلت اور تاخیر سے کایا پلٹ ہو جاتی ہی۔

صاف ظاہر ہی کہ مقابلہ گلو تراش اخلاقی سیاسی اور معاشی غرض کہ ہر لحاظ سے مذموم ہے اور سوائے مضرت کے اس سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

(س) مقابلہ جس کا منشا اجارہ کی بیخ کنی ہی کامیاب ہونے پر خود اجارہ کی بنا رکھتا ہی جب کمزور حریف پسپا ہو جاتے ہیں تو کل میدان چند طاقتور کارخانوں کے ہاتھ میں رہ جاتا ہی اور وہ مل کر ایک زبردست جتھا قائم کرتے ہیں اور باہمی صلاح و مشورہ سے کاروبار چلاتے ہیں۔ جب کہ اُن کا اقتدار از حد بڑھ جانے سے اندیشے پیدا ہوتے ہیں تو سرکار کو دست اندازی کرنی پڑتی ہی یا تو ان کو خاص قانون کا پابند بنایا جاتا ہی یا سرے سے کل ایسے کاروبار کو سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہی۔ گویا کاروبار ارتقا کے تین درجے ہوتے ہیں۔ اوّل کاروبار والوں کا مقابلہ۔ دوم ان میں سے چند کا غلبہ اور تسلط۔ سوم سرکاری نگرانی بعض لوگوں کا خیال ہی کہ اگر طریق شراکت پر عمل کیا جائے تو سرکاری اشتراک کی بھی ضرورت

کم پڑے۔ شراکت کا کچھ ذکر اجرت کے تحت میں آچکا ہی۔ اس سے مفصل طور پر آئندہ صرف دولت کے تحت میں بحث کریں گے۔

مقابلہ کا حسن و قبح تو مختصراً بیان ہوچکا - اب ہم ذیل میں اجارہ کے خواص پر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

۲ - کسی کاروبار کی یہ حالت کہ وہ صرف ایک یا چند کارخانوں کے قبضہ میں ہو اور نئے لوگ اس کاروبار کو جاری کرنے سے کسی وجہ سے معذور ہوں اجارہ کہلاتی ہیں اجارہ کی اصلی غرض یہ ہوتی ہی کہ مقدار پیداوار معین کرکے قانون طلب و رسد کے مطابق حسب دلخواہ قیمت وصول کی جائے - اجارہ کئی طرح پر حاصل ہوسکتا ہی - اوّل قانون کے ذریعہ سے جب کہ کوئی کاروبار چند مخصوص کارخانوں کے علاوہ سب کے واسطے قانوناً ممنوع ہو۔ ایسے قانونی اجاروں کی ایک زمانہ میں بہت کثرت تھی اور شاہی عنایت و بخشش اکثر یہ شکل اختیار کرتی تھی۔ حق تصنیف وحق ایجاد قانونی اجارہ کی عمدہ مثالیں ہیں۔ دوسرے بذریعہ معاشی اقتدار کے جب کہ کوئی کارخانہ اپنی عمدہ تنظیم یا اتفاقی سہولتوں کی بدولت سب سے عمدہ اور ارزاں مال تیار کرکے حریفوں سے بازی لے جائے مثلاً کسی کارخانہ کے قرب و جوار میں عمدہ سے عمدہ پیداوار خام بکثرت ارزاں مل سکے یا کوئی کارخانہ ذرائع آمد و رفت کے قریب واقع ہو اور دیگر حریف کارخانوں کو ایسا عمدہ موقع میسر نہ آسکے یہ سب جائز اجارے کہلاتے ہیں۔ تیسرے ناجائز اجارہ جو اکثر گلو تراش مقابلہ سے حاصل کیا جاتا ہی اور جو معاشی ترقی کے منافی ہی۔

اجارہ میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد سے مستفید ہونا بدرجہ اولیٰ ممکن ہی چنانچہ اگر اجارہ میں عالی ہمتی اور بیدار مغزی سے کام لیا جائے تو بہ نسبت مقابلہ کے مال زیادہ عمدہ اور ارزاں تیار ہوسکتا ہی چونکہ بحالت اجارہ مقدار پیداوار کا تعین ممکن بلکہ اغلب ہی۔ پیداوار کا نرخ بہ نسبت مقابلہ کے اجارہ میں بہت زیادہ کارخانوں کے اختیار میں ہوتا ہی۔ گویا مقدار پیداوار

گھٹا کر وہ قیمت میں اضافہ کر سکتے ہیں ان دونوں خواص کو مد نظر رکھتے ہوئے اب دیکھنا یہ ہے کہ اجارہ کن حالتوں میں مفید اور کن میں مضر ہونا چاہیے اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ مصنوعات بالعموم قانون تکثیر حاصل کے تابع ہوتی ہیں۔ گویا پیدائش برپیمانہ کبیر کے فوائد ان میں بہت زیادہ حاصل ہوتے ہیں اور نیز چونکہ وہ بیشتر داخل تعیشات ہیں اُن کی طلب بہت کچھ تغیر پذیر ہوتی ہے۔ یعنی قیمت کے تھوڑے اضافہ یا تخفیف سے اُن کی طلب بہت کچھ گھٹ بڑھ جاتی ہے نتیجہ یہ کہ ایسی مصنوعات اجارہ کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اول تو قانون تکثیر حاصل کی بدولت مقدار پیداوار بڑھنے سے مصارف پیدائش خود گھٹ جاتے ہیں دوم تغیر پذیری طلب اضافہ قیمت کے بجائے تخفیف کی ترغیب دیتی ہے اس کا باعث وہی اصول ہے۔ "منافع کم اور بکری زیادہ" جو آج کل کے کاروباری ترقی کا بہت بڑا گر ہے اور جس کے منافع کے تحت میں تشریح کی جا چکی ہے۔ گویا اس صورت میں شرح منافع تو ادنیٰ لیکن مقدار منافع بہت اعلیٰ رہتی ہے اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کارخانہ دار کو مقدار سے غرض ہوتی ہے نہ کہ شرح سے چنانچہ حوصلہ مند اجارہ دار نئے نئے سامان اور ان میں نئی نئی خوبیاں پیدا کر کے خریداروں کا دل لبھاتے ہیں اور اپنی چیزوں کے رواج اور استعمال بڑھانے کی خاطر ان کو برائے نام قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور جب اُن کی طلب وسیع اور مستقل ہو جاتی ہے تو ایسے ادنیٰ نرخ سے بڑے بڑے منافع پاتے ہیں اور چونکہ کسی حریف کے حصے بانٹنے کا خوف نہیں ہوتا یہ سب کچھ کرنے میں انھیں بہت سہولت اور اطمینان ہوتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ تعیشات جو بالعموم قانون تکثیر حاصل کے پابند ہوتے اور جن کی طلب تغیر پذیر ہوتی ہے اجارہ کے واسطے بہت موزوں ہیں۔

زراعت میں پیدائش برپیمانہ کبیر کے فوائد کی گنجائش بہت کم پائی جاتی ہے۔ اس میں قانون تکثیر حاصل کا عمل ضعیف ہوتا ہے اور اجارہ دار کو مقدار پیداوار بڑھانے سے مصارف

پیدائش میں کوئی قابل لحاظ تخفیف نہیں ہوتی - اس پر طرہ یہ کہ زرعی پیداوار سے اکثر ناگزیر ضروریات متعلق ہیں جن کی طلب غیر تغیر پذیر ہوتی ہے - یعنی جن کی قیمت بڑھنے گھٹنے سے بھی طلب میں کوئی خاص کمی بیشی نہیں ہوتی - پس زرعی پیداوار اور نیز ایسی مصنوعات کہ جو قانون تکثیر حاصل کی بہت کم تابع ہوں اور جو ناگزیر ضروریات میں داخل ہوں اجارہ کے واسطے از حد ناموزوں ہیں اُن کے اجارہ میں مقدار پیداوار گھٹنے اور قیمت بڑھنے کا سخت اندیشہ لاحق ہے یہی وجہ ہے کہ غلے اور روئی وغیرہ کے اجارہ کی جب کبھی تجویز سننے میں آتی ہے تو دنیا کے ہر گوشہ سے مخالفت کی آواز بلند ہو جاتی ہے -

حاصل کلام یہ کہ تعیشات کے اجارہ میں کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اکثر فائدہ رہتا ہے مگر ناگزیر ضروریات کا اجارہ سراسر خلاف مصلحت و دور اندیشی ہے اس فرق کا باعث قانون تکثیر حاصل کے عمل و تعطل اور طلب کی تغیر پذیری غیر تغیر پذیری میں مضمر ہے -

پیداوار کی مختلف مقداروں کی قیمت رسد و قیمت طلب بھی مختلف ہوتی ہے - مثلاً اگر پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہے تو تھوڑی مقدار کی قیمت رسد ادنیٰ اور بڑی مقدار کی اعلیٰ ہو گی لیکن اگر وہ قانون تکثیر حاصل کی پابند ہو تو معاملہ برعکس ہو گا یعنی کمتر مقدار کی قیمت رسد اعلیٰ اور بیشتر کی ادنی ہو گی - رہی قیمت طلب سو اس کا وہی ایک عام اصول ہے کہ مقدار رسد گھٹنے بڑھنے سے قیمت طلب بڑھتی گھٹتی ہے - مقابلہ کی حالت میں تو پیداوار کی مقدار معین کرنا محال ہے - ہر کوئی اپنے کاروبار کی ترقی چاہتا ہے اور زیادہ سے زیادہ مقدار پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے کبھی پیداوار کی اس قدر کثرت ہو جاتی ہے کہ قیمت طلب رسد سے بھی گھٹ جاتی ہے اور اکثر حریفوں کو خسارہ اُٹھانا پڑتا ہے - لیکن اجارہ کی سب سے بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اس میں مقدار پیداوار کا تعین ممکن ہے - اور قیمت طلب کا قیمت رسد سے اعلیٰ برقرار رکھنا سہل ہے قیمت رسد میں مصارف پیدائش کی کل مدیں یعنی

حصہ چہارم
باب ۱۹

قیمت پیداوارخام - اجرت سود - مطالبات فرسودگی وخطر وضمانت وغیرہ شامل ہوتی ہیں قیمت طلب کی بیشی سے جو صرف بحالت اجارہ ممکن ہی جو کچھ ماحصل زائد ہاتھ لگے وہ اصطلاحاً **ماحصل اجارہ** کہلاتا ہی بالفاظ دیگر مقابلہ میں تو قیمت طلب بالعموم قیمت رسد کے برابر رہتی ہے چنانچہ قیمت کی بحث میں اس واقعہ کی تشریح بھی ہو چکی ہی - لیکن اجارہ میں قیمت طلب کا قیمت رسد سے بڑھا چڑھا رہنا ممکن ہی اور ان دونوں کا فرق **ماحصل اجارہ** سمجھا جاتا ہی مثلاً کسی چیز کی قیمت رسد ۱۵ آنہ ہی اس قیمت میں کل مصارف پیدائش شامل ہیں مقابلہ کے دباؤ سے تو اس کا نرخ ۱۵ آنہ کے قریب قریب رہیگا - لیکن بحالت اجارہ اس کا نرخ عہ، یا اس سے بھی زیادہ رہنا ممکن ہی - قیمت رسد ۵ آنہ اور قیمت طلب عہ، کا فرق ار جو محض اجارہ کا طفیل سمجھنا چاہیئے **ماحصل اجارہ** ہوا - ہر اجارہ دار کی یہی کوشش ہوتی ہی کہ اس کو **بیشترین ماحصل اجارہ** ملے مختلف مقدار پیداوار قیمت طلب میں سے قیمت رسد منہا کرنے پر یہ دریافت ہوسکتا ہی کہ کون مقدار پیدا کرنے پر ماحصل اجارہ کی بیشترین مقدار ہاتھ لگے گی - ذیل میں ہم بائیسکل کے اجارہ دار کارخانہ کی مثال پیش کرتے ہیں - بائیسکل بوجہ **مصنوعات** ہونے کے قانون تکثیر حاصل کے ضرور تابع ہوگی اور صرف ایسی ہی چیزیں اجارہ کے واسطے بھی موزوں ہوتی ہیں -

تعداد بائیسکل	قیمت رسد	قیمت طلب	ماحصل اجارہ
۱۰۰۰	۱۷۰	۲۰۰	۳۰۰۰۰
۸۰۰۰	۱۷۱	۱۷۵	۳۲۰۰۰
۲۰۰۰۰	۱۶۳	۱۶۵	۴۰۰۰۰
۳۵۰۰۰	۱۴۹	۱۵۰	۳۵۰۰۰

اوپر کی مثال سے واضح ہوگا کہ ۲۰۰۰۰ بائیسکل بنانے میں کارخانہ دار کو سب سے زیادہ ماحصل اجارہ یعنی ۴۰۰۰۰ روپیہ حاصل ہوتا ہی - پس وہ اسی تعداد پر قائم رہے گا نہ اس کو گھٹائیگا

نہ بڑھائے گا اور اگر تبدیلی حالات کی بدولت کسی دوسری تعداد سے اور بھی زیادہ ماحصل اجارہ حاصل ہوا تو اسی کو اختیار کرلے گا۔ غرض کہ تجربہ کی مدد سے وہ ایسی تعداد تلاش کرلے گا جو اس کے حق میں سب سے زیادہ مفید ہو یعنی جس سے بیشترین مقدار ماحصل اجارہ ہاتھ لگے اوپر کی مثال پر یہ اعتراض بے جا نہ ہوگا کہ اس میں حسب طلب اعداد لئے گئے ہیں۔ چاہے کوئی اعداد لئے جائیں ایک تعداد ضرور ایسی نکلے گی جس سے ماحصل اجارہ کی سب سے بڑی مقدار حاصل ہو۔

سرکار کبھی اس خیال سے کہ اجارہ دار کو بہت کچھ منافع ہوتا ہے اس پر ٹیکس قائم کرتی ہے اور کہیں کسی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی غرض سے اجارہ دار کو اپنی طرف سے مالی امداد دیتی ہے تاکہ اس کی ہمت افزائی ہو اور کاروبار عروج پکڑے جن خوش قسمت ملکوں کو خود اختیاری حکومت حاصل ہے وہاں ایسی امداد کا رواج زیادہ پایا جاتا ہے خصوصاً امریکہ اور جاپان نے اس طریق سے اپنے ہاں کی صنعت و حرفت کو بے حد ترقی دی ہے ایسی امداد کا اگر سرکار پر کچھ بار بھی پڑتا ہے تو مابعد معاشی ترقی اور عام خوش حالی سے اس کی ہزار گنی تلافی ہو جاتی ہے اس امداد کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ کسی نازک اور کمزور پودے کو لکڑی کا سہارا دیا جائے حتیٰ کہ اس کی جڑ مضبوط اور تنہ موٹا ہو جائے اور پھلنے پھولنے لگے

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ٹیکس یا سرکاری امداد کا اجارہ کی پیداوار اور اس کی قیمت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ تعین ٹیکس یا امداد کے حسب ذیل تین اصول ہو سکتے ہیں۔

(ا) مقدار ٹیکس یا امداد معین ہو مثلاً دس ہزار روپیہ۔

(ب) ٹیکس یا امداد بحساب ماحصل اجارہ کچھ فی صدی مقرر ہو مثلاً ۱۰ فی صدی ماحصل اجارہ۔

(ج) ٹیکس یا امداد بحساب مقدار پیداوار مقرر ہو مثلاً ایک روپیہ فی بائیسکل۔

ان تینوں اصول کے مطابق ٹیکس یا امداد مقرر کرنے سے مذکور الصدر مثال میں